اپریل 2023 قیمت 15₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

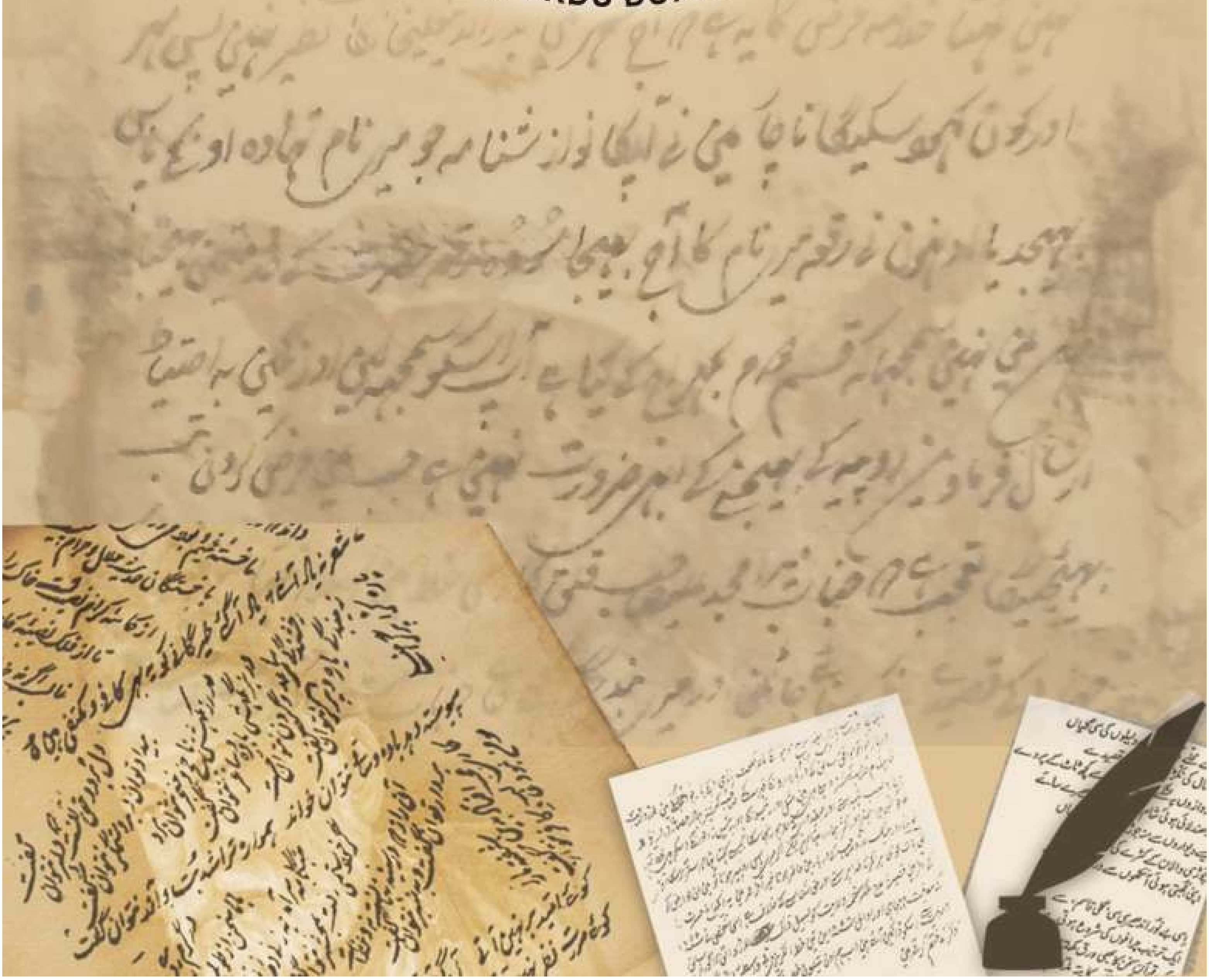

پچیسویں قومی اردو کتاب میلہ وانمباڑی 2023 کی کچھ اور تصویری جھلکیاں

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:4، اپریل 2023

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات

علامت اور چند کہانیاں — غضنفر 6

کلاسیکی متون کی فرہنگ — شریف احمد قریشی 12

مجاز اور عالم حسن و جمال — سہیل کاکوروی 15

ریل اور اردو شاعری — اسرار اللہ انصاری 19

ابن کنول کی یاد میں

ابن کنول کی افسانہ نگاری — عزیر احمد 24

وہ گیا جس سے بزم اردو تھی روشن — شبیر احمد لون 27

ابن کنول کی خاکہ نگاری — محمد ارشد ندوی 31

پروفیسر ابن کنول کا آخری انٹرویو — غضنفر اقبال 33

زبان اور زمینی صورت حال

صرف ادب نہیں زبان پر بھی توجہ کی ضرورت ہے — محمد شمشاد 37

ادب اطفال: مسائل و امکانات

عصر حاضر کے ادب اطفال میں سائنس و ٹیکنالوجی رجحانات و امکانات — محمد سراج عظیم 40

اردو میں ادب اطفال — آمنہ فاروقی 43

لعل و گہر

کالی داس گپتا رضا — رؤف خیر 46

ڈاکٹر منشا کی گل افشانی گفتار — محمد اسداللہ 49

علامہ واقف عظیم آبادی

حیات اور شاعری — شاذیہ کمال 51

شہر بین

الہ آباد کا ادبی منظر نامہ — کہکشاں عرفان 54

فروغ اردو

اردو کے فروغ میں ریاست ٹونک کے غیر مسلم شعرا کی خدمات — محمد باقر حسین 58

اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار — طالب اکرام 61

نجوم و جواہر

وَدربھ کے تین اہم افسانہ نگار — اظہر ابرار 63

نیا آسماں نئے ستارے

ناول 'آگ کا دریا' اور قدیم ہندوستان کی معنویت — محمد عامر 67

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 70

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ہماری بات

اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے اندر جذب اور انجذاب کی پوری قوت ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں سے اس کا لسانی اور فکری تعامل رہا ہے اور شاید اس سخت جان زبان کی زندگی کا راز بھی یہی ہے کہ اس کے دامن میں نہ صرف عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر ترقی یافتہ عالمی زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں بلکہ جس سرزمین میں اس زبان کی پرورش اور پرداخت ہوئی ہے اس کی علاقائی زبانوں کے الفاظ کو بھی اس نے قبول کیا ہے۔

اردو زبان بہت ساری زبانوں کا مرکب اور مجموعہ ہے، اس لیے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ جب آپ اردو بولتے ہیں تو صرف ایک زبان نہیں بلکہ دنیا کی بہت ساری زبانیں بول رہے ہوتے ہیں۔ اس کی ثروت مندی کا سبب شاید یہ بھی ہے کہ اسے ہر اس لفظ سے محبت اور انسیت ہے جس میں انسان اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی خوبصورت اور بہتر انداز میں کرسکے۔ اردو کے پاس بہت سے کومل اور لطیف الفاظ ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سارے وہ افراد جو اردو زبان و ادب سے غیر مانوس ہیں وہ اردو کے اشعار اور الفاظ کا استعمال اپنے اظہار میں قوت پیدا کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

ماضی میں عدالتوں میں بہت سے فیصلوں کے وقت اردو شاعری کا سہارا لیا گیا ہے۔

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اور

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

جیسے مصرعے بھی پڑھے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جسٹس سید محمود نے اپنے ایک تاریخی فیصلے میں اردو شاعری کا حوالہ دیا تھا۔ آج بھی ایوان اقتدار میں اردو شاعری کی گونج سنائی دیتی رہتی ہے۔ پارلیمنٹ میں اردو کے شعر گونجتے رہے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو زبان میں بڑی توانائی اور قوت ہے اور یہ زبان تاثیر وتسخیر کی بے پناہ طاقت بھی رکھتی ہے۔

اردو کے تعلق سے ایک عام تصور یہ ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف عربی اور فارسی ہی نہیں بلکہ انگریزی، لاطینی، یونانی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اس میں موجود ہیں۔ اور فارسی کا معاملہ صرف اردو کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی بہت ساری زبانوں جیسے بنگالی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، کشمیری، تیلگو اور ہندی وغیرہ میں بھی فارسی الفاظ اور فقرے بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کا آج تک کوئی مترادف نہیں ہے۔ دراصل فارسی ایک ایسی زبان ہے جس کا سنسکرت سے بہت گہرا لسانی رشتہ رہا ہے اسی لیے ہندوستان میں بھی فارسی زبان کو خاصی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور فارسی زبان کے اثرات ہندوستان کی علاقائی زبانوں پر بھی مرتب ہوئے۔ اردو بھی ایک ایسی ہندوستانی زبان ہے جس کے ذخیرۂ الفاظ میں فارسی بھی شامل ہے اور اس کے نثری وشعری اصناف میں بھی فارسی سے استفادے کی روایت ملتی ہے۔ اردو نے صرف فارسی سے ہی استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ انگریزی اور دیگر زبانوں کی اصناف سے بھی اس نے بہت سی چیزیں اخذ کی ہیں۔ اس لیے اردو زبان کو کسی ایک خاص زبان سے ماخوذ اور مستفاد قرار نہیں دیا جاسکتا ہے کہ اس زبان نے دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں اور اس کی لفظیات اور قواعد جہاں ہندی سے ملتے جلتے ہیں وہیں اس کی بہت سی شعری اور نثری اصناف کا تعلق عربی، فارسی اور انگریزی زبان و ادب سے بھی ہے۔ لسانی اور فکری سطح پر اردو زبان نے غیریت کا رشتہ نہیں رکھا بلکہ ہر اس فکر اور لفظ کو قبول کیا جس سے اس کے تمول اور ثروت مندی میں اضافہ ہو۔ اس لیے اردو فرہنگ پر نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کے الفاظ کو اردو اپنے دامن میں سجائے ہوئے ہے اور شاید اردو زبان کی خوبصورتی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اس کے اندر لسانی اور فکری، بوقلمونی اور تنوع ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بهی زیاده بیش قیمت هوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تهی۔

قارئین سے گذارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

ماہنامہ 'اُردو دنیا' مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر وانمباڑی کتاب میلے کی تصاویر میلے کی کامیابی کی ضمانت دیتی ہیں۔ 3 جنوری تا 11 جنوری تک وانمباڑی میں کتاب میلے کا انعقاد قومی اردو کونسل کا بہت اہم فیصلہ ہے۔ وانمباڑی اردو کتاب میلے میں مقامی حضرات کے دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اچھا لگا۔ یہاں کی مادری زبان گرچہ اردو نہیں ہے پھر بھی وانمباڑی کے شائقین نے کتابوں سے دلچسپی کا ثبوت دیتے ہوئے کتابوں کی خریداری کی۔ نایاب حسن صاحب نے بہت اچھی رپورٹ تیار کی ہے۔ رپورٹ پڑھ کر پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ رپورٹ میں ادبی ثقافتی پروگرام کا ذکر بھی بہت خوب ہے۔ ٹیکنالوجی کی نئی نئی ایجادات سے زبان وادب کو کتنا فائدہ ہے، اس تعلق سے مدیر رقم طراز ہیں ''نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے زبان وادب کے تعلق سے گفتگو کے نئے زاویے بھی ہمیں میسر آئے ہیں۔ اب زبان کو ٹیکنالوجی سے مربوط وہم آہنگ کرکے وسیع تناظر میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ ٹیکنالوجی سے زبان کی جتنی قربت وہم آہنگی ہوگی زبان اتنی ہی ترقی کرے گی، زبان کی ترقی کے لیے جدید ترین تکنیکی ذرائع کا استعمال ضروری ہے۔ زبان سے جڑے ہوئے جتنے بھی مسائل ہیں ان کو اب تکنیکی نقطۂ نظر سے ہی دیکھنا ہوگا، تبھی ہمیں ان مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔''

میلے کی روداد کے علاوہ میگزین میں شامل ربط والتفات کے کالم سے قاری کو تحقیقی مشمولات کے تعلق سے تنقیدی وتحقیقی ادبی وتخلیقی شعور کے ساتھ آگہی حاصل ہوتی ہے۔ دیگر سماجی اور سائنسی علوم کے مضامین بھی شامل کیے جائیں تو اور بہتر ہوگا۔ زبان وتعلیم کے تحت شامل مضامین ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل (درخشاں تاجور) اور اردو زبان کا ارتقا (صبا ناز محمد انصاری) نے اپنے مضامین میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یگانہ چنگیزی کے حوالے سے ابوشہیم اور وسیم فرحت کے مضامین بہت خوب ہیں۔ ان مضامین سے ان کی شاعری کے امتیازات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ پرفیسر عبدالحق نے 'جونپور کی تین معاصر محترم شخصیتیں، مولانا کرامت علی جونپوری، سید غلام سمنانی مرحوم اور ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں مختصر مگر بہت اہم باتیں لکھی ہیں۔ خراج عقیدت کے تحت پروفیسر مہ نور زمانی نے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی اردو خدمات اور ترقی اردو بیورو کی ڈائرکٹر کی حیثیت سے ان کا بہت اچھے انداز میں تعارف کرایا ہے۔ جناب عشرت ظہیر صاحب نے اپنے مضمون 'عبدالمتین رنگوں کے تعاقب میں' میں متین صاحب کی سوانح، شخصیات، ان کے افسانوں کی خصوصیات اور موضوعات بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ شمارے میں شامل شعیب نظام، سرفراز جاوید، نیاز سلطانپوری، تسلیم عارف، ساجد ذکی فہمی، عزیز سہیل، سید بصیر الحسن وفا نقوی، ہمایوں اشرف، مشتاق احمد گنائی کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہ نامہ 'اردودنیا' جنوری 2013 تاخیر سے موصول ہوا۔ اس کی ورق گردانی کی، نئے سال کا پہلا شمارہ متنوع مشمولات پر مشتمل ہے۔ رسالے کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اداریے میں بڑی عمدہ بات کہی گئی ہے کہ دنیا تیزی سے بدل رہی لیکن ہم لوگ نئے زمانے سے خود کو ہم آہنگ نہیں کرپارہے ہیں۔ 'شاعری کیا ہے' کے عنوان سے سید نفیس دسنوی کا مضمون بڑا جامع اور معلوماتی ہے۔ محمد اسلم پرویز کا مضمون 'شمس الرحمٰن فاروقی کی روایت پسندی' بھی وقیع اور معیاری ہے۔ مرحوم فاروقی صاحب کی شناخت جدیدیت کے علم بردار کے طور پر قائم ہے، لیکن روایت سے بھی ان کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ مضمون نگار نے ان کی کتاب اور لغت کے حوالے سے ان کی روایت پسندی کو اجاگر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ سمیرا بانو نے اپنے مضمون میں ترجمہ نگاری کے مراکز قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ شاہ نواز فیاض نے اپنے مضمون 'مہا بھارت کے اردو تراجم' پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ سوشل میڈیا کے حوالے سے بھی مضمون معلومات افزا ہے۔ دیگر مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں۔ اس رسالے میں ہر قسم کے قاری کے لیے مواد مل جاتا ہے، اور یہی اس کی مقبولیت کی وجہ ہے۔ رسالہ ہر اعتبار سے بہتر ہے۔

ناہید فاطمہ: ایم اے سال دوم، شعبۂ اردو، شریمتی اندرا گاندھی، پی جی کالج، منو

غضنفر

علامت اور چند علامتی کہانیاں

علامت وہ آئینہ ہے جو ایک عکس میں کئی تصویریں دکھا دیتی ہے، ایک چہرے کے کئی روپ بنا دیتی ہے۔ ایک نقطے سے کئی نکتے نکال دیتی ہے، ایک ساز سے کئی راگ سنا دیتی ہے۔ ایک کمان سے ایک ساتھ کئی تیر چھوڑتی ہے اور سب کو نشانے پر بٹھا دیتی ہے۔ یہ جادو کی وہ چھڑی ہے جو رسّی کو کبھی سانپ، کبھی زلف، کبھی زنجیر، کبھی پل بنا دیتی ہے۔

علامت کا معاملہ عجیب وغریب ہے۔ یہ چاہے تو مخمل میں مورچہ اور بادام میں آدمی دکھا دے۔ دریا کی کلائی توڑ دے اور زلف کو بام میں الجھا دے۔ پروانے کے خون کا رشتہ مگس کے باغ میں جانے سے جوڑ دے۔ نرگس کی بے نوری اور دیدہ ور کے بیچ کوئی منطق بٹھا دے۔ یہ اس لیے عجیب وغریب ہے کہ کارِ اثبات بھی کرتی ہے اور کارِ نفی بھی انجام دیتی ہے۔ علامت بتاتی بھی ہے اور چھپاتی بھی۔ راہ دکھاتی بھی ہے اور راہ سے بھٹکاتی بھی۔ علامت آب بھی ہے اور سراب بھی۔ آبِ زلال بھی ہے اور زہراب بھی۔ آبِ شیریں بھی ہے اور شوراب بھی۔ یہ اشیا کو بند بھی کرتی ہے اور چیزوں کو کھولتی بھی ہے۔ مطلع کو ابر آلود بھی کرتی ہے اور صاف وشفاف بھی۔ منظر کو لطیف بھی کرتی ہے اور کثیف بھی۔ پیکر کو روشن بھی کرتی ہے اور دھندلا بھی۔ سمندر میں سکوت بھی لاتی ہے اور اضطراب بھی۔ عکس کو عکس بھی رہنے دیتی ہے اور اسے عکسِ برعکس بھی بنا دیتی ہے۔

علامتوں کا عمل پل صراط پر چلنے جیسا ہے۔ توازن بگڑا کہ گرے۔ اور گرے تو گئے پانی میں۔ کیچڑ میں چلنے جیسا ہے۔ ڈگمگائے تو پھسلے۔ اور پھسلے تو منہ دکھانے کے لائق نہ رہے۔

علامت وہ آئینہ ہے جو ایک عکس میں کئی تصویریں دکھا دیتی ہے۔ ایک چہرے کے کئی روپ بنا دیتی ہے۔ ایک نقطے سے کئی نکتے نکال دیتی ہے۔ ایک ساز سے کئی راگ سنا دیتی ہے۔ ایک کمان سے ایک ساتھ کئی تیر چھوڑتی ہے اور سب کو نشانے پر بٹھا دیتی ہے۔ یہ جادو کی وہ چھڑی ہے جو رسّی کو کبھی سانپ، کبھی زلف، کبھی زنجیر، کبھی پل بنا دیتی ہے۔

سیاہی کو تیرگی بھی بناتی ہے اور روشنی بھی۔ آگ کو راکھ اور خاک کرنے والی شے بھی بناتی ہے اور حرکت و حرارت پیدا کرنے والی چیز بھی۔ علامت آب کو آتش کا متضاد تو بناتی ہی ہے کبھی اسے اس کا مترادف بھی بنا کر رکھ دیتی ہے۔

مثلاً بلراج مین را کی کہانی 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' میں موجود ایف۔ایل بیچنے والی ڈرگ شاپ میں شامل لفظِ 'پارسی' کو لے لیجیے۔ کوئی اس لفظ کا معنی یہ نکال سکتا ہے کہ پارسی قوم کو اپنے ملک کا کتنا خیال ہے، اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کو لے کر یہ کس قدر فکر مند ہے کہ حکومت کی پالیسی پر مستعدی سے عمل کر رہی ہے۔ آبادی کو روکنے میں ایک اہم کردار نبھا رہی ہے۔ یہ قوم اپنے اس کام کے لیے قابلِ ستائش ہے اور انعام واکرام کی مستحق بھی۔

اور کوئی اس سے یہ معنی اخذ کر سکتا ہے کہ یہ قوم کتنی بری اور بدعنوان ہے کہ معاشرے میں ایک برائی اور بدعنوانی کو پنپنے میں معاونت کر رہی ہے۔ جنسی بے راہ روی کو سرِ عام ہوا دے رہی ہے۔ یہ قابلِ لعنت و ملامت ہے بلکہ سزاوار بھی ہے۔ اسی طرح کوئی شخص ایف۔ایل کو کوئی آلۂ انسدادِ آبادیِ نسل بتا کر مثبت علامت ثابت کر سکتا ہے اور کوئی اسے جنسی بے راہ روی کے وسیلۂ فروغ کی علامت بتا سکتا ہے۔

اس لیے علامت سازی کے عمل میں احتیاط بہت ضروری ہے، اور اس کے لیے دل اور دماغ دونوں پر پورا کنٹرول درکار ہے ورنہ بننے کے بجائے بگڑنے کا امکان بڑھ جاتا ہے اور ایسے میں مچھلی پکڑنے والے کے ہاتھ

میں سانپ آجاتا ہے۔ یا سانپ پکڑنے والا ہاتھ بل سے کیچوا نکال لاتا ہے۔ اور ایسا ہماری کہانیوں میں اکثر ہوا ہے اور جب جب ایسا ہوا ہے کہانی سے ہوا نکل گئی ہے اور قصے کا غبارہ یا تو لجلجا ہو گیا ہے یا پھٹ کر چیتھڑوں میں بدل گیا ہے۔

زیادہ تر علامتیں ایک خاص مزاج رکھنے والے قلم کاروں نے بنا سوچے سمجھے استعمال کی ہیں۔ ان کو چننے اور برتنے میں اپنے دل و دماغ کا استعمال نہیں کیا ہے یا اتنا کم کیا ہے کہ ہاتھ میں سانپ آجانے کے بعد بھی ہم اسے مچھلی ہی سمجھتے رہے ہیں اور کبھی کبھی تو سانپ کے منہ اور دم کے دِکھ جانے کے باوجود اسے مچھلی سمجھنے کی ضد پر اڑے رہے ہیں اور ہمیشہ اڑے رہتے ہیں۔ اسی لیے ایسی کہانیاں شہرت کے بانس پر چڑھانے کے باوجود نگاہوں کو دیر تک اپنے پاس روک نہیں پاتی ہیں یا پروپیگنڈا کی تنی ہوئی رسی پر چلنے کے بعد بھی وہ کہانی کی متلاشی آنکھوں کو اپنے پاس ٹھہرا نہیں پاتی ہیں۔ اردو کی وہی کہانیاں مقبولیت کے خانے میں گئی ہیں جن کی علامتوں کے عمل میں احتیاط برتی گئی اور خوب ہوشیاری دکھائی گئی۔ یہاں ہوشیاری دکھانے سے مراد وہ ہشیاری نہیں ہے جس میں مکّاری اور عیّاری شامل ہوتی ہے بلکہ زیرکی اور سمجھ داری مراد ہے جس میں سوچ سمجھ، اور فہم و فطانت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مثلاً جو سمجھ داری سریندر پرکاش نے بجوکا اور باز گوئی میں، غیاث احمد گدی نے پرندہ پکڑنے والی گاڑی میں، خالدہ حسین نے سواری میں انور سجاد نے گائے میں اور انتظار حسین نے آخری آدمی میں دکھائی ہے۔ یا کچھ اور لوگوں کی کہانیاں بھی ہیں جو پاس ہو گئے اپنی علامتوں کے امتحان میں اور سریندر پرکاش کو تو انتظار حسین نے یہ سند بھی عطا کر دی:

''علامتی افسانہ لکھنا کوئی سریندر پرکاش سے سیکھے۔''

کہانیوں کی وہی علامتیں سرخ رو ہوتی ہیں جو اپنے مخصوص رنگ کی تابنا کی سے قاری یا سامع کے حواس کو منور کرتی چلتی ہیں۔ جو ذہن و دل میں اپنا رنگ بھرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں اور اختتام پر پہنچ کر ایسا پیکر بناتی ہیں یا ایسا منظر دکھاتی ہیں کہ وجود رنگ یا رنگوں سے پیدا ہونے والی بصیرت سے شرابور ہو جاتا ہے۔ رگ و ریشے میں سرشاری کی موجیں لہر لینے لگتی ہیں۔ گنجینۂ معانی کا طلسم اپنا در کھول کر سامنے آجاتا ہے۔

علامت اگر اپنے ہالے سے نکل کر باہر جاتی بھی ہے اور آپ کو کچھ اور دائروں میں لے جاتی بھی ہے تو وہاں کی جھلکیاں دکھا کر پھر سے اپنے اصل ہالے، اپنے اصلی رنگ میں لوٹ آتی ہے۔

اچھے رموز آشنا یا علامتی کہانی کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی اوپری سطح پر بھی ایک بھرپور یا بھری پری کہانی ہوتی ہے۔ ایسی کہ آسانی سے بیان ہو جاتی ہے۔ اور اپنا پہلا یا ظاہری اثر ڈال دیتی ہے۔ دوسرا وصف اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کی علامت یا علامتوں کے ڈانڈے ٹھوس حقائق سے بنا کھینچے تانے یا کھینچ تان کیے مل جاتے ہیں۔ ان علامتوں میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت مختلف حقیقتوں کے انعکاس کا آئینہ بن جاتی ہیں۔ اس آئینے میں جو جس حقیقت کو دیکھنا چاہے وہ اسے دکھائی دے جاتی ہے یا دکھانے والا جو منظر یا پیکر اس میں دکھانا چاہتا ہے، دکھا دیتا ہے۔ یعنی اچھی علامت میں پھیلاؤ ہوتا ہے۔ اس کا دائرہ بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ ایک ہی شے میں چوڑائی بھی نظر آ جاتی ہے اور گہرائی بھی۔ لمبائی بھی اور موٹائی بھی۔ پانی زندگی بھی بن جاتا ہے اور موت بھی۔ آگ تاب و توانائی اور حرکت و حرارت کی علامت بھی بن جاتی ہے اور ان کے تضاد کی علامت بھی۔ ہوا میں ہولنا کی کا منظر بھی سمٹ آتا ہے اور خوش باشی کا سماں بھی۔

اچھی علامت کی تیسری اچھائی یہ ہے کہ اس کو سمجھنے میں اتنا زور نہیں لگانا پڑتا کہ دماغ کی ہڈّیاں چیخ جائیں۔ اعصاب تن جائیں۔ نسیں ڈھیلی پڑ جائیں۔ اتنا زور لگانا پڑے کہ یا تو قبض ہو جائے یا دست چھوٹ جائے اور سر درد کی دوا یا قبض کشا گولیاں کھانی پڑے۔

یہاں اردو کی کچھ کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں جو علامتی کہانیوں کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ میں نے بھی انھیں علامتی کہانیوں کی طرح پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے تجزیے سے شاید آپ کو بھی اندازہ ہو جائے کہ علامتیں کہاں مسئلے کو سلجھاتی ہیں اور کہاں معاملے کو الجھا دیتی ہیں۔ کوئی فن کار علامتوں کے استعمال میں کیوں کامیاب ہو جاتا ہے اور کوئی کیوں کرنا کام رہ جاتا ہے؟

انور سجاد کی کہانی 'گائے' اردو کی چند مشہور و مقبول کہانیوں میں سے ایک ہے۔ میرے خیال میں اپنی اوپری سطح پر ایک کامیاب کہانی ہے۔ اس میں ایک ایسے سیدھے، سادے، معصوم، مفید، کارآمد اور نفع بخش جانور جو اپنی ان خصوصیات کی بدولت معصومیت اور سیدھے پن کی علامت بن چکا ہے، اس کی پرسوز اور المناک کہانی بیان کی گئی ہے۔ وہ جانور ایک گائے ہے جو ایک طویل مدّت تک دودھ دیتی رہی ہے، اپنے بوڑھاپے یا کمزوری کے سبب اب وہ دودھ دینے سے معذور ہو گئی ہے تو اس کے مالکان اسے بوجھ سمجھنے لگے ہیں اور اسے ٹھکانے لگانے کے درپے ہیں۔ وہ بے چاری اپنے کھونٹے سے الگ ہونا نہیں چاہتی مگر زبردستی اسے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اسے ہٹانے اور بوچڑ کھانے میں بھیجنے کے لیے زور زبردستی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اسے مارا پیٹا جا رہا ہے۔ طرح طرح سے زدوکوب کیا جا رہا ہے۔ اس کی دم اینٹھی جا رہی ہے۔ اس کی پیٹھ اور منہ پر ڈنڈے برسائے جا رہے ہیں۔ اسے بری طرح گھسیٹا جا رہا ہے۔ اس کے منہ میں کھرلی پھنسائی جا رہی ہے۔

اس عمل میں اس کی زبان اینٹھ جا رہی ہے۔

اسے نہیں معلوم کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے مگر اس کے احتجاج اور زمین پر کھروں کے جماو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ٹھکانے کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اسے اپنی زمین سے جدا ہونا قطعی گوارا نہیں۔ اس کا ایک سبب، یہ بھی ہے کہ یہاں اس کا بچھڑا بندھا ہے۔ جس سے اس کو اتنا پیار ہے کہ وہ سخت اور سنگین قسم کی بندشوں کو توڑ کر اپنے جگر کے ٹکڑے کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اس اذیت ناک حالت میں بھی وہ اسے چومنے چاٹنے لگتی ہے۔ اولاد کی محبت میں اسے یہ بھی احساس نہیں رہتا کہ اس کی زبان زخمی ہے۔ ادھر ایک ماں ہے کہ اولاد کے لیے تڑپی جا رہی اور ادھر اس کا بیٹا ہے کہ وہ اپنا چارہ کھانے میں مست ہے۔

ماں کی کوئی فکر نہیں، کوئی پرواہ نہیں۔

ماں کی پیٹھ پر پڑنے والی ضرب سے نکلنے والی درد ناک آواز کا کوئی اثر نہیں، اسے اس بات کا بھی غم نہیں کہ اس کی ماں بوچڑ۔ خانے میں قصائیوں کے ہاتھوں کٹنے جا رہی ہے۔

سالوں تک خدمت کرنے اور اپنے خون سے بنے دودھ سے مالکوں کے تن بدن کو توانا اور چہروں کو سرخ و سپید بنانے اور کبھی کوئی قصور نہ کرنے والی گائے کو بوچڑ خانے میں بھیج دیا گیا اور کسی کے دل پر رتّی بھر بھی اثر نہیں ہوا۔ ایک پر ہوا بھی تو اس پر لعنت ملامت کے پیر برستے رہے۔ اور برستے بھی کیوں نہیں کہ ان کے اس عمل میں اس سے رخنہ جو پڑتا رہا۔ گھر کے طبیلے میں پلی اور اپنے کھونٹے سے بندھی گائے کو گھر اور کھونٹے سے اس لیے الگ کر دیا گیا کہ کرنے والوں کی داڑھیوں میں عقل باس کرتی تھی۔ عقل جو زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے تو احساس اور جذبے کو کچل دیتی ہے۔

اب ذرا اس کہانی کے اندرون میں اتریے اور نچلی سطح پر دیکھیے کہ کیا یہ گائے ہماری، آپ کی، ہمارے معاشرے کی، ہمارے سنسار کی کہانی نہیں کہتی۔؟

کیا ہم اپنے اپنوں کو بلا کسی قصور کے اپنے سے

الگ نہیں کر دیتے؟

کیا ہمیں کسی کی پیڑا کا احساس ہوتا ہے۔

اور اگر کسی کو ہوتا ہے تو کیا ہم اسے لعنت ملامت نہیں کرتے۔

کیا ہماری عقل زیادہ بڑھ نہیں گئی ہے؟

یہ گائے ہماری کہانی تو کہتی ہی ہے، اس کے علاوہ اس گائے کی کہانی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے حس کے سینگوں پر یہ دنیا ٹکی ہے۔ وہ تو ہمیں سنبھالے ہوئے ہے مگر ہم اس کو آئے دن اپنی عقل کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، ہماری مادہ پرستی اور خودغرضی اسے ہی مٹانے پر تلی ہوئی ہے جو ہمیں بقا اور تحفظ فراہم کرتی ہے۔

علامتی کہانی مگر سادہ زبان۔ کوئی پیچ نہیں۔ کہیں کوئی الجھاو نہیں۔

کہانی کے آخری پیراگراف میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ گائے کو ان انسانی معصوم، منفعت بخش مثبت جذبوں کی علامت سمجھا جائے جو وقت کی شہ زور مادہ پرستی کے رویے اور عقلیت کے غلبے سے متصادم ہیں۔ جو ان طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہیں اور ان کے زور لگانے اور مٹانے سے بھی نہیں مٹتیں کہ دنیا میں توازن قائم رکھنے اور چہرۂ کائنات کو خوبصورت دکھائی دینے کے لیے ان کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ اگر یہ نکتہ افسانہ نگار کے شعور یا لاشعور میں نہیں ہوتا تو وہ یہ نہیں کہتا:

''پھر مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔ کنکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو، بچھڑے کو، بابا کو، اپنے کو، ڈرائیور کو، یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جا کر دیکھے اور آ کے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔''

پھر تو وہ سیدھے سیدھے یہ کہتا کہ گائے کو بوچڑ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

ممکن ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ دوسرے لوگ اس گائے کا کوئی اور روپ تلاش کریں۔ اس میں سے کوئی اور پیکر نکالیں۔ اس کا کچھ اور معنی ومفہوم ڈھونڈ لیں۔ ایسی صورت میں اس کہانی کی معنویت اور بڑھ جائے گی۔ اس کا دائرہ اور وسیع ہو جائے گا۔

یہ تو رہیں کچھ خاص خاص باتیں جن کی باہمی آمیزش یا منطقی ترتیب سے یہ کہانی بنتی ہے کہ ایک گاڑی شہر میں داخل ہوتی ہے۔ مختلف علاقوں میں گھوم گھوم کر کچھ رنگ برنگے پرندے پکڑتی ہے۔ انھیں ایک خاص طرح کی گاڑی میں بھر کر شہر سے باہر لے کر چلی جاتی ہے۔ اور یہ جو پرندے پکڑے جاتے ہیں ان میں کبوتر، طوطا، مینا، بلبل، قمری گوریا نیل کنٹھ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں، زیادہ تر وہ پرندے ہیں جن کی منقاروں سے خوش الحان آوازیں نکلتی تھیں اور پروں سے رنگ پھوٹتے تھے۔ ان آوازوں سے کائنات کی فضاؤں میں موسیقی گھلتی تھی۔ رنگوں سے سنسار کو رنگینی و رعنائی ملتی تھی، جن کے دم سے جبینیں دمکتی تھیں۔ جن کے نور سے آنکھیں چمکتی تھیں۔ جن کے سُروں سے سرور ملتا تھا۔ جن کے زیر و بم سے چاروں طرف چہروں پر پھول کھلتا تھا۔

مگر یہ رنگ، نور، سُر سب قید کر دیے گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کو قید ہونے سے کسی نے نہیں روکا۔ سب اپنے اپنے کاروبار میں لگے رہے۔ اپنے اپنے نفع نقصان کے چکّر میں پڑے رہے۔ اپنے اپنے محدود دائروں میں سمٹے رہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ مہ لقا کبوتر اگر چلا گیا تو ایک بیمار بچی کی جان چلی جائے گی۔ ان پرندوں کے جانے کی فکر کچھ لوگوں کو ستاتی رہی مگر دھیرے دھیرے وہ بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے یا وہ بھی بے حس ہو کر رہ گئے۔

ہماری تنقید اس روش پر چل پڑی ہے کہ کہانی کے صرف معنی کو پکڑنا ہے یا زیادہ سے زیادہ زبان کی کچھ غلطیوں کو پکڑ میں لانا ہے جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ معنی و مفہوم کے ساتھ ساتھ ہماری نگاہیں کہانی کہنے کے ڈھنگ پر بھی جاتیں۔ زبان و بیان کے حسن پر بھی ٹھہرتیں۔ جملوں کے در و بست سے قائم ہونے والے لسانی توازن اور اس سے پھوٹنے والی تخلیقی شفق پر بھی رکتیں۔ سمجھتیں اور سمجھاتیں کہ کہاں کہاں پر فن کے فوّارے چھوٹے ہیں؟ کس کس جگہ سے تخلیقی آبشار پھوٹے ہیں۔؟ کس کس مقام پر کس کس اسلوب کی دھنک تنی ہے اور اس سے جن رنگوں کی شعاعیں نکلتی ہیں وہ کیسی ہیں؟ کہاں گاڑھی ہیں اور کدھر مدھم ہیں؟ اس کہانی میں یہ جملے:

''تو بابو! جلیبیوں کا یہ رس جو کھیاں چوستی ہیں تو رس اور مکھّیاں کہاں جاتی ہیں، ذرا اتنا تو بتاؤ..

حلوائی فیصلہ کن لہجے میں بولا،

''رس مکھیوں کے پیٹ میں اور کھیاں جلیبیوں کے ساتھ پلڑے پر۔ سمجھ گئے نا؟''

''ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش رنگ تتلی نیم جان سی پڑی تھی جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے ہی پھڑ پھڑانے لگی۔ اس کے ننھے پروں کے ارد گرد زعفرانی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ اور پروں کے عین درمیان زیرہ کے برابر سرخی تھی۔ اور اس سرخی کے چاروں طرف گلابی رنگ چھلکا ہوا تھا اور پروں کے کناروں پر افشاں چمک رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بے حد حسین دکھ رہی تھی۔''

کس طرح کا جلوہ دکھا رہے ہیں؟ فن کے کیسے کیسے موتی لٹا رہے ہیں؟ زندگی کی کیسی کیسی بلیغ اور معنی خیز تصویریں بنا رہے ہیں؟

کاش ہم دیکھ پاتے کہ ان مکھی اور جلیبی والے جملوں میں کتنا مکھن ہے۔؟ کتنی ملائی ہے؟ کتنے میوے پڑے ہوئے ہیں؟ رس گُلّوں کا کتنا رس گھلا ہوا ہے؟ ان جملوں میں کیسے کیسے رنگ ہیں؟۔ کیسا کیسا نور ہے؟ ان رنگوں سے کیسی کیسی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں؟ ان کے لمس سے لبوں پر کیسی کیسی تتلیاں بیٹھ رہی ہیں؟ ان سے مور نکل کر کیسا کیسا رقص دکھا رہے ہیں؟

غیاث احمد گدی نے اپنی اس افسانوی گاڑی میں ایسی سبک، خوبصورت اور پرسوز کہانی سوار کر دی ہے اور جزئیات نگاری کے وہ وہ کمالات دکھائے ہیں کہ ایک ایک بیان، ایک ایک جملے، ایک ایک منظر، ایک ایک نکتے پر بے ساختہ داد نکلتی ہے۔ انھوں نے منی بائی کے پیشے اور کہانی کے دھندے کے موازنے سے ادب وفن کی نا قدری کا وہ مذاق اڑایا ہے، کہ قدروں کی دھجیاں روئی کے گالوں کی طرح بکھر گئی ہیں۔ مادہ پرستی کے آگے علم وفن کی کیا حیثیت ہے اور پیٹ کی بھوک کی آگ روح کی ضرورت کو کس طرح جلا کر خاک اور زندگی کے باقی سارے رنگوں کو راکھ کر دیتی ہے اس کی ایسی ایسی پرکشش تصویر کھینچی ہیں کہ انھیں دیکھ کر آنکھوں میں لہو اتر آتا ہے۔

ایسے صاف شفّاف اور سفاک پیکر بنائے ہیں جن سے نہاں خانوں کے منظر بھی اجاگر ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کو پکڑنے والے کون ہیں؟ پرندوں کی چھٹپٹاہٹ کو دیکھ کر کیوں ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے، سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ایک ایک سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ ایک ایک بات اور ایک ایک ہونی کا جواز سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بچے کی ماچس کی ڈبیا میں بند رنگین تتلی کے نکل جانے کے غم کا تصور بھی متشکل ہو جاتا ہے اور فن کار کے سینے کا دکھ اور اداسی کا سبب بھی مجسم ہو کر نگاہوں میں آ جاتا ہے۔

یہ گاڑی آج بھی شہروں شہروں، قصبوں قصبوں، قریوں قریوں، گاؤوں گاؤوں گھوم گھوم کر پرندے پکڑنے میں مصروف ہے۔ اپنی پھنگی کے گچھے میں گوند یا کوئی لس دار مادّہ لپیٹے منڈیروں، میناروں، چھتوں، کھمبوں وغیرہ پر بیٹھے معصوم، خوش رنگ، خوش بیان، خوش جمال اور خوش

خصال پرندوں کو چپکاتی پھر رہی ہے۔انھیں اپنے اندر قید کرتی جارہی ہے۔دنیا ان کی چھٹپٹاہٹ کو دیکھ بھی رہی ہے مگر وہ کچھ نہیں کرتی۔اپنے کاروبار میں مگن اور مصروف رہتی ہے۔اگر کوئی اس جانب ملتفت ہوتا بھی ہے تو اس کے آگے چھچماتے ہوئے سکّے بکھیر دیے جاتے ہیں اور وہ ان سکوں کو سمیٹنے میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔

یہ پرندے کیا ہیں؟ یہ دراصل وہ قابلِ قدر انسانی قدریں ہیں جو حیات و کائنات کی رگوں میں رس گھولتی ہیں۔کسی قدر کے نرم پروں کے لمس سے بے حس وحرکت جسموں میں جان پڑتی ہے۔کسی کے قرب سے کسی ٹھکرائی، تھکی اور ٹھٹھکی ہوئی مٹّی کی زندگی کو امید و آس کی راہ اور رفتار ملتی ہے۔کسی کا نور کسی کے دل میں دردمندی کی جوت جگاتا ہے۔اور کسی کا لمس کسی کے اضطراب کو اطمینان میں بدل دیتا ہے۔کسی کا رنگ کسی میں تتلی کے رنگوں کو محفوظ کر لینے کا جذبہ بھرتا ہے۔کسی کا زور کسی کو دن دن بھر اداس رکھتا ہے۔اس سے کہانی لکھواتا ہے اور اس کہانی کے عوض ملی اجرت کو کسی ضرورت مند کو بنا کسی غرض اور لالچ کے دلوا دیتا ہے۔

مگر افسوس کہ خوش رنگ قدروں کے پرندے ایک رنگین گاڑی کے زرد و سیاہ رو گاڑی بانوں کے ہاتھوں میں تھمے اس بانس کی زد پر ہیں جس کے اوپری سرے پر بنے گچھے میں بہت سارا لس دار چپچپا مادہ بھرا پڑا ہے۔

''کہانی کا عنوان' کوؤں سے ڈھکا آسمان'' چونکاتا ہے۔عنوان پڑھتے ہی آنکھیں متجسّس ہو جاتی ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ عام طور پر بادلوں یا گرد و غبار سے ڈھکنے یا ڈھک جانے والا آسمان کوؤں سے کیوں ڈھکا ہے؟ آسمان کو ابر کی سیاہ پرتوں سے ڈھانپنے اور کوؤں کے کالے پروں سے ڈھکنے میں کیا فرق ہے۔اگر افسانہ نگار کوؤں کی جگہ بادل استعمال کرتا تو کیا ظلمت میں کچھ فرق پڑ جاتا؟ آسمان سے زمین پر آنے والی روشنی کو کیا بادل پوری طرح روک نہیں پاتے؟ کیا کوؤں کے پر روشنی کو روکنے اور تاریکی کو پھیلانے میں زیادہ کارگر ہیں،؟ یا آسمان کو بھجنگ کوؤں سے ڈھانپنے کا کوئی اور معنی نکلتا ہے؟ اگر کوئی اور معنی نکلتا ہے تو وہ معنی کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب یا کوئی منطقی جواز کہانی کے اندر داخل ہونے اور تلاش کرنے پر کہیں نہیں ملتا۔البتہ انور خان کا یہ افسانہ ظاہری سطح پر ایک کہانی کہنے میں کامیاب ہے؟ یہ اور بات ہے کہ کہانی انور سجاد کی گائے اور غیاث احمد گدی کی پرندہ پکڑنے والی گاڑی کی طرح پہلی سطح پر بیان تو ہو جاتی ہے مگر ذہن میں اس طرح کھل نہیں پاتی جس طرح گائے اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی ذہنوں میں کھل جاتی ہیں۔

یعنی یہ افسانہ پہلی سطح پر یہ بیان کرنے میں کامیاب ہے کہ کچھ لوگ بے شمار بھجنگ کوؤں سے ڈھکے آسمان کے نیچے کڑکڑاتی ہوئی سردی میں آگ کے الاؤ کے پاس اندھیرے میں بیٹھے اپنے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو گرماہٹ پہنچانے کے جتن میں مصروف ہیں۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔بجلی غائب ہے۔لکڑیاں کم ہوتی جارہی ہیں۔آگ کی حدّت میں کمی آتی جارہی ہے۔آگ کو جلائے رکھنے کے لیے جد وجہد کے باوجود آس پاس جب کسی قسم کا کوئی ایندھن نہیں مل پاتا ہے تو وہ باری باری سے اپنے جسم کے کپڑے اتار کر آگ میں جھونک دیتے ہیں تاکہ آگ بجھے نہیں۔اس سے لو نکلتی رہے اور ان کے کپکپاتے ہوئے جسم و جاں کو گرمی ملتی رہے۔کالے کوؤں سے اٹے سیاہ آسمان، سرد موسم، بجھتی ہوئی آگ، بجلی گل ہو جانے کے باعث فضا پر چھائی ہوئی تاریکی میں ماحول سنگین ہوتا جارہا ہے۔رات لمبی محسوس ہونے لگی ہے۔ماحول، موسم، مشکلات کی مار اور مضطرب ذہن و دل کی بڑھتی ہوئی اذیت سے بچنے اور وقت کاٹنے کے لیے وہ کہانی سنانا شروع کرتے ہیں۔یہ ترکیب انھیں اس لیے سوجھتی ہے کہ اسی دوران انھیں کی طرح کا ایک اور آدمی ان کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے جس کا دھندا کہانی جمع کرنا اور سنانا ہے۔

مگر یہ کہانیاں بھی ان کے دکھوں کا مداوا نہیں بنتیں اور رات کے کسی پہر میں آگ بجھ جاتی ہے۔لو ٹھٹھر کر اینٹھ جاتی ہے۔ان سبھی کے جسم بھی سرد پڑ جاتے ہیں اور متحرک رہنے والی جان جم کر بے حس و حرکت ہو جاتی ہے۔صبح میونسپلٹی کی گاڑی آتی ہے اور کوڑا کرکٹ کی طرح انھیں بھی اپنے اندر ڈال کر لے جاتی ہے۔

یہ افسانہ اپنی کہانی تو سنا دیتا ہے مگر سمجھا نہیں پاتا کہ اس کا تھیم کیا ہے؟۔اس میں کہا کیا گیا ہے؟ کہانی کار کا مقصد کیا ہے؟ کہانی کے بیانیوں، مکالموں اور ڈرامائی منظروں سے کوئی صورت نہیں بنتی کہ ہم صحیح انجام تک پہنچ جائیں۔ یہاں ڈانڈے اس طرح نہیں ملائے گئے ہیں جس طرح ہماری کلاسیکی کہانیوں میں مل جاتے ہیں یا متذکرہ جدید کہانیوں گائے اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی میں ملائے گئے ہیں۔

اس کہانی میں کچھ لوگ گھور تاریکی کڑاکے کی سردی کے سبب اور آگ کی کمی کے باعث مر جاتے ہیں مگر ان کی موت بھی قاری پر وہ اثر نہیں ڈال پاتی جیسا اثر انور سجاد کی گائے کی اذیت اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی میں بند پرندوں کی چھٹپٹاہٹ اور اپنی بیمار بہن کے تئیں ایک چھوٹے سے بھائی کے ذہن و دل میں لہر لینے والی کیفیت سے ہوتا ہے حالانکہ یہاں افسانہ نگار نے ڈرامائی فضا اور میر امن کی باغ و بہار یعنی قصۂ چہار درویش کی داستانوی ٹیکنیک سے بھی کام لیا ہے مگر وہاں قصۂ چہار درویشوں کی کہانی کُھلی کُھلی اور کِھلی کِھلی سی لگتی ہے۔ اس کی معنویت کھلی ہوئی فضا میں سانس لیتی ہے اور یہاں کہانی بند بند اور بجھی بجھی سی لگتی ہے اور اس کی معنویت مجروح اور گھٹی گھٹی سی محسوس ہوتی ہے۔ وجہ غالباً جدیدیوں کے اسلوب کا وہ مبہم، تجرید اور رمز و کنایہ والا رویہ ہے جسے بیانیہ کے موقع پر بھی استعمال کیا گیا اور بیشتر جدید کہانیوں میں روا رکھا گیا۔

افسانہ اپنی کہانی سنانے میں تو کامیاب ہو گیا مگر اپنی معنویت کی تفہیم کرانے میں ناکام کیوں رہ گیا یہ جاننے کے لیے آپ کچھ سوال کھڑے کر سکتے ہیں۔مثلاً اس طرح کے سوال:

آسمان کو کوؤں سے ڈھکا ہوا کیوں دکھایا گیا، وہ بھی بے شمار اور بھجنگ کووں سے؟

افسانے میں بجلی کیوں گُل کی گئی ؟

آگ کے پاس کڑاکے کی سردی میں رات کے وقت بیٹھنے والے کون ہیں؟

وہ وہاں اس وقت کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ کیا ان کے پاس گھر نہیں ہے؟ کیا وہ مسافر ہیں جو کسی سبب سے گِھر گئے ہیں اور اپنے گھر نہ جا سکے ہیں؟ یا کیا وہ ہمیشہ وہیں رہتے ہیں؟

اطراف کی اونچی اونچی عمارتوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

ان عمارتوں کے دروازے اور کھڑکیاں کیوں بند ہیں؟

عمارتوں میں روشنی کیوں نہیں ہے؟

کہانیوں کے جو عنوانات بتائے گئے ہیں، ان کے معانی و مفاہیم کیا ہیں؟

بعد میں آنے والا شخص کیوں کہتا ہے کہ اس کے پاس کوئی کہانی نہیں ہے جبکہ کہانیاں جمع کرنا اس کا پیشہ ہے؟

اور یہ بھی کہ شہر کے کسی بھی آدمی کے پاس کوئی کہانی نہیں ہے۔

وہ کن یا کس طرح کی کہانیوں کی بات کر رہا ہے؟

اس بات پر بھی حیرت کناں اور دہشت زدہ کیوں ہیں کہ آج دن بھی نکلنے کا نہیں؟ اور دن کیوں نہیں نکلے گا؟ ایسا ہو نہیں سکتا کہ دن نہ نکلے، اس طرح کے سوال ان کے لبوں سے کیوں اچھل رہے ہیں؟

اب آیئے دیکھیں کہ افسانہ ان سوالوں کا جواب دیتا

ہے کہ نہیں اور دیتا ہے تو وہ جواب اطمینان بخش ہیں یا نہیں؟

پہلے سوال کا جواب کہانی کی طرف سے یہ ہو سکتا ہے کہ بے شمار بھجنگ کوؤں سے مراد ہے کہ رات بہت کالی ہے اور مہیب کالی رات راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ مصیبت کو بڑھاتی ہے۔ یہاں صرف کوؤں کے رنگ سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی آواز کائیں کائیں سے نہیں جبکہ وہ زیادہ سماعت کی تکلیف اور ذہن کی اذیت کا باعث ہوتی ہے اور منحوس بھی سمجھی جاتی ہے۔

دوسرے سوال یعنی بجلی کیوں گل ہوئی اس سوال کا جواب افسانے سے نہیں ملتا۔ جس شہر کا نظام اتنا اچھا ہو کہ وہ اپنی سڑکوں تک کا خیال رکھتا ہو، اور جن پر ایک تنکا اور کاغذ کا ایک پرزہ تک نہ دکھتا ہو اور جو ہر وقت کی صفائی ستھرائی کی بدولت چمچماتی رہتی ہوں وہ نظام اپنے شہریوں کو گھنٹوں اندھیرے میں کیوں رکھتا ہے۔ یہاں انتظامیہ کا نظم و نسق فیل یا مجہول کیوں ہے؟

باہر اور چوراہوں پر تو بجلی نہیں ہے کہ یہ سرکاری معاملہ ہے ممکن ہے مشین کی خرابی یا عملے کی لاپروائی یا اسٹرائک کی وجہ سے چلی گئی ہو مگر اونچی اونچی عمارتوں میں اندھیرا کیوں؟ ان میں تو اونچے اونچے لوگ رہتے ہیں جن کی آنکھوں کو ایک لمحے کی بھی تاریکی گوارا نہیں اور جو اپنا ان ورٹر رکھتے ہیں۔ کوئی یہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ جس زمانے میں یہ افسانہ لکھا گیا، انورٹر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ چلو مان لیا مگر جنیٹر تو تھا۔ مدھو مکھیاں تو نہیں مر گئی تھیں۔

موم تو نکلتا ہوگا۔ موم بتیاں تو بنتی ہوں گی۔

رات کے وقت شدید سردی کے موسم میں آگ کے پاس بیٹھنے اور کہانی سنانے والے کون تھے اس سوال کا بھی جواب موجود نہیں ہے۔

اطراف میں کھڑی اونچی اونچی عمارتوں کو شاید اس لیے دکھایا گیا ہے کہ زمین پر کھلے سیاہ آسمان کے نیچے بیٹھے آدمیوں کا کرب تضاد کے تناظر میں اور شدید ہو کر ابھر سکے مگر ایک تکلیف سے تو اونچی عمارتوں میں رہنے والے بھی دوچار ہیں۔ وہاں بھی اندھیرا مسلط ہے۔ آسمانی ظلمت ان پر بھی مہربان نہیں ہے۔ لہٰذا کوؤں سے ڈھکے آسمان کی ظلمت کے شکار صرف وہی نہیں ہیں جو عمارت سے باہر زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

اونچی عمارتوں کے دریچے اور دروازے بند ہیں یا کھلے ہیں، گھپ اندھیرے میں وہ بھی ایسے عالم میں جبکہ کمروں کے چراغ تک گل ہوں، دیکھ پانا آسان نہیں۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دروازوں اور کھڑکیوں کو بند دکھانے میں کیا منطق ہے، یہ بھی کہانی سے ظاہر نہیں ہوتی۔

دن نہ نکلنے سے متعلق آخری سوال جس سے کئی اور سوال بھی جڑے ہوئے ہیں، پر بھی افسانہ چپ ہے۔

کہانیوں کے عنوانات سے کچھ اشارے تو ضرور ملتے ہیں کہ ان سے کچھ انسانی ضرورتوں اور خواہشوں کا انعکاس ہوتا ہے مگر ان کا عکس بھی اتنا روشن نہیں کہ ان کی تجسیمی صورت سامنے آ سکے۔

بعد میں آنے والے شخص کی اس بات کا بھی کوئی معقول سبب بیان نہ ہو سکا کہ اسے کہانیاں کیوں نہیں ملیں اور نہ ہی اس طرف کوئی اشارہ ملتا ہے کہ وہ کس طرح کی کہانیوں کی بات کرتا ہے؟

کہانی میں موجود ان نئے درویشوں کے دل و دماغ سے نکلے کہانیوں کے عنوان اور ایک دوسرے کے عنوان پر ان کے مسکرانے کے انداز سے اتنا اندازہ ضرور لگتا ہے کہ وہ جاہل، ان پڑھ اور مزدور قسم کے کردار نہیں ہیں۔ وہ حساس بھی ہیں اور شعور و ادراک بھی رکھتے ہیں اس کے باوجود وہ ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں۔

اس کا ذمے دار کون ہے اور کیوں ہے اس کا جواب بھی افسانے سے ایسا نہیں ملتا جسے سن کر ہم لرز اٹھیں یا ہمارے حواس حیرت میں پڑ جائیں یا ہم بھی پتھر ہو جائیں۔

دراصل یہ ان کہانیوں میں سے ایک ہے، جن میں جدیدیت کے ٹولز خوب استعمال ہوئے ہیں اور ان کے استعمال میں منطق کا استعمال سے کم کیا گیا ہے ورنہ جہاں آسمان بے شمار کالے کالے کوؤں سے ڈھکا ہو۔ اوپر کی روشنی دبیز سیاہی میں دب چکی ہو۔ نیچے کی بجلی گل ہو۔ آس پاس کی عمارتوں کے دروازے اور کھڑکیاں بھی بند ہوں۔ کسی کمرے میں روشنی کی کوئی جھلک تک نہ ہو، ایسے میں شہر کی سڑکوں کی چمچماہٹ وہی دیکھ سکتا ہے جس کی پتلیوں میں بصارت کی جگہ بصیرت ہو۔

ہمارے بعض جدیدیے دنیا کو تیسرے نیتر سے دیکھتے تھے اور انھیں وہ چیزیں بھی دکھائی دے جاتی تھیں جو عام آنکھوں سے نظر نہیں آتیں۔ ممکن ہے کوئی تیسری آنکھ سے دیکھے تو سب کچھ ممکن ہو جائے۔

بانگ کی بڑی اہمیت ہے خواہ وہ علامہ اقبال کی بانگ ہو یا شوکت حیات کی۔ خواہ کسی درند کی بانگ ہو یا پرند کی۔ بانگ نہ ہو تو صبح نہ ہو، دن نہ نکلے۔ حیات میں حرکت نہ ہو۔ معاملات میں برکت نہ ہو۔ کائنات بیزار نہ ہو۔ انسان برسرِ پیکار نہ ہو۔ کار، کاروبار نہ ہو، حالات سازگار نہ ہوں، شعور و ادراک ہشیار نہ ہوں۔۔ بانگ وہ سر ہے، جس کے تال پر سیاہ افق سے سرخ شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پو پھٹ جاتی ہے۔ سورج نکل آتا ہے۔ جس کے شور سے زورِ جبر ارتھرا اٹھتا ہے۔ رعبِ زردار لرز اٹھتا ہے۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہل جاتے ہیں۔ اوقات اور حالات بدل جاتے ہیں۔

بانگ بند ہو جائے تو وقت کی رفتار رک جائے۔

کاروبارِ دنیا ٹھپ پڑ جائے۔ دماغ تشویش میں پڑ جائے۔ دل میں خدشات کا کانٹا گڑ جائے۔ ذہن کا توازن بگڑ جائے۔ پولٹری فارم کے مالک کی چھری اپنے ہی دربے کے مرغ کی گردن پر پہنچ جائے۔ اپنے ہم زاد کا خون ہوتا دیکھ کر دربوں کے باقی مرغوں کی آنکھوں میں لہو اتر آئے۔ ان کی چونچ دربوں کی جالیوں پر پہنچ جائے اور پھر ان سیاہ سفید اور چتکبرے مرغوں کے سینے میں ایک سرخ انقلاب برپا ہو جائے۔

یہی منظر شوکت حیات کی کہانی 'بانگ' میں نظر آتا ہے۔ شوکت حیات اس منظر کو اتنے بڑے کینوس پر پھیلاتے ہیں کہ مرغ کے پروں کے رنگ طرح طرح کے رنگ دکھانے لگتے ہیں۔ ان رنگوں سے سیاہ، سفید، سرخ اور چتکبرے پیکر ابھرنے لگتے ہیں۔ ان رنگ برنگے پروں والے مرغوں کے پاس ان کی مرغیاں بھی سمٹ آتی ہیں اور اپنی باریک باریک خشک منقاروں سے اپنی زندگی کے لہو میں تر بتر کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔ اپنے پیاروں سے الگ ہونے کا کرب، ان کی گھٹن، ان کی بھنچی بھنچی سی آواز سب کچھ ان کے سینے سے باہر آنے لگتا ہے۔ طرح طرح کی محرومیاں جھانکنے لگتی ہیں۔

ہم جنسوں کی گردنوں پر چلنے والی چھریاں، ان کے جسموں سے نچے جانے والے پر، ادھیڑی جانے والی کھال، جسم کی بننے والی بوٹیاں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر ان کے گوشت اور گرم آگ پر سینکے جا رہے اس گوشت سے نکلنے والے عرق کو دربوں کے مرغ دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جل رہی انتقام کی آگ اور سلگ اٹھتی ہے۔ ان کی چونچیں چاقوؤں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور وہ چاقو چیرنے پھاڑنے کے جذبے سے مغلوب ہو کر قفس نما دربوں کی مضبوط جالیوں سے بھڑ جاتے ہیں۔ مرغوں کے سینے میں انتقام کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ احتجاج کے شعلے شرر فشاں ہونے کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ اپنی منقاروں میں طاقت بھرتے رہتے ہیں۔ اپنے ڈینے مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پنجوں کی چھریوں کو تیز کرتے رہتے ہیں اور ایک دن دربوں کی جالیاں توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔

الگ الگ گوشوں، الگ الگ دربوں، الگ الگ خانوں میں بٹے اور دور دور رہنے والے سارے مرغ

ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ان کی ایک منظّم فوج تیار ہو جاتی ہے۔ سر پر سرخ کلغیوں کے خود پہنے سپاہی اپنے پنجوں کے خنجر اور منقاروں کے تیر و تبر سے لیس ہو کر اجتماعی بانگ کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دشمن کے جسموں پر چونچ کی مار پڑنے لگتی ہے۔ پنجوں کی چوٹ سے چمڑی ادھڑنے لگتی ہے۔ مرغ کے سوندھا سوندھا گوشت کھانے والے خود لہولہان ہونے لگتے ہیں اور مرغوں کا مسلسل یلغار، پنجوں کی مار اور منقاروں کے وار سے زخمی ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

دربے میں بند مرغوں نے کیسے باہر نکل کر مورچہ سنبھالا، سوئی ہوئی مرغیاں کس طرح تن کر راہ میں کھڑی ہوگئیں اور کس طرح ان کو ذبح کرنے والے ان کے حملوں سے زخمی ہوئے اور کیسے وہ اس مقام کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے جہاں وہ ان کی گردنوں پر چھری پھیرا کرتے تھے، یہ منظر آپ خود شوکت حیات کے بنائے ہوئے پیکروں میں دیکھیے:

''یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور خوف کا ٹھکانہ نہ رہا کہ ابھی ابھی جو مرغیاں باہر سو رہی تھیں، وہ ان کے راستے میں تن کر کھڑی ہیں۔ سب کے سب اچھل کر دروازے تک آئے۔ ابھی وہ مرغی خانے کا دروازہ بند کرنا ہی چاہ رہے تھے کہ چتکبرے چوزوں کی فوج ان پر حملہ آور ہوگئی اور وہ بے تحاشا بھاگے۔ چاروں طرف ہوا میں مرغوں کی کلغیاں۔ بجلیوں کی طرح کوند رہی تھیں اور زمین پر جوزوں کی فوج اپنے چھری نما پنجوں سے اچھل اچھل کر ان پر حملے کر رہی تھی۔''

''فضا کے چپے چپے میں جنگلی مرغوں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی۔ اور اچھلتے ہوئے ان کے بجلی نما پنجے اور چونچ دیکھتے دیکھتے ان کے سفید کپڑے تار تار ہو گئے۔

اندر سے سیاہ بنیائن اور لنگوٹ نظر آنے لگے۔

اندھا دھندھ وہ اس پولٹری فارم سے دور بھاگے جا رہے تھے جہاں آج تک ان گنت مرغوں کو بانگ اور ہتھیلی کی لکیروں کے غسلِ آفتاب کی آڑ میں وہ ذبح کر کے چٹخارے لے لے کے کھا چکے تھے اور رنگوں کی بنیاد پر ان کے جھنڈ کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکے تھے۔''

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ شوکت حیات نے صرف پولٹری فارم کے مرغوں کی کہانی سنائی ہے تو آپ غلط سمجھتے ہیں۔ شوکت حیات نے مرغوں اور مرغیوں کے ساتھ ساتھ پولٹری فارم کے باہر رہنے والی مخلوق کی بھی کہانی سنائی ہے جو ایک مختلف رنگ کے دربے میں رہتی ہے جس کی گردن پر بھی چھری چلتی رہتی ہے۔

مرغے تو اپنے دربوں کو توڑ کر باہر نکل آئے ہیں۔ اب دیکھنا ہے باہر کی مخلوق کب اپنا دربہ توڑتی ہے۔

افسانہ نگار نے یہ سارا مرقع اس لیے نہیں بنایا ہے کہ ہم خاموش کھڑے ہو کر انسان اور مرغ کے درمیان ہونے والی لڑائی کا تماشہ دیکھیں بلکہ اس معرکے کے مرقعے میں ہم یہ بھی دیکھیں کہ کہیں کہانی کار یہ تو نہیں کہہ رہا ہے کہ دربوں میں بند انسانی مرغے اپنے پنجوں سے جالیاں توڑ کر باہر نکلیں اور سبھی مل کر ایک ساتھ بانگ دیں تا کہ چاقو بکف بوچڑوں کی سماعتوں کے پرخچے اڑ جائیں اور ان کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ قید و بند میں رہنے والے آپس میں مل سکیں اور باہمی اختلاط کا موقع پا کر اپنی نسل کو آگے بڑھا سکیں۔

شوکت حیات نے یہی دو مرقعے نہیں بنائے ہیں بلکہ انھوں نے اس بانگ سے زبان و بیان کے ایسے ایسے پیکر بھی بنائے ہیں کہ لگتا ہے انھوں نے لفظوں کا ایک نگار خانہ سجا دیا ہے۔ ایسا نگار خانہ جہاں تصویریں دکھائی ہی نہیں دیتیں بلکہ بولتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ جھانکیے اس نگار خانے میں اور دیکھیے ان تصویروں کو، سنیے ان کی آوازوں کو:

''مرغ بانگ دینا بھول گئے ہیں اور انھیں یاد بھی ہے تو جان بوجھ کر جی چراتے ہیں... انھوں نے فوراً مرغوں کو ذبح کر ڈالا۔''

''اگر یہ حرام زادے ایک جگہ کر دیے جائیں تو نہ معلوم جالیوں کا کیا حشر ہو۔''

'جب تک انھیں ذبح نہ کیا جائے، ان کا دماغ درست نہ ہوگا اور یہ بانگ دینا یاد نہیں رکھیں گے۔''

کاہلو! بانگ دینے کے ڈر سے غائب ہو۔ اسی لیے ہم تمھیں چھوڑتے نہیں۔ اگر ہم تمھیں ذبح کر کے کھائیں نہیں تو تم ہمیں غائب کر دو گے۔''

''جب بھی ان کی چونچیں جالیوں کو توڑنے کے لائق ہوئیں ہم نے انھیں ذبح کر دیا۔''

''مختلف رنگوں کی چھری ان کی گردنوں پر سوار ہو گئی۔ انھوں نے چن چن کر ان تمام مرغوں کو ذبح کر دیا جن کی چونچیں لمبی اور مضبوط ہونے لگی تھیں اور بانگ دینے کے بجائے جالیوں کو توڑنے کا کام کرنے لگی تھیں۔''

یہ تصویریں کیا اس صورتِ حال کو پیش نہیں کرتیں جہاں ایک دبنگ زبردستی کسی سے بانگ دلوا رہا ہے تا کہ اس کی صبح ہو۔ اس کی صبح ہو تو اس کا وقت جاگے۔ اس کا مقدر بیدار ہو۔ انسان اگر ایسا نہیں کرتا، ہانکا نہیں لگاتا تو اس کی گردن پر چھری رکھ دی جاتی ہے۔ اس کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس کی کھال اتار لی جاتی ہے اور اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے وجود کو ہی مٹا دیا جاتا ہے۔

کیا اس پیکر میں اس زمین کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا عکس نہیں ابھرتا جو دربہ نما گھروں، کھولیوں، جھونپڑوں، بیرکوں میں بند ہیں اور اپنے مالکوں کے من موافق بولنے، نہ بولنے، یا چپ رہ جانے یا کسی قسم کا احتجاج کرنے پر جان سے مار دیے جاتے ہیں؟ کیا اس میں ایک کمزور قوم کی شبیہ نہیں ابھرتی جسے دوسری مضبوط قوم اسے جانور سمجھ کر جب چاہتی ہے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے؟

کیا اس میں ان لاکھوں لوگوں کے اندر کی گھٹی ہوئی چیخ سنائی نہیں دیتی؟ کیا ان کا خاموش احتجاج بولتا ہوا سنائی نہیں دیتا؟ کیا اس میں اس دبنگ قوم کی دبنگئی اور اس کا جبر اور اس کمزور قوم کے اندر کا کرب دکھائی نہیں دیتا؟

شوکت حیات کی یہ کہانی یہ بھی کہتی ہے کہ مرغ جب بانگ دوسروں کے لیے لگاتے ہیں تو یہ ان کی غلامی کی نشانی ہے۔ انھیں اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ بانگ دیں تا کہ اسے سن کر مالک لوگ بیدار ہو کر تاریکی سے روشنی میں آ سکیں اور ان کی سوئی ہوئی ساکت زندگی متحرک ہو کر پھر سے رفتار پکڑ سکے مگر جب وہ اپنے لیے لگاتے ہیں تو یہ ان کی آزادی کی علامت بن جاتی ہے جسے سن کر بوچڑوں کے ہاتھ تھرا اٹھتے ہیں۔ لہراتی ہوئی چھریاں گھبرا کر گر جاتی ہیں اور ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔

کہانی میں آغاز کی بانگ غلامی کی بانگ ہے اور آخر کی بانگ آزادی کی بانگ ہے۔ کہانی کار کا منشا یہ ہے کہ پہلی بانگ رک جا اور دوسری بانگ گونجتی رہے۔

مجھے لگتا ہے کہ میں نے علامت کی ماہیت، معنویت، افادیت، اس کی صورت گری، اس کی کارسازی اور کارگزاری کو آپ کے سامنے میں رکھ دیا ہے۔ اگر میری بات آپ تک پہنچ گئی ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ علامت کی گتھیاں مجھ پر کھل چکی ہیں اور اگر میرا عندیہ آپ تک نہیں پہنچ سکا تو مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ترسیل کی ناکامی کے المیے کا شکار میں اب بھی ہوں۔

■

Ghazanfar
Bushra, Lane A-12, Hamza Colony
New Sir Syed Nagar Extension
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 7678436704

شریف احمد قریشی

کلاسیکی متون کی فرہنگ
ضرورت و اہمیت

کلاسیکی متون کی فرہنگ کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالنے سے قبل لغت اور فرہنگ کے فرق و امتیاز کو بھی مختصر طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ کسی اصول یا قاعدے کے مطابق کسی زبان کے تمام الفاظ کے معانی و مفاہیم کا احاطہ کرنے والی کتاب کو لغت، ڈکشنری یا شبدکوش کہا جاتا ہے۔ دراصل کتابِ لغت کسی زبان کے تمام الفاظ کا احاطہ کرتی ہے اور فرہنگ ایک ایسی کتاب ہوتی ہے جو کسی خاص موضوع یا کسی شاعر و ادیب کی نگارشات میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

فرہنگ کی اصطلاح اور لغت نگاری و فرہنگ نویسی کے آغاز سے بہت پہلے فرہنگ نویسی کے نقوش نظر آتے ہیں۔ دراصل فرہنگ نویسی کی ابتدا سنسکرت اور یونانی زبانوں کے متون کی مرہونِ منت ہے۔ مختلف علوم وفنون اور ادب سے بہرہ ور ہندوستان، یونان اور روم جیسے ممالک میں متون یا مخطوطات وغیرہ کی مشکل اور دقیق تحریروں کے بین السطور یا حاشیے میں معانی، مطالب یا مفاہیم وغیرہ کا اندراج کر دیا جاتا تھا۔ اِن ہی مشکل الفاظ، دقیق تراکیب، محاورات وضرب الامثال، دوراز کار تشبیہات، غیر واضح استعارات، مبہم اشارات وغیرہ کے مطالب، مفاہیم اور تراجم ہی کو لغت نگاری و فرہنگ نویسی کے ابتدائی نقوش قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں ویدوں اور پرانوں کی تشریحات، توضیحات ومفاہیم سے متعلق کتب قلم بند کرنے سے کتب لغت اور فرہنگوں کا آغاز ہوا۔ عرب میں قرآنِ مجید و احادیثِ رسول کے تراجم وتشریحات اور بہ اعتبارِ موضوعات آیات، الفاظ، سورۃ جات وغیرہ کی درجہ بندی کرنے نیز ان کی توضیحات وتشریحات کے سبب لغت نگاری، فرہنگ نویسی اور حوالہ جاتی کتب کو فروغ حاصل ہوا۔

ابتدا میں الفاظ اور ان کے معانی ومطالب کو بغیر کسی ترتیب وطریقہ یا اصول وضع کیے بغیر لکھ دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ انھیں بہ اعتبارِ حروفِ تہجی تحریر کیا جانے لگا۔ اسی انداز ترتیب کو باقاعدہ طور پر فرہنگ نویسی ولغت نگاری کا آغاز کہا جاسکتا ہے۔ رفتہ رفتہ کم فہم اور بالخصوص طلبا کی سہولت کے مدِ نظر کسی کتاب کے آخر میں دقیق، مشکل اور نامانوس الفاظ، محاورات، تراکیب واصطلاحات کے معانی، مطالب یا مفاہیم کا اندراج کیا جانے لگا۔ اس طرح کی فرہنگوں کا اہتمام علمی، ادبی کتب اور خاص طور پر کلاسیکی متون میں کیا جانے لگا تھا۔

کلاسیکی متون کی فرہنگ کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالنے سے قبل لغت اور فرہنگ کے فرق وامتیاز کو بھی مختصر طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ کسی اصول یا قاعدے کے مطابق کسی زبان کے تمام الفاظ کے معانی و مفاہیم کا احاطہ کرنے والی کتاب کو لغت، ڈکشنری یا شبدکوش کہا جاتا ہے۔ دراصل کتابِ لغت کسی زبان کے تمام الفاظ کا احاطہ کرتی ہے اور فرہنگ ایک ایسی کتاب ہوتی ہے جو کسی خاص موضوع یا کسی شاعر و ادیب کی نگارشات میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ لغت میں ان الفاظ کا بھی اندراج کیا جاتا ہے جو متروک ہوچکے ہیں یا شاذ ونادر ہی استعمال ہوتے ہیں اور ان الفاظ کا بھی اندراج کیا جاتا ہے جو لغت نویس کے عہد سے پہلے مروج تھے اور اس کے عہد میں رائج ہیں لیکن فرہنگ میں ایسے الفاظ کا اندراج نہیں کیا جاتا۔ اس میں صرف وہی الفاظ تحریر کیے جاتے ہیں جس کے لیے فرہنگ مرتب کی جارہی ہے۔ فرہنگ میں کسی لفظ کے وہی معنی لکھے جاتے ہیں جس معنی کے لیے اسے کسی خاص موقع یا محل کے لیے استعمال کیا گیا ہے خواہ وہ لفظ متروک قرار دے دیا گیا ہو یا وہ رائج الوقت ہو۔ بطورِ مثال اگر لغت میں لفظ 'غریب' کا اندراج اور اس کے معانی لکھنا ہیں تو اس کے وہ تمام معانی تحریر کرنا ہوں گے جس کے لیے اسے اب تک استعمال کیا جا چکا ہے۔ عام طور پر 'غریب' کا استعمال مفلس، نادار اور بے زر کے معنی میں کیا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ 'غریب' کا استعمال مسافر، پردیسی، عجیب، انوکھا، نادر، مسکین، عاجز، سیدھا سادہ، بے چارہ، لاچار، نیک، معصوم اور بھولا بھالا کے معانی میں بھی کیا جاتا ہے، اس لیے لغت میں مندرجہ بالا تمام معانی کا اندراج کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر کسی ادیب یا شاعر نے لفظ 'غریب' کا استعمال صرف پردیسی کے معنی میں کیا ہے تو اس کے معنی صرف 'پردیسی' لکھنا ہی کافی ہیں۔ اگر کسی شاعر یا ادیب نے لفظ 'غریب' کا استعمال پردیسی کے معنی میں بھی کیا ہے اور نیک یا بھولا بھالا کے معنی میں بھی کیا ہے تو فرہنگ میں حوالہ یا مثال کے ساتھ ہر معنی کا الگ الگ اندراج کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیش کردہ معانی کے علاوہ کسی متن میں لفظ 'غریب' کو کسی اور

معنی کے لیے استعمال کیا گیا ہوتو فرہنگ میں اس کا وہی مفہوم درج کیا جائے گا جس مفہوم کے لیے اسے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر فرہنگ میں کسی لفظ کے ایک معنی لکھنے سے مفہوم واضح نہ ہو رہا ہوتو ایسی صورت میں اس کے مترادفات بھی تحریر کیے جاتے ہیں یا اس کی اس طرح وضاحت کی جاتی ہے کہ مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

کوئی بھی ادیب، شاعر یا فنکار ہو، وہ کوئی ماورائی مخلوق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسی سماج اور معاشرے کا ایک حصہ اور ایک فرد ہوتا ہے جس کے درمیان رہ کر وہ اپنی نگارشات تخلیق کرتا ہے۔ دراصل وہ عام آدمی سے زیادہ حساس اور بیدار مغز ہونے کے سبب اپنے اِرد گرد کے ماحول و حالات کا نہ صرف بہ نظر غایر مشاہدہ کرتا ہے بلکہ دیگر افراد کے مقابلے زیادہ متاثر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب یا شاعر کی نگارشات نہ صرف اس کے مزاج وافکار کی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ اس زبان کے بولنے اور اس سماج کے افراد کے افکار و خیالات کی بھی ترجمان ہوتی ہیں جس زبان یا جس معاشرے میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ کلاسیکی متون میں سے بے شمار داستانیں، قصائد، مراثی، غزلیات وغیرہ بہ اعتبار زبان مختلف قسم کی تراکیب، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اصطلاحات اور مقامی بولیوں سے بھری پڑی ہیں۔ ان کے مطالعے سے صدیوں کی تہذیب و معاشرت کا پتہ چلتا ہے اور ان میں سے بیشتر اپنے علاقے کی تہذیب و معاشرت کا بہترین اور جیتا جاگتا مرقع بھی ہیں۔ قدیم مراثی، قصائد اور بالخصوص داستانوں میں ولادت، وفات، شادی بیاہ کے رسوم، رہن سہن، عقائد، توہمات اور دیگر مروجہ علوم وفنون اور ان کی اصطلاحات کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے۔ یہی نہیں ان متون میں غم واندوہ کے ساتھ عیش ونشاط، خوش حالی اور اسبابِ تعیش کی بھی فراوانی ہے۔ مختلف تقاریب اور رقص و سرود کی محافل کے ساتھ زندگی سے بھرپور ہنسی مذاق، قہقہوں، چہل بازیوں اور سرمستیوں کی بھی جلوہ گری ہے۔

اردو زبان وادب کی ان بنیادی اور نمائندہ اصطلاحوں اور محاوروں کو ہم بھولتے جا رہے ہیں جن پر ہماری تہذیب کا انحصار ہے۔ شادی بیاہ کے پرانے رسوم ورواج متروک ہو گئے ہیں۔ بازاروں میں سَودا بیچنے والوں کی بولیاں گم ہو گئی ہیں۔ عورتوں کے قدیم زیورات، گہنوں اور ان کے ملبوسات کے نام مفقود ہو گئے ہیں۔ قدیم کھیل تماشوں اور عیش وعشرت کی محفلوں سے اب کسی کا لگاؤ نہیں رہا۔ چوسر، گنجفہ، پچیسی وغیرہ کا شوق بھی کتنا رہ گیا ہے؟ طوائفوں کی تہذیب خاک میں مِل گئی ہے اور ان کے کوٹھے نہ جانے کب کے ویران ہو چکے ہیں۔ گسبیاں اور ڈومنیاں خدا جانے کہاں روپوش ہو گئی ہیں۔ بھانڈ، بھگتیے، ہیجڑے، شہدے اور مرچڑے اپنی قسمت کو رو بیٹھے ہیں۔ پتنگ بازی، بٹیر بازی مرغ بازی، کبوتر بازی اور نہ جانے کتنی بازیاں کب کی مات کھا چکی ہیں۔ فقیر، ٹھگ، دَلال، کنجڑے، بھٹیارے، حلوائی، نان بائی اور میلے ٹھیلے والے اپنی پرانی بولیوں اور اصطلاحوں کو بھول چکے ہیں۔ نہ جانے ایسے کتنے الفاظ ہیں جن کا چلن ختم سا ہو گیا ہے اور نہ جانے کتنی اصطلاحیں متروک ہو چکی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ان مخصوص بولیوں اور اصطلاحوں کو قدیم یا کلاسیکی متون کے ذریعے یکجا کر کے محفوظ کرنا ہماری اہم ذمے داری ہے۔ اردو میں ایسے بے شمار نثری وشعری کلاسیکی متون اب بھی محفوظ ہیں جن کی فرہنگیں مرتب ہونے سے مخصوص الفاظ، محاورات، روزمرہ، ضرب الامثال اور مخصوص بولیوں کا ایک خزینہ محفوظ ہو جائے گا اور یہ فرہنگیں اردو زبان و ادب کے لیے کئی طرح سے اہمیت کی حامِل ہوں گی۔

عام طور پر قدیم نثری ومنظوم داستانوں میں اگر کسی چیز کا ذکر کیا جاتا تھا تو اس کے متعلقات ولوازمات یا اسی نوعیت کی دیگر چیزوں کے بیان کو بھی فنکاری تصور کیا جاتا تھا جس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جیسے نظیر اکبرآبادی نے تیراکی یا پیرنے کی قسموں کے نام: اچھالن، بند، بھنور، پچھاڑ، تختہ، چادر، چکر، چکوا، چھینٹ، سمیٹ، کترا، کسی، کھری، گھمیر، مالا، مینڈا، ناند اور کبوتروں کی قسموں کے نام: اگرئی، اودا، ببرا، بصرئی، بھورا، پان، پرکھڑا، پلکا، تانبڑا، تنبولیا، تیرا، تھیٹر، پٹیت، ٹھمک چال، جوگیا، چپ، چویا چندن، خال، زرچے دہ، زردہ، سبز مکھی، سبک چال، سرمئی، سیمابیا، سیم بری، شست رو، شیرازی، طاؤسی، عنبری، قوسی، کابرہ، کابلی، کاسنی، کلپوٹیا، کھیرہ، گرہ باز، گل آنکھ، گلی، گولا، گھاگھرا، لال، لقا، لال آنکھ، لوٹن، مسی، مکسی، مکھی، مکھیرا، نساور، نفتہ، نیلا، ہنسڑا اور پتنگوں یا کنکوے کے نام: اَبلقا، اِلائچہ، باز، بمنا، بہری، بہی، پہاڑیا، پینڈی پان، تکل، تِکلا، جرہ، جھجاؤ، چاندتارا، چپ، چنگ، چوکنا، چوگھڑا، چھپکا، چھنڈی، خربوزیا، دوباز، دوپنا، دودھاریا، دوکونیا، دھیڑ، شِکرا، شیرازی، کج کلاہ، ککڑی، کل سِرا، کوا، گڈا، گلہریا، گوشا، گھایل، لل پرا، لنگوٹ بند، لنگوٹیا، موجِ دریا نظم کیے ہیں۔

اسی طرح باغ وبہار، فسانۂ عجائب، مثنوی سحرالبیان، گلزارِ نسیم وغیرہ میں ایک ہی نوعیت یا مختلف نوعیت کی چیزوں کو ایک ساتھ جمع کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ نسیم نے ایک ہی شعر میں پوربی، جوگیا، جنگلہ اور دیس کو نظم کیا ہے جو مختلف راگوں کے نام ہیں۔

وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس
جنگلے کی راہ سے گیا دیس

ہم میں سے ایسے کتنے لوگ ہیں جو نظیر کے ذریعے نظم کی گئی تیراکی، پتنگ، کبوتر اور نسیم کے ذریعے نظم کی گئیں راگ کی قسموں سے واقف ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار میں باعث بہ معنی فرمائش، روبکار بہ معنی ظاہر، حرامی بہ معنی لٹیرا کے تحریر کیا ہے۔ اس لیے اس طرح کے تمام الفاظ کا اندراج متعلقہ فرہنگوں میں وضاحت کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح آبِ رواں، آصف خانی، اتو، انڈوا، بارانی، بافتہ، بردیمانی، پرنیاں، پڑاقا، چیکن، دریائی، دگلہ، دیبا، دھتیا، کیچل لیٹ، کھاروا، گل بدن، گلشن لیٹ، لنکلاٹ، منڈاسا، نین سکھ، ہروتی جیسے کپڑوں کی قسمیں، الاق، بجرا، پٹلی، پلوار، پن سوئی، چوڈول، سکھ پال، مورپنکھی، میانا، نواڑا جیسی سواریوں کی قسموں کا چلن مفقود سا ہو گیا ہے۔ اس لیے لوگ ان کی ہیئت ہی سے نہیں بلکہ ناموں سے بھی ناواقف ہو گئے ہیں۔

ایسے متون کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں علاقائی بول چال کی زبان یا لفظیات کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً لفظ 'پیالہ' جو عام طور پر کٹورا یا کاسہ کے لیے مستعمل ہے۔ آگرہ اور اس کے گرد ونواح میں سوئم، مردے کا تیجا، تیسرے دن کی فاتحہ کے معنی کے لیے مخصوص ہے۔ پیالہ بندوق میں رنجک رکھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں اور فقیروں کی اس دعوت کے معانی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جو فقیروں کے یہاں ہوتی ہے۔

کچھ یہی صورتِ حال محاوروں، کہاوتوں، ضرب الامثال، ریختی یعنی عورتوں کی مخصوص زبان اور دیگر اصطلاحات واشیا کی بھی ہے جن میں سے بیشتر کا اندراج کتبِ لغات میں بھی نظر نہیں آتا۔ دکنی ادب کے تعلق سے کئی کتابِ لغات منظرِ عام پر آچکی ہیں مگر ان میں بیشتر لغات میں مختلف رسم ورواج، تقریبات وغیرہ سے متعلق اصطلاحات اور اپنے عہد میں رائج متعدد اشیا کا اندراج نہیں ملتا جب کہ متعدد نثری وشعری متون کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں اس لیے دکنی ادب کے قدیم متون کی فرہنگوں کا مرتب کیا جانا بھی ضروری ہے۔ ملا وجہی کی 'سب رس' مختلف درجات کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب میں شامل دکنی زبان میں مروج آٹا اٹ بمعنی سخت مشکل، ابھال بمعنی بادل یا بارش، اڑیا بمعنی مصیبت میں مبتلا، بھلتا بمعنی فریفتہ، تلگپ

تلگیک بمعنی پریشانی یا بے چینی، چاڑی بمعنی چغلی، چوسار بمعنی ہوشیار، نا ندنا بمعنی سلیقے سے زندگی بسر کرنا، کاکلوت بمعنی حرص یا لالچ، گڑگا بمعنی پاجاما جیسے مروج الفاظ اور ان کے معنی سے ناواقفیت کے سبب 'سب رس' ہمارے لیے بے رس سی ہو جاتی ہے۔ اس لیے سب رس جیسے دیگر متون کی فرہنگوں کا مرتب کیا جانا بھی ضروری ہے۔

ریختی یا عورتوں کی مخصوص زبان کے تعلق سے چند کتابچہ تو نظر آتے ہیں مگر اب تک کوئی ایسی مبسوط فرہنگ مرتب نہیں کی جاسکی ہے جس میں منظوم ریختی کی لفظیات کے علاوہ داستانوں اور دیگر قدیم متون سے اخذ کیے گئے عورتوں کے مخصوص محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات وغیرہ کی شمولیت ہو۔ اَن گنا مہینہ، دوگانا، چپٹی، چپٹی لڑانا، پیڑو میں ٹیس اٹھنا، پیڑو کی آنچ، چڑیا، نجبتی، اِلاچی، کھوج مٹی، کھوج مِٹا، زناخی، گڑھی فتح کرنا، مدارات کرنا وغیرہ کا شمار تو ریختی کی آسان اور عام فہم لفظیات واصطلاحات میں کیا جاتا ہے۔ قدیم متون کو کھنگالنے پر ریختی یا عورتوں کی زبان کے تعلق سے ایسے بے شمار الفاظ دستیاب ہو سکتے ہیں جن کا چلن ختم سا ہو گیا ہے۔

مختلف قسم کے نسلی تجربات ومشاہدات، قصص وحکایات، عقائد ونظریات، حقائق وتوہمات، نفسیاتی ردِعمل وفلسفیانہ خیالات، قوانین وضوابط، پند ونصائح، اقوال وملفوظات، تاریخی ونیم تاریخی واقعات وحادثات، لوک کہانیاں، شعری ٹکڑوں یا دوہوں وغیرہ کے ایسے قبولِ عام کلیدی جملوں، فقروں یا کلمات وغیرہ کو جن میں اختصار اور معنوی زور بھی ہو کہاوت یا ضرب المثل کہتے ہیں۔ ایسی بہت سی کہاوتوں سے قدیم متون بھرے پڑے ہیں جن کے وجود میں آنے کا سبب کوئی کہانی، حکایت، تلمیحی یا تاریخی یا من گڑھت واقعات کی کارفرمائی ہے۔ اگر کسی کلاسیکی یا قدیم متون کی فرہنگ مرتب کی جائے تو متعلقہ کہاوت کو اس مفہوم کے ساتھ پس منظر کو درج کیا جانا بھی ضروری ہے تاکہ لوگ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچ سکیں۔ مثلاً آنکھوں کے آگے ناک سوجھے کیا خاک، آئے ڈلو کے دسیرے، آیا بندہ آئی روزی گیا بندہ گئی روزی، اپنا الو تو کہیں نہیں گیا، اپنی ٹیک بھَنجائی، بالم کی مونچھ منڈائی، الٹا چور بیکنٹھ کو جائے، بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، تیتر کے منہ پچھی، چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے، چور کا مال چنڈال کھائے، دال میں کچھ کالا ہے، شک کی ڈائن، بھَے کا بھوت، عید کے پیچھے ٹر، کرم کی ڈھولکی باجی، کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی، مَری بچھیا بامہَن کے سَر، ملا کی دوڑ مسجد تک اور وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے جیسی بے شمار کہاوتیں حکایتی وتلمیحی پس منظر سے مملو ہیں۔ پیش کردہ کہاوتوں کے پس منظر سے کتنے لوگ واقف ہوں گے؟

''آج نہیں کل'' بھی ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم اور پس منظر مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

ٹال مٹول کرنے والے کے لیے کہتے ہیں یا پھر ٹال مٹول کرنے والا کہتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

ایک شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گھنٹوں مصروف رہتا تھا۔ عبادت کرنے کے بعد جب وہ عاما نگتا تھا تو گڑگڑا گڑگڑا کر کہتا تھا۔ ''اے اللہ مَیں تجھ سے بہت محبت کرتا ہوں، اے خدا تو مجھے اپنی محبت میں اٹھا لے''۔ ایک مسخرہ اس کے یہ جملے اکثر سنا کرتا تھا۔ ایک روز جب وہ عبادت گزار گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا کہ ایک مسخرے نے دیوار کے سہارے سے ایک رسی اس کے سامنے لٹکا دی اور آواز بدل کر بولا: آ! مَیں تجھے اپنی محبت میں اٹھانا چاہتا ہوں'' عبادت گزار گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ اے اللہ! آج نہیں کل۔ ''مسخرے نے یہی حرکت دوسرے روز بھی کی۔ عبادت گزار نے دوسرے روز بھی کہا۔ اے اللہ! آج نہیں، کل''۔

عبادت گزار کا یہی جملہ رفتہ رفتہ کہاوت کی شکل اختیار کر گیا۔

قدیم متون میں ایسے بے شمار الفاظ نظر آتے ہیں جو اپنے ظاہری معانی کے علاوہ اشاراتی یا استعاراتی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں جنھیں متعلقہ جملوں کی جزئیات اور سیاق وسباق کے بغیر سمجھنا محال ہے مثلاً 'انتقال' کے معنی مقام تبدیل کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور اصطلاحی معنی مَوت یا وفات کے ہیں۔ اسی طرح لفظ ''حمل'' کے لغوی معنی وزن، بوجھ یا بار کے ہیں اور اصطلاحی معنی پیٹ، یعنی گربھ (गर्भ) یا اس بچہ کے ہیں جو عورت کے پیٹ میں ہو۔ استعمال کی نوعیت کے اعتبار سے بعض الفاظ کے معانی، مفاہیم یکسر تبدیل، متضاد یا برعکس ہو جاتے ہیں۔ معنی کی یہ تبدیلی اس قدر واقع ہوتی ہے کہ چلن میں آجاتی ہے۔ عام آدمی کے ذہن سے تو ان کے اصلی یا لغوی معنی قطعی مفقود ہو جاتے ہیں اور بہت سے خواص یا زبان داں حضرات بھی انھیں بھلا بیٹھتے ہیں۔ دادا کا استعمال خلیفہ، شہید، صلوٰۃ، حرام، مہتر وغیرہ کا شمار ایسے ہی الفاظ میں کیا جاسکتا ہے۔ دادا، خلیفہ، قائم مقام، جانشین اور نائب کے لیے مستعمل ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی بدمعاش، چالاک اور ہوشیار کے بھی ہیں۔ نائی، درزی، باورچی وغیرہ کو خوش کرنے کے لیے خلیفہ کہا جاتا ہے۔ شہید کے لغوی معنی گواہ کے ہیں۔ اردو میں شہید اس شخص کو کہتے ہیں جس نے حق کے لیے یا خدا کی راہ میں جان دی ہو۔ اب اس لفظ کا اطلاق ہر اس شخص کے لیے ہونے لگا ہے جو وطن کے لیے مَرا ہو یا جس کی جان اپنے فرض کو ادا کرنے میں گئی ہو۔ صلوٰۃ کے معانی نماز، دعا، برکت، رحمت اور مہربانی کے ہیں لیکن اب یہ لفظ دشنام، گالی، کلامِ ناملائم کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے اور محاورات کی شکل میں بھی رائج ہے۔ جیسے برا بھلا کہنا اور گالی دینا کے مفہوم کے لیے صلوٰتیں سنانا۔ لفظ 'حرام' جہاں 'حلال' کے نقیض اور ناروا، ناجائز، ناشائستہ، ناپاک، نجس، پلید اور خلافِ شرع، بدکاری، ممنوع، افعالِ شنیعہ کے معانی کے لیے مستعمل ہے وہیں دوسری طرف بزرگ، محترم، قابلِ تعظیم، حرمت والا کے معانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے مسجد الحرام، محرم الحرام وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس لفظ کے معانی کا اطلاق استعمال کرنے کے طریقے اور سیاق وسباق پر منحصر ہوگا۔

کلاسیکی یا قدیم متون میں درج الفاظ کے صحیح معانی ومفاہیم تک رسائی کے لیے فرہنگوں کی ضرورت واہمیت ناگزیر ہے۔ کسی لفظ، جملے فقرے، مصرع یا شعر کے دو یا دو سے زائد معانی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ظاہری اور اشاراتی یا استعاراتی۔ ظاہری معنی تو ایک ہی ہوتا ہے مگر اشاراتی یا استعاراتی معنی ایک سے زائد یا متعدد ہو سکتے ہیں۔ ظاہری معنی چونکہ واضح اور صاف ہوتے ہیں، اس لیے انھیں عام انسان بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے لیکن اشاراتی یا استعاراتی معانی کو سمجھنا ہر شخص کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ انھیں صرف زبان داں اور ماہرِ لسانیات ہی سمجھ سکتا ہے۔ ظاہری معنی کو تو پوری بات یا مکمل جملے کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے مگر اشاراتی معنی جملوں کی جزئیات کی مدد ہی سے ذہن میں آسکتے ہیں۔ کتبِ لغت کا پہلا کام لفظ، روزمرہ یا اقوال وامثال کے معنی ومفہوم کا تحفظ کرنا ہے۔ فرہنگ کسی لفظ، جملہ، فقرے، محاورے یا اقوال وامثال کے ان معنی ومفہوم کو واضح کرتی ہے۔ جو ان کے اشارات، علائم، جزئیات یا سیاق وسباق سے ظاہر ہو کر الفاظ کے خزانے میں بھی اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

■

Dr. Shareef Ahmad Quraishi
Jain Mandir Street
Phoota Mahal
Rampur- 244901 (UP)
Mob.: 7078702997
E-mail.: shareeframpur@gmail.com

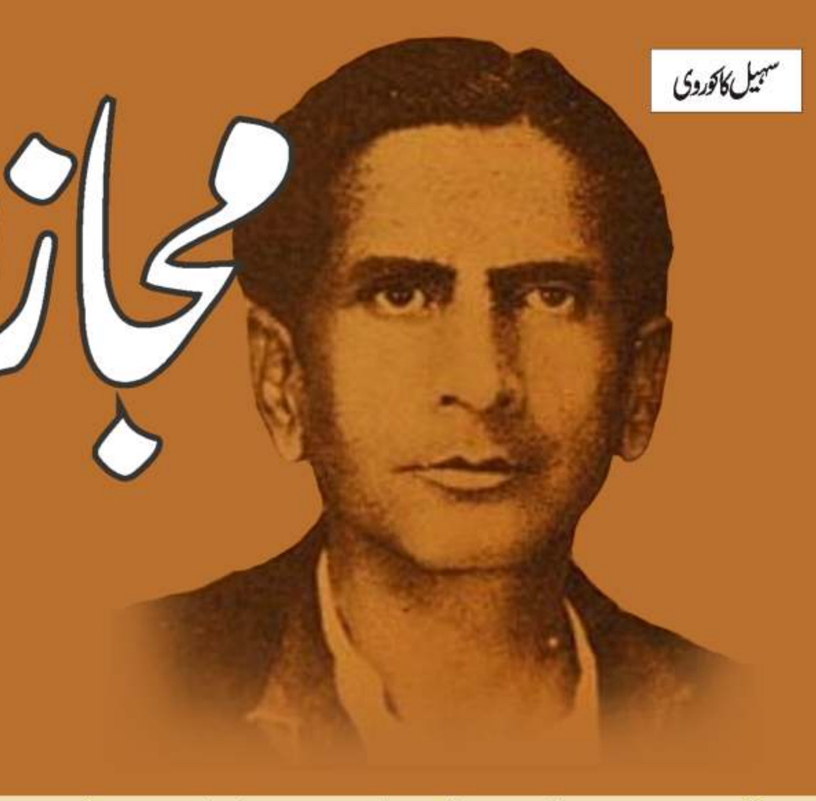

مجاز اور عالم حسن و جمال

سہیل کاکوروی

عشق اگر دنیا تھی تو مجاز ماورائے جسم اور ماورائے دنیا کی جستجو کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے بہر حال عقل کی رہبری درکار تھی جس کے مرہون منت وہ ہونا نہیں چاہتے تھے اس حد تک کہ اس کی راہیں مسدود کر دینے کے لیے انھوں نے عقل کی باتوں کو دفتر بے معنی سمجھ کر غرق مئے ناب کر دیا اس سے شاعری تو اثر انگیز ہو گئی لیکن زندگی پر بربادی کے عذاب آنا شروع ہوئے اور جن دلوں میں مجاز کے لیے امیدوں کے چراغ روشن تھے بھڑکنے لگے اور ایک روح فرسا انجام شاعری کی دیوی نے نم آنکھوں سے دیکھا لیکن عمر کے لحاظ سے دنیا میں بہت کم دن گزارنے کے باوجود مجاز نے اپنے تخیل سے ایسے گل کھلا دیے کہ جن کی خوشبو آج بھی بزم سخن میں بسی ہے اور یہی خوشبو اس بزم کا حاصل بھی ہے۔

مجاز لکھنوی یا مجاز ردولوی ڈرامائی انداز میں افق شاعری پر ابھرنے والا شاعر اور پھر اسی انداز میں ڈوبنے والا بھی جس کی ساری زندگی عشق کے لیے وقف اور جس کو سوچ کر یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے۔

مستی و نا آشنائی وحشت و بیگانگی
یا تیری آنکھوں میں دیکھی یا تیرے دیوانے میں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فضا میں پروان چڑھنے والے مجاز کی اٹھان کچھ اور ہی تھی ہوا کچھ اور۔ مجاز نے جب اپنا وہ نغمہ چھیڑا کہ جس کے لیے خود کہا۔

میرا نغمہ باعث دلداریِ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہ نشاط جاں تو ہے

ابتدا سے ہی دلداریِ خوباں کے جو اشارے ملنا شروع ہوئے ان سے جو تاثر مرتب ہوا اس نے قلب کو گرمانے سے زیادہ روح کو تڑپا دیا۔

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

عشق اگر دنیا تھی تو مجاز ماورائے جسم اور ماورائے دنیا کی جستجو کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے بہر حال عقل کی رہبری درکار تھی جس کے مرہون منت وہ ہونا نہیں چاہتے تھے اس حد تک کہ اس کی راہیں مسدود کر دینے کے لیے انھوں نے عقل کی باتوں کو دفتر بے معنی سمجھ کر غرق مئے ناب کر دیا اس سے شاعری تو اثر انگیز ہو گئی لیکن زندگی پر بربادی کے عذاب آنا شروع ہوئے اور جن دلوں میں مجاز کے لیے امیدوں کے چراغ روشن تھے بھڑکنے لگے اور ایک روح فرسا انجام شاعری کی دیوی نے نم آنکھوں سے دیکھا لیکن عمر کے لحاظ سے دنیا میں بہت کم دن گزارنے کے باوجود مجاز نے اپنے تخیل سے ایسے گل کھلا دیے کہ جن کی خوشبو آج بھی بزم سخن میں بسی ہے اور یہی خوشبو اس بزم کا حاصل بھی ہے۔ اپنی مادر درسگاہ کے لیے جو ترانہ مجاز نے لکھ دیا اگر وہ صرف وہی لکھ دیتے تو ان کے بعد الموت زندہ رہنے کے لیے کافی تھا لیکن چونکہ وہ سرشار نگاہ نرگس اور پابستۂ گیسوئے سنبل تھے اس لیے وہ جگر لخت لخت سے دعوت مژگاں کرنے کی نادانی کر بیٹھے اور مژگاں کے نشتر ان کے وجود کو لہولہان کر گئے مجاز کو حسن پرستی سے بجز درد و غم کچھ نہ ملا حسن کی طرف سے اشراقی اشارے ضرور ملے لیکن کچھ بھی ان کی زندگی کو روشنی دائمی نہ دے سکا اگر عقل کو تھوڑا ابروئے کار لائے ہوتے تو شجر ممنوعہ پر اگر دل آیا بھی تھا تو جگر کی اس بات کے معنی پر غور کر لیتے تو سارا قصہ ہی بدل جاتا وہ یہ کہ۔

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

لیکن اس کے لیے ذہن میں جس اعتدال کی ضرورت ہوتی ہے وہی مجاز میں نہیں تھا یہی ان کی زندگی کا المیہ اور اسی کا ثبوت جوش کی نصیحت کہ گھڑی رکھ کر مے نوشی کرنے کی صلاح اور مجاز کا گھڑا رکھ کر پینے کا عزم اور جس سے اردو شاعری کا نقصان عظیم ہو گیا کاش وہ نشتر زہر آگیں نزدیک رگِ جاں رکھ کر بھولے نہ ہوتے بلکہ اس کا درماں تلاش کر لیتے اور شاید خیال آرائی سے ان کا سخن خیال بندی کی دولت حاصل کر لیتا اور جو ایک بین الاقوامی مجاز سمینار میں مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے کہہ دیا تھا کہ مجاز بین الاقوامی سمینار کا موضوع نہیں ہیں جس پر علی سردار جعفری نے مدلل جواب ضرور دیا۔ فاروقی صاحب کی بات تنقیدی شعور کی راہ سے سامنے آئی لیکن وجدان مجاز کی حمایت کر رہا تھا اور سردار جعفری نے

شاعری پر فاروقی صاحب کے بیان سے ہی ان کے اس بیان کی تردید کردی۔ وجدان کے جھوم اٹھنے کے سارے سامان مجاز کی شاعری میں ملتے ہیں اور نذر علی گڑھ میں بھی وہ وصف ہے جو سیدھے دل پر اثر کرتا ہے اور دماغ پر بھی اس کی ساری لفظیات استعارے تشبیہات سب جمالیات کے سانچے میں ڈھلے ہیں اسلوب صہبائے کہن ہے لیکن ساغر نو میں ڈھلا ہے شاید مجاز نے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ان کے دل سے نکلی صدا دائمی بازگشت بن جائے گی جسے حسن کے کومل سُر اور پرستاران حسن کے باوقار لہجے ملتے رہیں گے ہر لطف کے موقع پر اس کا احیا ہوگا جو اس درس گاہ کی عظمت کے نقش مرتب کرتا رہے گا۔ مجاز کے تخیل کا یہ ابر ہمیشہ برسا ہے اور برستا رہے گا۔ آوارہ، کس سے محبت ہے، مادام نورا کی اثر انگیزی اپنی جگہ مجاز کی غزلوں کا نظامِ جمالیات اپنی خوبیوں کے ساتھ تاریخ اردو شاعری میں محفوظ رہے گا جس کی سربراہی نذر علی گڑھ سے ہوتی رہے گی۔ ہمیں اب جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا نہیں سوچنا ہے بلکہ صرف مجاز کی یاد تازہ کرنا ہے اس شعر کے ساتھ ؎

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

نام یا تخلص کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے ایسا کہا جاتا ہے جبھی غالب علی کل غالب ہے اور اقبال کا اقبال بلند سے بلند تر ہو رہا ہے لیکن مجاز مجاز ہی کے نقرئی جال میں گرفتار رہے حقیقت کے پردے نہ اٹھے جبھی کہتے رہے بصد کرب ؎

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز کی شاعری کو جس دور میں مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی بھی ادب اور شاعری کی زرخیزی کا دور تھا عظیم شاعروں اور ادیبوں کا ایک مجمعِ حسین چاروں طرف تھا اور مجاز اس دور میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ اہل نظر کے درمیان اپنے مخصوص انداز کے باعث قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے خود اپنے کو سنبھال کر نہیں رکھا۔ یہ المیہ بڑے پیمانے پر اردو کے شعری ادب کا ہے لیکن حسن کے تصور میں ان کی نظر ہمیشہ گم رہی اور کچھ حسین پرچھائیاں یادوں کے نہاں خانے میں ابھرتی رہیں۔ 'کس سے محبت ہے' ان کی اثر انگیز نظم ہے۔ مجاز نے 'کس سے محبت ہے' میں جو کچھ کہا دراصل حقیقی طور پر وقوع پذیر نہیں ہوا۔ یہ دراصل ناتمام آرزوئیں ہیں جن کی تکمیل کی کوئی راہ نہیں ہے اور وہ جو بہت مشہور ہے کہ لڑکیاں ان کے نام پر قرعہ اندازی کرتی تھیں وہ ان کے کھیل تھے اور اسی اطلاع کی بنا پر مجاز کے شاعرانہ ذہن نے ثریا بخت زہرہ جبیں اور ماہ طلعت کے پیکر تراش لیے اگر کوئی ایسا کہیں ہوتا کہ جو چہرے پر فکر کے آثار پا کر واقعی تسکین دیتا اندیشے مٹاتا شانے پہ سر رکھ کر گیت گاتا تو مجاز اس بے پناہ مایوسی کا شکار نہ ہوتے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کو مے نوشی کا سہارا لینا پڑا۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کی جرأتوں پر بے نیازی کی سزا ملی ہے اور حسن کی بہار سپردگی ان کے مقدر میں آئی ہی نہیں لیکن ان کی قوت متخیلہ اور بیان کی تاثیر ایک منفرد اسلوب جذبوں کے اظہار میں سادگی یقین کرانے کے لیے کافی ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہیں ہیں حقیقت میں وہی ہوا ہے اور سب کچھ ہے تو Sensual لیکن وہ Sensuous ہو کر قلب انسانی کو تڑپانے لگا وہ لفظوں سے ایک ایسا ماحول بنانے میں کامیاب ہوئے کہ جس میں حسن کے گلزار چاروں طرف دکھائی دینے لگے رنگ و رعنائی کا ایک سلسلہ دور تک پھیل گیا مگر یہ سب اس شعر کے مطابق تھا کہ ؎

ہائے وہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

مجاز کی شاعری ان کے رنگین تخیل کی کارفرمائی ہے اور شاعری میں یہ ضروری بھی نہیں کہ جو بتایا جا رہا ہے وہ واقع ہوا ہو۔ 'اعتراف' ان کی نمائندہ نظموں میں ایک ہے، یہ مجاز کے بکھرے ہوئے وجود کی صدا ہے یہاں ان کے احساس نے ایک پیکر رعنائی کا روپ دھار لیا ہے جس سے وہ ہم کلام ہیں اس کے حسن کی ساری عظمتیں انھیں قبول اس کے بنت مہتاب ہونے کا یقین گردوں سے اتر آنے پر بھی کوئی شک نہیں مخاطبِ غائب کے ہیولے کے سامنے اپنے وجود کے ٹوٹنے کا خود کو ذمے دار ٹھہرانے کے اس انداز میں لائقِ صد ستائش ہے اس نظم میں مجاز کی زندگی کے المیے کا پورا منظر نامہ ہے ؎

اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
بنت مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

اس تمہید سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہاں بھی کوئی نہیں ہے صرف خیال آرائی ہے اور یہ اعتراف مقصود ہے کہ ؎

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے
خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمان محبت نے سپر ڈالی ہے

مجاز نے نہایت سچائی سے اپنی برباد زندگی کا ذمے دار خود کو ٹھہرایا لیکن اس میں کہیں وہ شکوہ نہیں ہے جو محبوب کی بے وفائی کی طرف کوئی اشارہ کرے جبکہ شاعر جب ناکام ہوتا ہے محبوب کو بے وفا ضرور بتا دیتا ہے لیکن اس نظم میں جو آواز شکستہ ساز ہے اس میں کہیں حسن پر الزام تراشی نہیں ہے کہیں احباب کی بے اعتنائی کا ذکر نہیں ہے کہیں دنیا سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہہ دیا ؎

میرے سائے سے ڈرو تم میری قربت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں

حسن کو تو وہ صاف بچا لے گئے اس کے لیے ان کی ایک غزل کا مقطع برمحل ہے ؎

ہوتی ہے اس میں حسن کی توہین اے مجاز
اتنا نہ اہلِ عشق کو رسوا کرے کوئی

اعتراف ایک منفرد فکر کی نظم ہے جس میں مجاز کی شرافت نفس کی بازگشت ہے اور خود کو ہر ناکامی کا سبب بتانے کی جرأت کا واضح اشارہ ہے اور یہ خود احتسابی اور اس کا بیان مجاز کی عظمت کی دلیل ہے اور شاعری کی روایت کے برخلاف اس میں کہیں محبوب کی بے وفائی کا نہ شکوہ ہے نہ ذکر ہے اور اگر ہوتا تو یہ مضمون کمزور پڑ جاتا۔

مجاز کا لفظیاتی نظام جوش کے لفظیاتی طمطراق کے بیچ اس لیے شناخت بن گیا کہ نظم کہتے وقت ایسے الفاظ تلاش کیے جن کی نرم روی کا تقاضا ان کے موضوعات تھے۔ اگر جوش کا اسلوب دیکھا جائے تو ان کی خالص رومانی نظمیں جیسے 'فتنۂ خانقاہ'، 'جنگل کی شہزادی'، 'یار پری چہرہ' وغیرہ اسی لفظیاتی طمطراق کے ساتھ موجود ہیں جو جوش کا طرۂ امتیاز تھا اور مجاز اس کی تقلید کر سکتے تھے لیکن انھوں نے الگ ہی طرز ادا کے ساتھ اپنے سامع یا قاری کو اپنا مداح کر لیا اور گمان و تصور کو اس طرح حقیقت بنا دیا کہ ان کا کہا سب کچھ سچ سمجھ کر بغیر تامل تسلیم کر لیا گیا وہ بھی جبکہ اتنی کم عمر پائی اور اردو شاعری کے صفحۂ قرطاس پر انمٹ نقوش چھوڑ دیے۔ آوارہ تو مجاز کے ہر ناقد کا موضوع رہی ہے اس میں ان کا آہنگ بلند ہے ان تخیل کی نگاہیں جو دیکھ رہے ہے جذبوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں ایسی خواہشات کا ہجوم ہے جن کا پورا ہونا ناممکن ہے لیکن شاعر کا شعور چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر بے داد چھین لینے کا ارادہ بتا رہا ہے کہ یہ ظلم و استبداد کے خلاف اس کا جذبہ ہے اور اس کے تاج پر دمکتے ہوئے پتھر کو توڑ دینے کا خیال سرمایہ داری پر چوٹ ہے جبکہ وہ حقیقت میں خانماں

برباد ہے نظم کا پہلا بند ہی بتا دیتا ہے کہ شاعر کا ذہن پراگندہ ہوتے ہوئے بھی اپنی تخلیقیت کا سکہ بٹھانے میں کامیاب ہے۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

غم دل اور وحشت دل کے ساتھ ناشاد و ناکارہ ہونے کا یہ احساس اور اس کا اظہار قابل توجہ ہے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مجاز دربدری کے عذاب میں گرفتار تھے اور آوارگی ان کا مقدر ہوئی تھی۔ اس نظم میں مجاز نے اندر کی یہ گھٹن لفظوں پر اچھی گرفت کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس نظم میں اثر انگیزی ہے اور اس کا شاعرانہ حسن تسلیم شدہ ہے اس میں غصے اور جھنجھلاہٹ کی اٹھتی گرتی لہریں ہیں تخیل کے دیدۂ حساس کو جو نظر آ رہا ہے نئے انداز میں کہہ دینے کی کامیابی نے اس نظم کو اردو شاعری کی اہم نظموں کی صف میں مقام حاصل کرا دیا۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

یعنی ''اکثر جوانی غم و اندوہ کے باعث زرد ہوتی ہے ہمارے تصور کے گڑھے ہوئے آسیب کا روپ دھارتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے لیکن پیلا ماہتاب کسی خوشگوار بسنت کی امید موہوم بھی ہو سکتا ہے یہاں تشبیہات بھی پر از معنویت ہیں۔ ملاّ کا عمامہ تقدس کا نشان بھی ہے اور بقول جوش یہ بھی ممکن ہے۔

عالمانِ دیں کے دستاروں میں آتے ہیں نظر
وہ بلا کے پیچ و خم جن سے ہوں اژدر شرمسار

بنیے کی کتاب کی بھی یہی صورت ہے اس میں سب کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی مفلس کی جوانی کی محرومیاں مجاز کے خود وجود میں پیوست ہیں۔ بیوہ کے شباب کا المیہ مفلس کی جوانی کی طرح آرزوؤں اور تقاضوں کی ناقابل بیان داستان کی کچھ مبہم جھلکیاں ہیں چاند تارے شاعر کو مردہ نظر آ رہے ہیں کیونکہ اس کی نظر سے وہ روشنی جا چکی ہے جو امید کی راہیں روشن کرتی ہے۔ دراصل چاند اور تاروں کی روشنی ہی ان کا ثبوت حیات ہے جو شاعر کے لیے اب دستیاب نہیں ہے غرض فکری اور جذباتی سطح پر یہ نظم مجاز کی بہت کامیاب نظم ہے اس شاعر کی صدا ہے جو شادمانی کی طرف جانے والی ہر راہ اپنے پر بند پا رہا ہے وہ روپہلی چھاؤں اور تاروں کے جال کا نظارہ دیکھ کر اسے

صوفی کا تصور اور عاشق کے خیال کی تشبیہ دیتا ہے صوفی کا تصور ہستی موہوم کی تلاش اور عاشق کا خیال منزل جاناں کی جستجو کا اشارہ ہے۔ ان سب کے بیچ شاعر کے جی کا حال جاننے کا کوئی بھی اصلی غمگساری کے لیے موجود نہیں ہے یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مجاز کو اہل عرفاں کی نوازش منظور نہیں تو پھر ان کے جی کا حال اگر صوفی کے اس تصور میں مداخلت کر بھی دے جو عرفان ذات حق میں غرق ہے تو مجاز منت احسان اٹھانے کے لیے تیار بھی نہیں ہیں۔

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہی کافی ہے
اہل عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

نظم میں مجاز نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ نذر علی گڑھ نے تو ان کو لافانی کر دیا اور زندگی میں ہزار سامان قنوطیت رہے لیکن فلک سے اس نظم کی صورت میں سامان بقا اتر آیا اس پر بھی مجاز کی روح کو طمانیت کا احساس ضرور

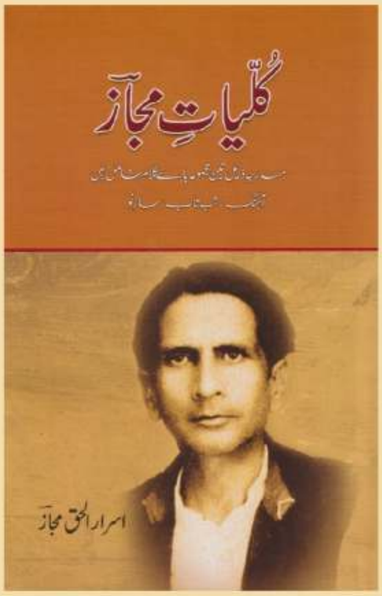

ہوگا کہ لبہائے نازک پر یہ ترانہ جاری ہے حسن اور ہمت مردانہ دونوں کے جذبے اس سے وابستہ ہو کر مجاز کی بارگاہ نادیدہ میں عقیدت اور احترام کے پھول پیش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ نورا اور ننھی پجارن نظم کے بنیادی عناصر تسلسل اور محاکاتی حسن کی مثالیں ہیں جن میں تقدس کی دل آویز فضا کے روح پرور نقوش ابھرے ہوئے ہیں اس صنف نازک کے کردار کے عکس ہیں جس کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیغام انھیں دینا تھا اور انھوں نے دیا۔ مجاز کی زندگی تلخ ترین تجربات سے دوچار رہی۔ رات اور ریل اندھیری رات کے مسافر زندگی کے سفر کے علامتی اظہار کی بہترین مثالیں ہیں نادر و نایاب تشبیہات اور استعارے اثر انگیزی کو دوبالا کرتے ہیں

بیان کی روانی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ذہن بکھرا ہوا ہے وجود کی رگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔

مجاز کی شاعری کا منظرنامہ یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کے اظہار کا میدان غزل ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں عشق ہی عشق ہے دنیا میری۔ مجاز کی یہ غزل اپنے پورے لوازمات کے ساتھ جلوہ نما ہے۔

خود دل میں رہ کے آنکھ سے پردہ کرے کوئی
ہاں لطف جب ہے پا کے بھی ڈھونڈھا کرے کوئی
تم نے تو حکم ترک تمنا سنا دیا
کس دل سے ہائے ترک تمنا کرے کوئی
رنگینیِ نقاب میں گم ہو گئی نظر
کیا بے حجابیوں کا تقاضا کرے کوئی
یا تو کسی کو جرأت دیدار ہی نہ ہو
یا پھر میری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی
مجھ کو یہ ضد کہ خود ہی اٹھائیں نقاب وہ
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

یہ جذبوں اور معنویت سے بھرپور غزل دراصل مجاز کی طبع زاد نہیں ہے یہ زمین تراشی ہوئی ہے شہنشاہ سخن مرزا غالب کی جس کا مطلع ہے۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تم سے طرز سخن وا کرے کوئی

یا یہ شعر۔

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بہ سر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

ظاہر ہے غالب کے اشعار حسب معمول ان کی بلند و بالا فکر اور ان کے فلسفے کے عکاس ہیں مجاز کی غزل ان کے دل کے سوز و ساز سے ہم آہنگ ہے دل میں رہنے والے کا آنکھ سے پردہ اور پا کے ڈھونڈھنے کا سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ حاصل کو لا حاصل سمجھنا حالت طلب کی وہ نفسیاتی کشمکش ہے جس سے پیدا تڑپ مایوسی سے دیوانگی تک لے جاتی ہے لیکن شاعری میں کبھی کبھی ایک لفظ سے مفہوم الگ اور دلچسپ ہو جاتا ہے اس مطلع میں لطف کا لفظ وہی کردار ادا کر رہا ہے بتا رہا ہے اخفائے جلوہ سے سوز و ساز درد و داغ کے ساتھ جستجو اور آرزو حصول سے کہیں زیادہ پر لطف ہے اور یہ وہ کیفیات ہیں جو بیک وقت قلب حسن اور عشق دونوں میں ارتقا کر رہی ہیں مجاز نے 'کوئی' ردیف کا استعمال کر کے ابہام کی جو صورت پیدا کی ہے اس سے مطلع بنایا اور غزل کی طرف توجہ مبذول کرا دی رنگینیِ نقاب میں نظر گم ہونا اسی کا تسلسل ہے اور نظر کی یہ گمشدگی کے بین السطور میں بے حجابی کا تقاضا نہ کرنا یا تو

یہ بتا رہا ہے کہ شاعر اسی میں مست وسرشار ہے یا رنگینیِ نقاب میں گم نظر ماضی کا قصہ ہے تقاضا نہ کرنے کا ارادہ وہ جو واقع ہوا اسے خبر نہیں بنا رہا ہے شاعری کے حسن سے آراستہ کر رہا عشق کی ضد کہ حسن خود نقاب اٹھائے اور حسن کی ادائے انا تقاضا کی متمنی ہے یہ شعر بغیر کسی انجام کے مکمل ہو جاتا ہے ہم جانتے ہیں کہ خودی کے اس ٹکراؤ کے بعد خوش آئند نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں اور رنج والم کے افسانے بھی وجود میں آئے ہیں لیکن اس میں عاشق کی ضد وقار کی محافظ ہے اور تقاضا کا انتظار امید افزا ہے۔

مجاز پیہم ناکامیوں اور دل شکن حالات سے دو چار رہے ان کی شاعری کا آغاز فانی بدایونی کی صحبت حاصل ہونے کے ساتھ ہوا فانی کے کلام کی قنوطیت کا براہ راست اثر مجاز کی فکر پر ہوسکتا تھا لیکن انھوں نے قطعی اس سے کوئی اثر نہیں قبول کیا حیرت ہے کہ مجاز پر بے پناہ مصائب پڑے لیکن ان کا کلام ناکام زندگی کا نوحہ کبھی نہیں بنا اس کے برعکس بذلہ سنجی ان کی شخصیت کی ایک پہچان بن گئی کہ آج تک ان کے لطائف کو یاد کیا جاتا ہے لوگ اس پر ہنسے ہیں اور ہنستے رہیں گے اردو کے معروف مزاح نگار پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ جب میں سب سے زیادہ غمزدہ ہوتا ہوں تو زیادہ ہنستا ہوں ایسے لوگ مستثنیات میں ہوتے ہیں اور مجاز بھی اسی زمرے میں تھے اس کے علاوہ ان کی شاعری میں کہیں یاس کے اندھیرے نہیں ہیں انھوں نے اپنی صدا کے وقار کو برقرار رکھا شکستگیِ دل ایک طرف اور خود شناسی سے پیدا خوداعتمادی کا یہ انداز حیرت کا باعث ہے۔

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر
مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل میں چھا سکتا ہوں میں

یا عزم کا یہ رخ۔

آؤمل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

اس دور میں ایسی شاعری انقلاب تازہ لیے راہ عمل میں آنے والوں کے لیے تحریک تھی اور اسی لیے اس دور کا اولین تقاضہ بھی تھی لیکن مجاز نے جمالیات کا دامن کبھی نہیں چھوڑا وہ ترانہ جس نے ان کو زندۂ جاوید کر دیا اس کی بھی بنیادیں جمالیات پر رکھی اور جبھی اکثر ناکامی کا ذکر نقطہ انجام تک آتے آتے اشراق امید سے روشن ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ مجاز نے حسن کی بے پناہیوں کی فکر کو وسعت دی اور اس دور میں جب فیشن کے طور پر حسن وعشق کے بیان سے اجتناب کی تعلیم دی جاتی تھی مجاز اپنی تراشی راہ پر چلتے رہے اور نام نہاد progressiveness کے منکر رہے اور کافکا کے اس قول کے مطابق تخلیقیت کے لیے وہی صحیح سمجھا جس کی ہدایت باطن سے ملی کافکا نے لکھا اور یہ تو پتہ نہیں کہ مجاز نے اسے سنا یا پڑھا لیکن کیا وہی جو اس قول کا پیغام تھا وہ لکھتا ہے

Dont bend dont water it down dont try to make it logical dont edit your soul according to fashion

یعنی تخلیقیت کسی بھی نظریے کے آگے جھکنے کی اجازت نہیں دیتی اگر تخلیقیت ہے تو تخلیق کار کے جو وضع کردہ اصول ہیں ان پر قائم رہنا ہی کامیابی ہے اور کسی منطق کے آگے سپر ڈالنا اسے کمزور کرتا ہے اور اپنی روح میں اس کے مطابق ترمیم کرنا پڑتی ہے اور ایسا خیال ترمیم برجستگی کے خاتمے کا پیش خیمہ ہے وہ ترمیم روش عام کے اثر سے مجاز نے کبھی نہیں کی انھوں نے مے نوشی کو عیب گردانا۔

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

کچھ کا لفظ ہلکا استعمال کیا جوش کی ہدایت کی طرف جایا جائے جن کی مجاز کو مہذب الاوقات بنانے کی سعیِ لاحاصل کہ وہ گھڑی رکھ کر مے نوشی کریں اور مجاز کا جواب گھڑا رکھ کر پینے کا عزم خسرو کاکوروی کے اس شعر کی تفسیر ہے۔

سارا میخانہ اڑا جاؤں بلا نوش ہوں میں
تجھ سے سب چھین کے کردوں تجھے خالی ساقی

اس سے جسم کی موت ہوئی ساقی کے خالی ہوجانے کا خیال پھر خیال رہا حالانکہ ان کا مشاہدہ تو یہ ہے۔

ساقیِ گلفام با صد اہتمام آہی گیا
نغمہ برلب خم بہ سر بادہ بہ جام آ ہی گیا

اس میں 'خم بہ سر' ان کے گھڑا رکھ کر پینے کے ارادے کا شعری اظہار ہے ورنہ بادہ بہ جام کافی تھا۔

سب سے پہلے تو یہ ہمارا ایمان ہے کہ ذات باری تعالیٰ بے نیاز ہے اور اس میں بڑی وسعت ہے۔ مجاز نے شراب نوشی کو عیب سمجھا صحیح سمجھا۔ حافظ اور خیام کی خمریاتی شاعری کو حوالہ بنایا۔ خیام کا تو نہیں معلوم لیکن حافظ کے لیے تسلسل سے یہ بات پھیلی ہے کہ لوگ ان کے دیوان سے کچھ جاننے کے لیے فال دیکھتے رہے ہیں۔ مستند کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے علمائے ظاہر نے ان کے انتقال پر یہ فتویٰ جاری کردیا کہ ان کا کلام ذکر شراب سے بھرا ہے اس لیے ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ مجمع میں حافظ سے عقیدت اور محبت رکھنے والے تھے۔ اجماع سے یہ طے پایا کہ حافظ کے کلام سے لوگ وہ کچھ معلوم کرتے رہے ہیں جس میں کوئی تشکیک لاحق ہوئی

مجاز پیہم ناکامیوں اور دل شکن حالات سے دو چار رہے ان کی شاعری کا آغاز فانی بدایونی کی صحبت حاصل ہونے کے ساتھ ہوا فانی کے کلام کی قنوطیت کا براہ راست اثر مجاز کی فکر پر ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے قطعی اس سے کوئی اثر نہیں قبول کیا حیرت ہے کہ مجاز پر بے پناہ مصائب پڑے لیکن ان کا کلام ناکام زندگی کا نوحہ کبھی نہیں بنا اس کے بر عکس بذلہ سنجی ان کی شخصیت کی ایک پہچان بن گئی کہ آج تک ان کے لطائف کو یاد کیا جاتا ہے لوگ اس پر ہنسے ہیں اور ہنستے رہیں گے۔

ہے۔ حافظ ایک گھڑے میں غزلیں کہہ کر ڈال دیا کرتے تھے۔ یہی طے پایا کہ جو شعر نکلے گا اس کے مفہوم کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ سب راضی ہوئے اور شعر نکلا۔

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہست می رود بہ بہشت

یعنی حافظ کے جنازے سے قدم نہ کھینچو اگرچہ وہ گناہ گار ہے لیکن جنت میں جانے والا ہے۔ سبحان اللہ مجاز کی مغفرت کی دعا ہے کیونکہ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ وہ فطرتاً نیک تھے جوڑ توڑ اور سازشوں سے دور تھے اور صمدیت کا نور ازل سے ابد تک پھیلا ہے۔ یہاں پر شیکسپیئر کے اس قول پر نظر ڈالنا چاہیے۔

If music be the food of love play on
Give me excess of it
That surfeit
So the appetite may sicken and die

شیکسپیئر نے موسیقی کو عشق کی غذا تصور کیا اور تمنا کی کہ مجھے اس کی بہتات حاصل ہو جس سے بھوک کمزور پڑے اور فنا ہو جائے مجاز نے شراب کے حوالے سے کچھ ایسی ہی تمنا کی۔ خواہش نشہ فنا ہوئی یہ تو پتہ نہیں البتہ وجود بظاہر فنا ہو گیا لیکن سرمایۂ جاں بصورت شعر بقا کی سحر کے اجالے لیے موجود ہے۔

■

Suhail Kakorvi
C/o, National Tractors
City Hotel, B. N. Road, Lalbagh
Lucknow- 226001 (UP)
Mob.: 7897185376

ریل اور اردو شاعری

اسرار اللہ انصاری

> ادب انسان کے تمام مشاہدات و تجربات کا عکاس ہوا کرتا ہے، یہ فطری و مادی ہر قسم کی آسائشوں اور زحمتوں کا نگار خانہ بھی ہے، شاعر و ادیب خود کو اس بات کا پابند رکھتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی شے ان کے مشاہدے اور مطالعے سے محروم نہ رہے جس نے انسانی زندگی اور سماج کو کسی بھی نہج اور سطح پر متاثر کیا ہو، سفر کی ضرورت بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے، کثیر آبادی پر مشتمل اس بھری پری اور وسیع و عریض دنیا میں انسانوں کو مختلف ضروریات کے تحت متعدد مقامات کے سفر در پیش ہوا کرتے ہیں۔

موجودہ دور ماضی کی بہ نسبت بے انتہا تیز رفتار سائنسی ترقیوں کا دور ہے، اس زمانے کی ہر پل بدلتی ہوئی تکنیک اور دن بہ دن نت نئی ایجادات نے آنکھوں کو خیرہ اور دماغ کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں انسانی زندگی میں سائنسی مظاہر کے باعث بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، جس کے باعث روزمرہ کے معمولات اور شب و روز کی مشغولیات وغیرہ میں در آنے والے تغیرات نے انسان کو مصروف تر کردیا ہے۔ معاشرے میں تکنیکی ترقی کے ذریعے اس طرح کا بدلاؤ اس سے پہلے غالباً نہیں دیکھا گیا ہوگا۔ دنیا میں مشینی ترقی کی رفتار بھی اس سے قبل اتنی تیز شاید نہ تھی۔ خلائی تحقیق، سیٹیلائٹ سسٹم، انٹرنیٹ اور ذرائع اطلاعات کی ہوش ربا ترقی سے انسان کو ایسے مواقع اور سہولیات میسر آئی ہیں جسے انسان ایک خواب ہی سمجھتا رہا تھا۔

انسانی دنیا کے تمام تر شعبوں میں عجیب و غریب اور حیران کن مشینیں اور آلات دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہو، موبائل فون ہو، جنگی سازو سامان ہو، میڈیکل سائنس کا میدان ہو یا سفر کے مختلف وسائل مثلاً راکٹ، طیارے، ٹرینیں، بسیں اور موٹر گاڑیاں وغیرہ، سبھی میں آئے دن جدید سے جدید تر کی دریافت، ہر تازہ ایجاد کو پیچھے چھوڑ رہی ہے اور اس کے فیض سے انسانی زندگی سہولتوں اور آسائشوں سے مسلسل مالا

آسائشوں سے مسلسل مالامال ہوتی جارہی ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں دریافتوں اور ترقیاتی کاموں کی بازگشت زندگی کے تمام شعبوں میں بدرجۂ اتم سنی گئی ہے۔ترقی کے اثرات اوراعتراف،علوم کے مختلف شعبوں مثلاً سماجیات،معاشیات، تمدن،طب،تاریخ اورادبیات وغیرہ ہرجگہ محسوس کیے گئے ہیں۔خواہ فلسفی ہو یا دانشور، سیاست داں ہو یا مصلح قوم، حکیم ہو یاعالم،شاعر ہو یاقلم کار،طبیب ہو یا مؤرخ،سبھی نے نہ صرف سائنس کی برکتوں سے فیض اٹھایا بلکہ اپنے مشن اور پروفیشن کے فروغ میں بھی ان سے پورا تعاون حاصل کیا ہے۔ اپنی زندگی میں سائنسی آلات حرب اور محرکات کا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف و توصیف بیان کرنے اور اہمیت کے اعتراف میں بھی انسان اورقلم کار نے حسبِ موقع لب کشائی کی ہے، نیز اپنے منفرد مطمحِ نظر سے ان کی تشریح وترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے، اس ضمن میں فی الوقت مطالعے کا موضوع 'ریل اوراردوشاعری' ہے۔

ادب انسان کے تمام مشاہدات و تجربات کا عکاس ہوا کرتا ہے، یہ فطری و مادی ہر قسم کی آسائشوں اور زحمتوں کا نگارخانہ بھی ہے۔شاعروادیب خودکواس بات کا پابند رکھتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی شے ان کے مشاہدے اور مطالعے سے محروم نہ رہے جس نے انسانی زندگی اورسماج کوکسی بھی نہج اور سطح پر متاثر کیا ہو۔سفر کی ضرورت بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے، کثیر آبادی پر مشتمل اس بھری پری اور وسیع وعریض دنیا میں انسانوں کومختلف ضروریات کے تحت متعدد مقامات کے سفر درپیش ہوا کرتے ہیں۔جس طرح عام انسانوں کو اپنی خواہش یا ضرورت کی تکمیل کی خاطر بغرضِ روزگار، پیشہ، ملازمت یا تفریح وغیرہ کے لیے سفر سے واسطہ پڑتا ہے اسی طرح بعض اوقات انسان فسادو ہنگامہ اور قدرتی آفات سے دوچار ہونے کے باعث وہ ہجرت پر مجبور ہوجاتے ہیں، الغرض انہیں زندگی میں بارہا مختلف مقامات کے سفر درپیش ہوا کرتے ہیں۔ایک زمانہ تھا کہ انسان پیدل سفر کیا کرتا تھا۔ پھرغوروفکر کے بوتے پر انسانی ذہن نے حیوانوں کے ذریعے اپنے سفراور مسافت کوآسان بنایا۔ جانوروں کو گاڑی میں جوت کر ان سے مدد لی اور بیل گاڑی،تانگہ،رتھ وغیرہ سے سفر کی مسافت طے کی۔

سفری سہولتوں میں اس وقت انقلاب آیا جب بھاپ کی مدد سے چلنے والے انجن اور پٹرول کی دریافت ہوئی۔ بھاپ اور پٹرول کے ذریعے تیز دوڑنے والے انجن کی ایجاد سے تیز رفتار موٹرگاڑیوں، ٹرینوں اور طیاروں کی مدد سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کیا جانے لگا۔اس طرح انسان دور دراز کے سفر کا منصوبہ بنانے لگا اور نہ صرف زمینی راستوں بلکہ طویل بحری و فضائی راستوں کومختصر وقت میں عبور کیا جانے لگا۔ظاہر ہے ان تمام دریافتوں اورایجادات کوقلم کاروں نے بھی دیکھا اور ان کے باعث حاصل ہونے والی سہولیات کا مشاہدہ کیا۔

ٹرین نہ صرف دنیا کے متعدد ممالک میں بلکہ ہمارے اپنے ملک میں بھی عوام وخواص کے لیے زمینی سفر کا سب سے آسان اورسہولت بخش ذریعہ ہے، جسے ہم ریل کے نام سے بھی پکارتے ہیں، ہرامیر وغریب انہیں ترجیح دیتا ہے۔ اِس وقت مناسب معلوم ہوا کہ اردو شاعری میں ریل کے پس منظر میں کس قسم کے اظہارِ خیالات کیے گئے ہیں اور شعرا نے جواشعار کہے ہیں، یا ریل سے متعلق اپنے جذبات واحساسات کا کس طرح اظہار کیا ہے ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔

اردو شاعری پرنظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد شاعروں نے ریل کوموضوع بنا کر خوب صورت اشعار کہے ہیں۔ ریل جو اپنے آپ میں ایک خطرناک آہنی مشین ہے، جس کی زد میں آکر انسان کیا شجر وحجر چکناچور ہوجاتے ہیں، جو چلتی ہے تو کثیف دھواں اور حرارت اگلتی ہے اور کان پھوڑ آواز کا دھماکہ پیدا کرتی ہے۔ایسی بھاری بھرکم اور طویل ریل گاڑی پر شعرا نے بڑے لطیف اور رومانی پیرایۂ خیال کا سہارا لے کر اشعار کہے ہیں اور بعض بڑی نازک باتیں بھی بیان کی ہیں۔

ریل جو بظاہر ایک مشین ہے اور بعض اوقات ان کی ایجاد کا سہرہ صنعتی انقلاب کے زیرِ اثر سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ مشینوں کی ایجاد اور اس کے بڑھتے ہوئے استعمال سے انسانوں اور مزدوروں کو ہونے والے معاشی و دیگر نقصان اور استحصال پر اشترا کی اور ترقی پسند شعرا و ادبا کے علاوہ دیگر نے بھی اشارہ کیا ہے۔ نیز ان کے مضر اثرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً اقبال نے کہا ہے۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ قطعی نہیں کہا جاسکتا کہ درج بالا شعر میں دلوں کے لیے جن مشینوں کو موت کہا گیا ہے ان میں ریلیں بھی شامل ہیں۔لیکن یہ ضرور ہے کہ اس شعر میں مشینوں کی غیر ضروری بالادستی، ان کے سفاکانہ پہلو اور ظالمانہ صورتِ حال پر ضرور تبصرہ کیا گیا ہے۔

سواریاں، جسے انسان اپنی سفری ضرورتوں کی خاطر استعمال کرتے رہے ہیں۔ بظاہر ان کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا سفر طے کیا جاتا ہے یا مسافر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔موجودہ دور کی سواریاں بے جان لوہے اور فولاد کی ڈھلی ہوئی ہیں لیکن شاعروں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جیسے یہ ریلیں کوئی بے جان مشین نہیں بلکہ ذی حس مخلوق ہو، جو موسم کے سرد وگرم سے واقف ہو، اپنی مرضی کی مختار ہو، خوشی وغم سے آشنا ہو اور انسانوں کے سے جذبات واحساسات اپنے اندر رکھتی ہو۔ہم دیکھتے ہیں کہ شاعروں نے ان سے بڑی جذباتی وابستگی اورزندگی آمیز باتیں کی ہیں، ہجر ووداع کی پُر درد کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ساتھ ہی ریل کے چلنے سے، پٹریوں کی آوازوں سے اورسیٹی وغیرہ کے بجنے سے دل و دماغ پر جو اثرات مرتسم ہوتے ہیں اسے شعرا نے دلچسپ اندازِ بیان میں پیش کیا ہے۔

غمِ ہجراوردردِ جدائی ایسی کیفیات ہیں جس سے ہرانسان اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی گزرتا ہے۔شاعری میں اسے کثرت سے شعرا نے نظم کیا ہے۔بلکہ یہ کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا کہ شاعری کا معتدبہ حصہ انہیں کیفیات کی عکاسی پر مشتمل ہے۔شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے ہجر ووصال اور ملاقات و وداع وغیرہ پر اپنے انداز سے گفتگو نہ کی ہو۔

بعض اوقات انسان کو موسم کا مزاج بھی اپنی دلی کیفیت جیسا محسوس ہوتا ہے۔ ہوا خواہ صبحِ کاذب کی ہو یا کسی اور وقت کی، وہ اپنے آپ میں خوشی وغم کی کیفیت کہاں رکھتی ہے۔مگر انسان جس دردو کرب کی لذت سے دوچار ہو رہا ہوتا ہے وہ موسم کو بھی اپنا غم گسار گردانتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ جو درد میں جھیل رہا ہوں اس میں موسم کی آب و ہوا بھی گرفتار ہے۔اس طرح آدمی اپنے وجود کی طرح ماحول کو بھی سوگوار پاتا ہے۔ گویا انسان کے دل کا درد موسم کے ساتھ مشترک ہوگیا ہے۔جیسا کہ منیر نیازی کہتے ہیں۔

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

یہاں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر وداع کا دیرینہ تجربہ کار ہے جسے اسٹیشن کے آس پاس کا ماحول اور آب و ہوا بھی غم انگیز معلوم ہوتی ہے۔ عموماً وقتِ صبح کی فضا میں ٹھنڈک، تازگی اور خوش گواری ہوتی ہے جو دل کو راحت عطا کرتی ہے مگر اپنوں سے رخصت ہونے کے باعث دردانگیزی کا یہ عالم ہے کہ یہ ساعتِ صبح کی فضا بھی درد سے پُر محسوس ہوتی ہے۔ ریل کی سیٹی جو گاڑی چھوٹنے کا اعلان نامہ ہے، جیسے ہی بجتی ہے تو گویا درد کے مارے دل خون سے

لبریز ہوجاتا ہے یوں اپنے پیاروں اور اپنے دیار سے رخصت ہونے کا بے انتہا درد پیش کیا گیا ہے۔

اپنے لختِ جگر کو رخصت کرنے کا سماں ہی کیا کم غم انگیز تھا کہ ریل نے سیٹی بجادی۔ ریل کی سیٹی گویا رخصت ہونے کے درد کی انتہا کی علامت ہے۔ شاعر کا تجربہ ہے کہ وداع کے وقت یوں ہی دل غم سے بھرا ہوا تھا، سیٹی نے چیخ کر دل کے درد کی شدت میں وہ اضافہ کیا کہ دل لہو سے بھر گیا۔ اسی سے ملتا جلتا خیال یعنی ریل کی سیٹی کے بجنے سے دل کے درد کی شدت کے بڑھنے کے احساس کی عکاسی پروین شاکر نے بھی کی ہے، اور بالکل ایسا ہی تجربہ بیان کیا ہے۔ یعنی یہاں بھی ریل کی سیٹی میں دردِ ہجر محسوس کیا گیا ہے۔

ریل کی سیٹی میں کیسی ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا

لیکن پروین شاکر کا مشاہدہ کار اپنے محبوب کو رخصت کر کے گھر لوٹ آنے کے بعد اسے درد کی شدت کا احساس ہوتا ہے، اور ریل کی سیٹی ہی گویا اس کے ہجر کی ابتدا ہے۔ ان تمام کیفیات کا اندازہ جدا ہوجانے اور گھر لوٹ جانے کے بعد ہوا ہے۔ دونوں ہی شعرا کے یہاں ریل کی سیٹی کا بجنا غم انگیزی کی علامت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ درج بالا دونوں ہی اشعار میں ریل کی سیٹی کے بجنے سے ہجر کا کرب گہرا ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ الغرض دونوں ہی شعر کی فضا غم انگیز ہے۔

سید انوار احمد نے بھی اپنے ایک شعر میں رخصت ہونے کے وقت کا سماں باندھا ہے وہ ریل کی سیٹی کی آواز میں بڑی دیر تک اپنے محبوب کی وفاداریوں کی چیخ کو سنتے ہیں۔ وہ اپنے رفیق کی صحبت اور قربت کے شب وروز کے تمام لمحات کو یاد کرتے ہیں اور یہ وفائیں انہیں رخصتی کے وقت کچوکے لگارہی ہوتی ہے۔

رخصت ہوئے تو ریل کی سیٹی میں دیر تک
ایسا لگا کہ جیسے وفا چیختی رہی

اپنے دیرینہ مہمانوں کو دور سفر کے لیے سواری کے حوالے کر کے جب لوٹتے ہیں تو اپنے پیچھے سیٹی کی پکار انہیں درد و کرب سے دوچار کر دیتی ہے۔ ریل کی سیٹی کا دورانیہ اگر چہ چند سیکنڈ کا ہوتا ہے، لیکن جدا ہونے کی کیفیت ایسی ہے کہ اس وقت وہ اپنے محبوب کے ساتھ گزارے طویل سفر کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہوا محسوس کرتے ہیں جس میں تمام وفائیں مارے درد کے چیخ پڑتی ہیں۔

شعرا کے درج بالا اشعار میں ایک بات قدرے مشترک ہے، وہ یہ کہ ان کی فضا غم انگیز ہے اور جدا ہونے کے باعث رنج کی کیفیت کا ہی بیانِ محض ہے۔ جب کہ دوسری حقیقت جس طرف شعرا نے غالباً کم توجہ دی وہ یہ کہ انھیں ریلوں کے سفر کے ذریعے لوگ اپنے چاہنے والوں سے شرفِ ملاقات بھی حاصل کرتے ہیں اور خوشی و مسرت سے ہمکنار ہوتے ہیں، ریل کے سفر کی تکمیل کے بعد لوگ وصل و ملاقات کے باعث جس اطمینان، خوش گواری اور خوشی و مسرت کو حاصل کرتے ہیں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا، ایسا لگتا ہے اس پہلو کی طرف شعرا نے کم ہی توجہ کی ہے۔

منور رانا اور راحت اندوری نے مشاعروں کے ذریعے خوب شہرت پائی۔ یہ شعرا اپنے شعر سنانے کے منفرد انداز کے باعث اور عہدِ حاضر کے موضوعات پر دوٹوک اظہارِ خیال کے لیے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اسی طرح انجم رہبر نے اپنے دلچسپ اشعار اور مترنم انداز سے عوام کے دلوں میں خوب جگہ بنائی ہے، ان شعرا نے نہ صرف اردو حلقے میں بلکہ پورے برصغیر اور جہاں جہاں اردو اور ہندی زبانیں جاننے والے لوگ موجود ہیں وہاں اپنی مہارت کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ ان شعرائے کرام نے بھی ریل سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں۔

فرشتے آکے ان کے جسم پر خوشبو لگاتے ہیں
وہ بچے ریل کے ڈبے میں جو جھاڑو لگاتے ہیں
آتے ہیں جیسے جیسے بچھڑنے کے دن قریب
لگتا ہے جیسے ریل سے کٹنے لگا ہوں میں

منور رانا

وہ اب بھی ریل میں بیٹھی سسک رہی ہوگی
میں اپنا ہاتھ ہوا میں ہلا کے لوٹ آیا

راحت اندوری

انجم تمھارا شہر جدھر ہے اسی طرف
اک ریل جارہی تھی کہ تم یاد آگئے

انجم رہبر

متذکرہ بالا اشعار میں شعرا نے مختلف مضامین باندھے ہیں جنھیں ہم شاعر کے انفرادی خیالات کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی شعرا کے چند شعر ملاحظہ کریں جس سے قارئین ضرور محظوظ ہوں گے۔

جیسے ریل کی ہر کھڑکی کی اپنی اپنی دنیا ہے
کچھ منظر تو بن نہیں پاتے کچھ پیچھے رہ جاتے ہیں

امجد اسلام امجد

ریل دیکھی ہے کبھی سینے پہ چلنے والی
یاد تو ہوں گے تجھے ہاتھ ہلاتے ہوئے ہم

نعمان شوق

یادوں کی ریل اور کہیں جارہی تھی پھر
زنجیر کھینچ کر ہی اترنا پڑا مجھے

زہرا شاہ

اک دندناتی ریل سی عمریں گزر گئیں
دو پٹریوں کے بیچ وہی فاصلے رہے

اسداللہ

رات بھر ریل کے ڈبے میں مرے ساتھ تھے
چہرہ وہ اترا ہوا سا آنکھیں وہ بجھی ہوئی

فاروق نور

ریل اور اس کے متعلقات پر غزلوں میں کہے گئے چیدہ چیدہ اشعار سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ اس موضوع پر مشاہیر شعرائے اردو نے مستقل نوعیت کی بڑی شاندار نظمیں بھی کہی ہیں جو ادبِ اردو میں اپنی قدر و منزلت رکھتی ہیں جو مختلف اوقات میں ہمارے نصاب کا حصہ رہی ہیں، ان میں مجاز کی رات اور ریل کو بھلا کون فراموش کر سکتا ہے۔ اسی طرح بچوں کے لیے کہی گئی دلچسپ نظموں کی بھی خاطر خواہ تعداد ہے۔ ان نظموں میں بطورِ خاص اختر شیرانی کی 'شملے کی ریل گاڑی'، اور اسماعیل میرٹھی کی 'ریل گاڑی' وغیرہ کو اپنی نغمگی، روانی، رومانیت، شگفتگی اور برجستگی کے باعث نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام نظمیں اپنی دل نشینی کے باعث مکمل مطالعے کی مستحق ہیں جو قاری کو یقیناً محظوظ کرتی ہیں۔ اشعار کی کثرت ذہن پر بار نہ گزرے لہٰذا چند حصوں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

رات اور ریل: اسرار الحق مجاز

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی

شعرائے اردو نے موجودہ دور کے اہم سفری وسیلہ ریل پر خاطر خواہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سفر کی ابتداء، اختتام اور دوران میں مسافروں اور ان کی قرابت دار مختلف قسم کے تجربات اور مشاہدات سے گزرتے ہیں نیز اسی طرح مختلف جذبات و کیفیات سے بھی نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق مستقل نظمیں ہوں یا نظموں اور غزلوں میں کہی گئی متفرق شعر، ان کے ذریعے ہمیں شاعر کے منفرد رنگ و آہنگ کا بھی پتہ چلتا ہے اور ایک عام آدمی کی کیفیت کیا ہوتی ہے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا تبسم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھاکر لچکتی گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

مجاز ایک رومانی و انقلابی شاعر کے طور پر مشہور ہیں وہ اشتراکی و ترقی پسند نظریات کے حامل بھی رہے ہیں نیز مثبت رویوں کی ترغیب دیتے ہیں انھوں نے اپنی نظم میں ریل کو زندگی، جدوجہد اور پامردی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ مانندِ حیات اپنے مقصد کے حصول اور منزلِ مقصود کی طرف شدت اور پروقار طریقے سے اپنے سفر کی جانب رواں دواں رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ راستے کی تمام رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوئے جس طرح موسم کے سردوگرم اور راہ کے نشیب وفراز کی پرواہ کیے بغیر اپنی ترقی کی طرف گامزن رہتی ہے اس کا یہ طرزِ عمل ہی حیاتِ انسانی کا رویہ بھی ہے۔ ریل کے پس منظر میں مجاز نے فطرت کی جولانیوں اور قدرت کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ انسانوں کو باہمت اور باحوصلہ رہنے کا سبق بھی دینے کی کوشش کی ہے۔

ریل گاڑی...اسماعیل میرٹھی

حیواں ہے نہ وہ انساں جن ہے نہ وہ پری ہے
سینہ میں اس کے ہر دم اک آگ سی بھری ہے
کھاپی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھوئیں اڑا کر غصہ اتارتی ہے
وہ گھورتی گرجتی بھرتی ہے اک سپاٹا
ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اس نے کاٹا
آتی ہے شور کرتی جاتی ہے غل مچاتی
وہ اپنے خادموں کو ہے دور سے جگاتی
بے خوف بے محابا ہر دم رواں دواں ہے
ہاتھی بھی اس کے آگے اک مورِ ناتواں ہے
آندھی ہو یا اندھیرا ہے اس کے سب برابر
یکساں ہے نور ظلمت اور روز وشب برابر
اتر سے لے دکن تک پورب سے لے پچھاں تک
سب ایک کردیا ہے پہنچی ہے وہ جہاں تک
بجلی ہے یا بگولا بھونچال ہے کہ آندھی
ٹھیکہ پہ ہے پہنچتی بچوں کی ہے وہ باندھی
ہر آن ہے سفر میں کم ہے قیام کرتی
رہتی نہیں معطل پھرتی ہے کام کرتی
پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہنچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اس نے سوداگری کے تن میں
ہر چیز سے نرالی ہے چال ڈھال اس کی
پاؤ گے صنعتوں میں کمتر مثال اس کی
برکت سے اس کی بے پر پردار بن گئے ہیں
ملک اس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں

نظموں کے اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ شعرا نے فطرت اور فطری مناظر کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ سرسبز وشاداب وادیاں، موسم کی خوش نمائی، پہاڑیوں کی ہری بھری چوٹیاں، قدرتی مناظر کی خوبصورت عکاسی اور ٹرینوں کے چلنے سے پیدا ہونے والی آواز مانندِ نغمہ سرائی وغیرہ کے ذریعے سے قاری کی دلچسپی اور نظم کے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے، نیز نظمیں پڑھ کر طبیعت میں یک گونہ خوش گواری کا احساس ہوتا ہے۔

درج بالا مستقل نظموں کے علاوہ شعرا نے مختلف موضوعات پر مشتمل ایسی نظمیں کہی ہیں جن میں اکا دکا اشعار ریل سے ہیں۔ ان میں بطورِ خاص علی سردار جعفری کی نظم 'نیند'، اور کیفی اعظمی کی 'کہرے کا کھیت' سے ایک ایک شعر پیشِ خدمت ہے۔

ریل اپنے پہیّوں سے لوریاں سناتی ہے
رات خوبصورت ہے نیند کیوں نہیں آتی

علی سردار جعفری

تیزی سے جنگلوں میں اڑی جارہی تھی ریل
خوابیدہ کائنات کو چونکا رہی تھی ریل

کیفی اعظمی

ساحر لدھیانوی کے اشتراکی اور ترقی پسند نظریے سے ہم سب واقف ہیں ان کی شاعری کا بیشتر حصہ مساوات، انسانوں کے دردوغم اور ان کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ کمزوروں، مظلوموں اور محروموں کی بھرپور نمائندگی ساحر کی نظموں میں ملتی ہے۔ سرمایہ داری اور آمریت کے جبر و قہر کے خلاف بھی وہ اپنی نظموں میں کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ انسانوں سے محبت اور ہمدردی کے لیے موصوف کا قلم بڑا زرخیز ثابت ہوا ہے۔ ساحر کی نظموں کے مطالعے سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے بعض ایسے ترقیاتی کاموں کی بھی مخالفت کی ہے جس سے غریب انسانوں یا انسانیت کو ذرا سا بھی نقصان پہنچتا ہو۔ پھر چاہے صنعتوں اور کارخانوں میں استعمال کی جانے والی نئی مشینیں ہوں یا انسانوں کی ضرورت وسہولت کی غرض سے ایجاد کی گئی کوئی اور شے۔ اپنی نظم 'ورثہ' میں وہ بعض ترقیات کے لیے بحیثیت انسان خود کو بھی مجرم قرار دیتے ہیں۔

میری تائید سے ڈھالے گئے میں مجرم ہوں
پٹریاں ریل کی سڑکوں کی بسیں فون کے تار

ریل کے تعلق سے ہمارے شعرا نے بڑی رومانی ومثبت کیفیات سے لبریز گفتگو کی ہے اور بڑی زندگی آمیز باتیں کہی ہیں۔ ٹرینیں جیسے نظموں میں زندگی، حرارت اور جہدِ مسلسل کی علامت کے طور پر بھی دیکھا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ شعرائے اردو نے موجودہ دور کے اہم سفری وسیلہ ریل پر خاطر خواہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سفر کی ابتدا، اختتام اور دوران میں مسافروں اور ان کے قرابت دار مختلف قسم کے تجربات اور مشاہدات سے گزرتے ہیں نیز اسی طرح مختلف جذبات وکیفیات سے بھی نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق مستقل نظمیں ہوں یا نظموں اور غزلوں میں کہے گئے متفرق شعر، ان کے ذریعے ہمیں شاعر کے منفرد رنگ وآہنگ کا بھی پتہ چلتا ہے اور ایک عام آدمی کی کیفیت کیا ہوتی ہے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صنعتی انقلاب اور مشینی ترقی نے انسانی جذبات و کیفیات کو لازمی طور پر متاثر کیا ہے۔ دنیا کو جہاں معاشی و اقتصادی اور کاروباری طور پر متاثر کیا ہے وہیں آدمی کے جذبات وکیفیات پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ادب کیوں کہ ہمارے سماج کا آئینہ ہوتا ہے لہٰذا ریل کے پس منظر میں مذکورہ بالا اہم امور کی بازگشت سے ہماری اردو شاعری اور ادب بھی خالی نہیں ہے۔

■

Dr. Asrar Ullah Ansari
Dept. Of Urdu, Government College
Burhanpur- 450331 (M.P)
Mob.: 9753210869
Email.: asrar1607@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

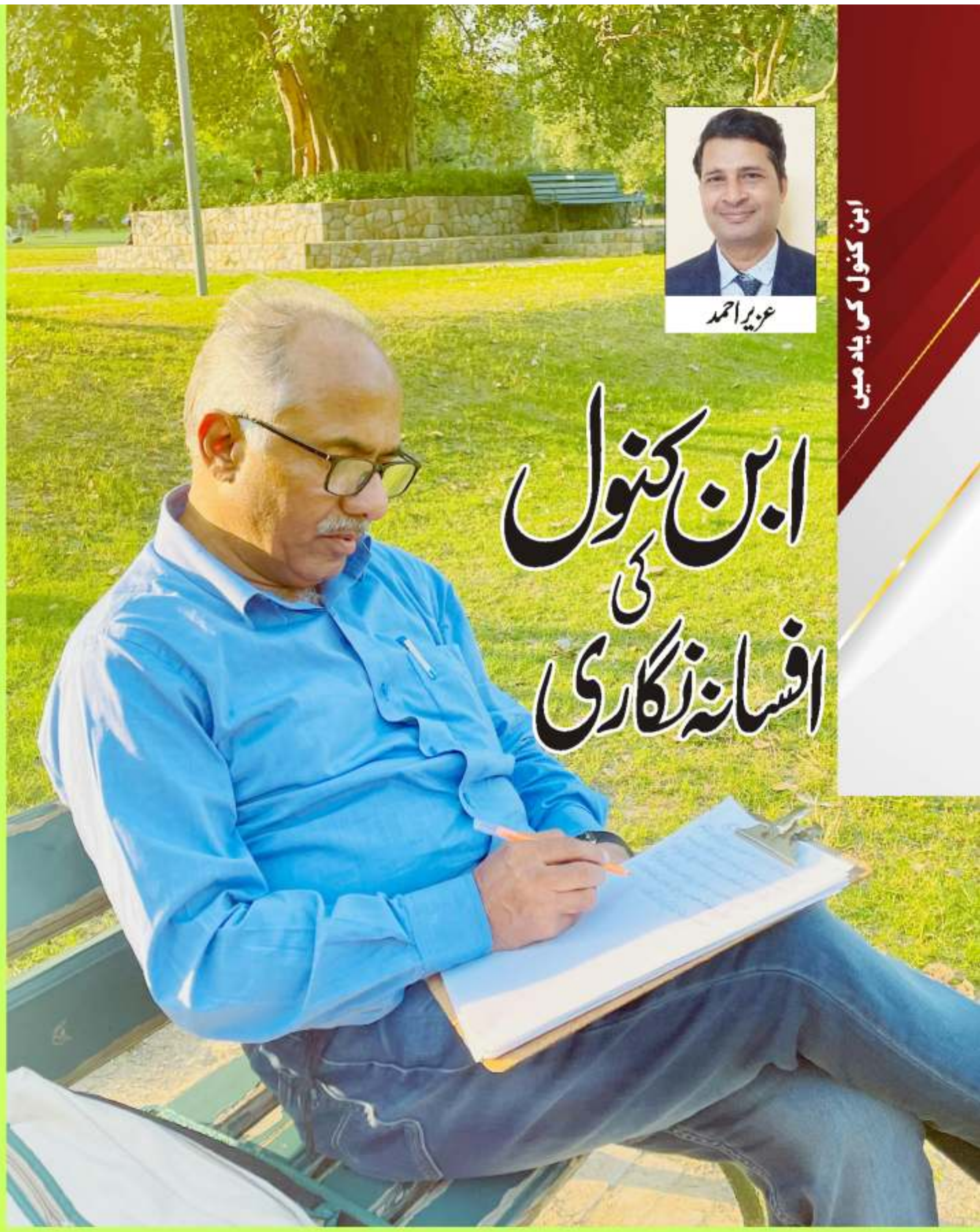

عزیر احمد

ابن کنول کی افسانہ نگاری

پروفیسر ابن کنول کے لیے 'تھے' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے لیکن اللہ کی مرضی کے آگے انسان بے بس ہے۔ ابن کنول کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے اور غیر جانب دارانہ طور پر ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کی جائے۔ ابن کنول ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، انشائیہ، تنقید اور تحقیق ہر میدان میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کی ادبی شناخت داستانوں کے پارکھ اور افسانہ نگار کی ہے۔ داستان ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ داستانوں کی جمالیات پر ان کی نظر تھی۔ ان کی افسانہ نگاری بھی داستانوں کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ ابن کنول کے افسانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے داستانوی رنگ و آہنگ کی حامل ہے مثلاً صرف ایک شب کا فاصلہ، ایک ہی راستہ، شام ہونے سے پہلے، ہار کسی کی، جیت کسی کی ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، وارث، پہلا آدمی، خوف وغیرہ افسانے۔ پروفیسر عبدالحق نے ابن کنول کے افسانوں کی تین خصوصیات شمار کرائی ہیں ''اقدار کی ارجمندی، قصہ پن اور اساطیری اسالیب بیان۔'' یہ تینوں خصوصیات دراصل ابن کنول کے افسانوں کے موضوعات اور اسلوب دونوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ابن کنول کے افسانوں کا موضوع ابن آدم کی سرکشی کی روداد ہے۔ یہ سرکشی سرمایہ دارانہ نظام کے جبر و استحصال کی شکل میں ہو یا زمین دارانہ نظام کی شکل میں۔ لال فیتہ شاہی کی شکل میں ہو یا گندی استحصالی سیاست کی شکل میں ابن کنول نے اپنے افسانوں کے ذریعے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے افسانوں میں سماج کے نچلے اور دبے کچے طبقے کے لیے ہمدردی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اس بات پر دکھی ہوتے ہیں کہ فائیو اسٹار ہوٹل بنانے والا مزدور خود اس ہوٹل میں کیوں نہیں داخل ہوسکتا ہے۔ 'فورتھ کلاس' کے 'بکسؤ' کا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ کل تک اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے والا مالک ہوٹل بننے کے بعد اس کو پہچاننے سے کیوں منع کر رہا ہے۔ 'اشرف المخلوقات' میں انھوں نے غربت و افلاس کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ حیات اللہ انصاری کے افسانہ 'آخری کوشش' اور منشی پریم چند کے کفن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فقیرا چاہ کر بھی بڑھیا کو بچا نہیں پاتا اس لیے کہ اس کے پاس اس کو کھلانے کے لیے اور نہ ہی دوا کے لیے کچھ پیسے ہیں۔ مرنے کے بعد کفن دفن کی رسم پر خرچ کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن زندوں پر خرچ کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔ ابن کنول کو نچلے طبقوں کی زبان اور ان کی نفسیات پر گہری نظر ہے۔ 'اشرف المخلوقات' میں بھیک مانگنے والوں کے مکالمے ملاحظہ فرمائیں:

''ارے بھیا دنیا جیسے جیسے جا رہی ہے، آدمی کنجوس ہو رہے ہیں۔ پہلے زمانے میں لوگ بڑے دل والے ہوتے تھے۔ نہ کھلانے میں کنجوسی نہ دینے میں۔''

''اور کیا سادی بارہ ہو، پھاتحہ درود ہو، سیکڑوں بھائی بند کھا آتے تھے۔ کوئی ٹوکنے والا بھی نہ تھا، آج کل تو گھسنے بھی نہیں دیتے۔''

''یہ پینٹ پتلون والے بڑی محنت کرواتے ہیں، بڑی مشکل سے پانچ پیسے نکالتے ہیں۔ سگریٹ سنیما میں دسیوں روپے لٹا دیتے ہیں۔''

''آجکل چمن کے یاں کے ٹھرے میں نسہ نہیں آریا۔''

''سالا پانی بہت ملاتا ہے۔'' (اشرف المخلوقات)

ابن کنول نے ہندوستان کے دیہی اور شہری دونوں علاقوں کو دیکھا ہے۔ ان کی نظر دونوں آبادیوں کے مسائل پر ہے۔ 'سراب' گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت اور شہروں میں ان مہاجر مزدوں کی کسمپرسی کی ایسی روداد ہے جو قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ گاؤں سے شہر میں آکر سڑک کنارے خوانچہ لگا کر، رات میں فٹ پاتھ پر سو کر زندگی گزارنے والا رام چرن گاؤں والوں کے سامنے جھوٹی شان دکھا کر ان کے دل میں شہر کا شوق پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے دکھاوٹی رہن سہن کو دیکھ کر گھر والوں کو بتائے بغیر گھنشیام شہر چلا آتا ہے۔ یہاں آکر اس کو شہر کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''رات ہوئی تو رام چرن نے اپنا سامان ایک دکان میں رکھا اور گھنشیام کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب رات کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھنے لگی تو گھنشیام بولا۔ ''بھیا! گھر نا ہیں چلو گے؟''

رام چرن نے اس کی معصومیت پر ہنستے ہوئے کہا۔

''ابے کیسا گھر؟ پوری دہلی اپنا گھر ہے۔ چاہے جہاں رہو۔''

گھنشیام نے رام چرن کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ جب سب بازار بند ہوگیا۔ اور فٹ پاتھ پر سونے والے اپنی جگہوں پر پہنچ گئے۔ رام چرن بھی اپنی جگہ پر پہنچا۔ جگہ کو جھاڑ کر چادر بچھائی۔ گھنشیام سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ گھنشیام اپنے ساتھ ایک چادر لایا تھا۔ رام چرن نے کھیس اور چادر کو ملا لیا اور دونوں اوڑھ کر لیٹ گئے۔ گھنشیام میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جاڑوں کی رات جب نقطۂ عروج پر پہنچی تو گھنشیام ٹھنڈ کی وجہ سے سکڑنے لگا۔ لیکن رام چرن بڑے آرام سے سو رہا تھا، جیسے اسے سردی کا احساس ہی نہ ہو۔ سردی جب ناقابل برداشت ہوئی تو گھنشیام منمنایا: ''بھیا! بھیا!''

''کا بات ہے؟''

''ٹھنڈ لاگت ہے''

''ابے سوجا یہاں لحاف کہاں رکھا ہے۔ دیکھ اسے دیکھ ایک چادر ہی اوڑھ رکھی ہے اور کتنے آرام سے سو رہا ہے۔ اور وہ دیکھ اس کے پاس چادر بھی نہیں۔ لے سنبھال کے اوڑھ لے۔'' (سراب)

اس کو یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فٹ پاتھ پر سردی کے دنوں میں بھی بغیر لحاف کے رات گزارنی ہوتی ہے۔ بسوں میں جان پر کھیل کر سفر کیا جاتا ہے۔ گھنشیام یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شہر کی چکاچوند صرف سراب ہے۔ اس لیے وہ دوسرے دن کی گاڑی پکڑ کر گاؤں چلا جاتا ہے۔

شہری زندگی میں رہائش ایک اہم مسئلہ ہے۔ ابن کنول کا افسانہ 'سویٹ ہوم' اسی مسئلے پر لکھا گیا ان کا ایک عمدہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ابن کنول نے بتایا ہے کہ یہاں کرایے کے مکان میں رہنے والے تو مالک مکان کے برتاؤ سے پریشان ہوتے ہی ہیں اگر کوئی اپنی جمع پونجی سے گھر بنا لے تو بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ اس کے سبھی مسائل حل ہو گئے۔ شوکت کو جب معلوم ہوا کہ انھوں نے جہاں گھر بنایا ہے اس بستی کو سرکار توڑنے جا رہی ہے کیونکہ وہ سرکاری زمین ہے جس کو بلڈر نے دھوکے سے لوگوں کو بیچ دیا ہے۔ شہروں کی کچی آبادیوں میں گھروں کو توڑنا اور ان کے مکینوں کو بے گھر کرنا ایک عام بات ہے۔ اس سے ان میں رہنے والوں پر کیا گزرتی ہے اس کی روداد ابن کنول کا یہ افسانہ بیان کرتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''اسے اب اس سوئٹ ہوم کی دیواریں ہلتی ہوئی نظر آرہی تھیں اور ان ہلتی ہوئی دیواروں کے بیچ جب وہ اپنے معصوم بچوں کو ایک بار پھر بے گھری کے عالم میں دیکھتا تو تڑپ اٹھتا تھا۔ ان بچوں نے اس گھر کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں، کھلونوں کے بجائے گھر کے لیے اینٹیں خریدی تھیں۔ اپنے آپ کو کھلونوں سے کھیلنے والے بچوں کی عمر سے بلند کرایا تھا اور اس معصوم بڑپن نے بازاروں میں بکتے ہوئے کھلونوں کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا تاکہ انھیں سر چھپانے کے لیے اپنی چھت مل جائے۔''

(سویٹ ہوم)

'آنکھوں کی سوئیاں' میں شہروں میں قرض پر گھر لینے کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ راوی اپنا مکان بنوانے کے باوجود اس میں جانے کے بجائے اس کو بیچ کر قرض چکانے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔

ابن کنول کا قلم دیہات میں رہنے والے کسانوں کے لیے بھی دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ 'کنیا دان' اور 'غبار' ایسے مظلوم و لاچار کسانوں کی کہانی ہے جہاں انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی ہے۔ کسان قدرت کی ستم ظریفی اور حکومتی اہلکاروں کی بے حسی کا شکار ہوتے ہیں۔

جب بات دیہی زندگی کی آتی ہے تو زمیں دارانہ نظام کی طرف بھی ذہن متوجہ ہوتا ہے۔ ابن کنول نے زمیں دارانہ نظام پر بھی افسانے لکھے ہیں لیکن اردو کے روایتی افسانہ نگاروں سے ہٹ کر انھوں نے یہاں بھی انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ جہاں ایک طرف 'کچے گھڑے' کا شمیم ہے جو یہ مانتا ہے کہ کسان محنت کے لیے ہی پیدا ہوئے اس لیے اگر ان کو سزا دی جائے تو حرج نہیں۔ وہ اپنے دادا کے ذریعے ایک کسان کے گھوڑے کو حاصل کرنے کے لیے اس کے قتل کرنے کو فخریہ بیان کرتا ہے وہیں دوسری طرف 'واپسی' کے چودھری ریاست علی ہیں ''ان کے یہاں سیکڑوں بھوکے اپنا خالی پیٹ بھرتے تھے۔ نہ جانے کتنی یتیم لڑکیوں کی ڈولیاں ان کی دہلیز سے اٹھ کر سسرال چلی گئی تھیں۔ ریاست علی کی فراخ دلی کے چرچے دور دور تک ہوتے تھے۔'' (واپسی)

واپسی افسانہ زمین داری کے زوال کے بعد زمین داروں پر کیا گزری اس کی ایسی کرب ناک داستان ہے جس کو عموماً مکافات عمل سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات پر اردو کے اکثر افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ ابن کنول نے اپنے افسانوں میں کسی ایک فریق کی حمایت کرنے کے بجائے انسانیت کی موت پر ماتم کیا ہے۔ ابن کنول کے افسانے ایک ہی راستہ، تیسری لاش، خانہ بدوش، خدشہ، مٹی کی گڑیا، ایک گھر کی کہانی، سفر اور ابن آدم ایسے افسانے ہیں جس میں ابن کنول نے فسادات اور اس کے نتیجے میں انسانیت کو پہنچنے والے نقصانات کا بیان کیا ہے۔ ابن کنول کا افسانہ 'خدشہ' فسادات پر لکھا گیا ایک عمدہ افسانہ ہے۔ اس افسانے کے ذریعے ابن کنول نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو خراب کرنے والے دونوں طرف ہوتے ہیں۔ یہ احمد گڑھ کی کہانی ہے جہاں لال چوک پر محرم کے دشہرے کے میلے اپنے اپنے وقت پر لگتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے میلے میں شرکت کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک سال محرم اور دشہرہ ایک ہی ساتھ پڑ گیا۔ دونوں نے اس کو انا کا مسئلہ بنا لیا۔ کوئی اپنے جلوس کے وقت کو تبدیل کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکل کر سامنے آیا کہ:

''یوم عاشورہ آگیا۔ رام کا وجے دوس آگیا، لیکن لال چوک خالی تھا، کسی سمت سے کوئی جلوس نہیں آیا۔ فوج کے دو ٹرک لاشوں کو لے کر ٹھیک اس وقت لال چوک میں پہنچے کہ جب تعزیوں کے دفنانے کی رسم ادا ہوتی ہے اور راون کے پتلے کو جلایا جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے لاشوں کو اُتارا گیا اور فوج کی نگرانی میں ان افراد کی لاشوں کو دفنا دیا گیا کہ جنھیں تعزیوں کے دفنانے کی رسم ادا کرنی تھی اور ان لوگوں کی لاشوں کو نذر آتش کر دیا گیا کہ جنھیں راون کو جلانا تھا۔ یوم عاشورہ اور یوم ہلاکت راون بہت پرسکون انداز میں گزر گیا۔ حاجی ابراہیم اور ٹھاکر جسونت سنگھ حسب روایت دیوان خانے میں بیٹھے شربت کا گلاس ہاتھ میں لیے اطمینان بخش لہجے میں یہ باتیں کر رہے تھے:

''اب یہ مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا ٹھاکر صاحب۔ اس لیے کہ آئندہ سال چاند دس دن پہلے دکھائی دے گا۔''

دروازے کے قریب کھڑا نوکر پاس آکر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا:

''صاب جی مسلا کیسا؟ اب کی بار کے تہوار تو یادگار تہوار ہوئے۔''

حاجی ابراہیم اور ٹھاکر جسونت نے نوکر کو گھور کر دیکھا، وہ بولتا رہا:

''ہاں صاحب جی، اب کی بار تو لوگ امام حسین کی طرح شہید ہوئے اور تعزیوں کی جگہ آدمی دفن ہوئے اور ہاں صاب جی لنکا کی طرح احمد گڑھ جلا۔ سچ مچ کا تہوار تو اب کی بار ہی ہوا۔''

حاجی ابراہیم اور ٹھاکر جسونت سنگھ ایک لفظ نہ بول سکے اور نوکر بولتا رہا۔'' (خدشہ)

فسادات پر لکھے گئے افسانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فسادات کے خونی واقعات کو براہ راست بیان کرنے کے بجائے اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے خوف وہراس کی کیفیت کو بیان کرنے پر توجہ دی ہے۔ ان فسادات کا حل ان کی نظر میں یہ ہے کہ سب مل جل کر اس دھرتی پر ایک ساتھ رہیں، کسی کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ ہو۔ ابن کنول کا مشہور افسانہ 'تیسری دنیا کے لوگ' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں فسادات کی قتل و غارگری کی وجہ سے اپنے مستقبل سے مایوس ہوکر لوگ مشترکہ خودکشی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ راستے میں انھیں ایک بزرگ ملتے ہیں اور انہیں اس بزدلانہ عمل سے روکتے ہیں:

''تم نافہم ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمھارے بعد اور بستیاں جلیں اور تمھاری طرح ان بستیوں کے لوگ بھی خود کو سمندر کے حوالے کردیں اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔''

آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اگر خدا ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمارے فعل سے ہمیں روکتا کیوں ہے؟ ان کے غصے میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی تھی۔

''یہ زمین تم لوگوں کے لیے بنائی گئی لیکن تم نے اسے بانٹ لیا۔ تم نے اس زمین پر خونریزی کی، شر پھیلایا، کیا اب بھی تم خدا سے امید کرتے ہو کہ وہ تمھاری مدد کرے گا۔ اس نے تمھیں زمین پر خودمختار بنایا پھر وہ کیوں تمھاری مدد کرے۔''

''اپنے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہم خودکشی کررہے ہیں۔''

''لیکن خودکشی کرنا زندگی سے فرار ہے اور زندگی سے فرار کم ہمتی اور بزدلی ہے۔ کیا تم بزدل ہو؟ پیر مرد نے استفسار کا۔''

''نہیں۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔''

''مجبوری کم ہمتی کا دوسرا نام ہے۔ جاؤ اپنا حق مانگو، زمین تم سب کے لیے ہے۔''

''لیکن، ہم تعداد میں کم ہیں اور بے یار ومددگار ہیں۔''

''کیا تم تین سو تیرہ سے زیادہ ہو۔ کیا تم تین سو تیرہ کی فتح کے بارے میں نہیں جانتے۔ (تیسری دنیا کے لوگ)

یہاں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ ابن کنول نے بزرگ کی زبانی یہ نہیں کہا کہ تم مظلوم یا ظالم ہو۔ انھوں نے بغیر کسی جانب داری کے کہا کہ ملک میں امن امان قائم کرنے کی ذمے داری سب کی ہے۔ زمین کو مذہب اور ذات کی بنیاد پر تقسیم کرنے کے ذمے دار سبھی ہیں خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ انھوں نے اس افسانے کے ذریعے فسادات کا ایک مستقل حل پیش کیا ہے وہ یہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اپنے حق کے لیے کھڑے ہوکر لڑنا ہی اس مسئلے کا پائیدار حل ہوسکتا ہے۔

ابن کنول نے اپنے ایک افسانہ نما مضمون 'میں کیوں لکھتا ہوں' میں اپنی افسانہ نگاری کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسلم میری اس بات پر ہنسا اور پوچھنے لگا:

''تم کہانیاں کیوں لکھتے ہو؟''

اس کے اِس سوال پر میں اسے غور سے دیکھا اور کہا ''میں دنیا کو آئینہ دکھانا چاہتا ہوں دنیا جو بہت خوبصورت ہے لیکن آدمی کی شرپسندی نے اسے جہنم بنادیا ہے''۔

''کیا تمھارے کہانیاں لکھنے سے دنیا جنّت بن جائے گی''

''نہیں۔ لیکن میں خود سے شرمندہ نہیں رہوں گا۔ اس لیے کہ میں برائی کو دیکھ کر خاموش نہیں ہوں۔ کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار کرتا ہوں۔'' (میں کیوں لکھتا ہوں)

ابن کنول کے زیادہ تر افسانے اخلاق کی انھیں اعلی قدروں کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں جس کو انھوں نے خود اپنی زندگی میں برتا ہے۔ 'نیا درندہ' اور 'خوف' میں ابن کنول نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اپنی سرکشی کی وجہ سے اتنا خونخوار ہوگیا ہے کہ اب انسانوں کو درندوں سے زیادہ خود انسانوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ جھوٹے گڈریے کی کہانی ہمارے لوک ادب کا حصہ ہے۔ ابن کنول نے اسی کہانی سے اپنے افسانے 'نیا درندہ' کا خمیر تیار کیا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''اپنے ساتھی بچّوں کو ڈراتے ڈراتے اس کی عادت سی بن گئی تھی، وہ ہر روز جنگل سے گاؤں کی طرف یہ کہتا ہوا دوڑا چلا آتا تھا:

''شیر آیا... شیر آیا۔''

وہ گڈریے کا لڑکا تھا اور اس نے گڈریے کے لڑکے کی کہانی سن رکھی تھی، جو برسوں سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھی۔ وہ اپنی بکریوں کے ساتھ دن بھر جنگل میں رہتا تھا، جنگلی جانوروں کا خوف اس کے دل سے محو ہوچکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب شیر کبھی نہیں آئے گا، سارے شیر بوڑھے ہوچکے ہیں یا چڑیا گھروں میں قید ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ سب کو ڈرانا چاہتا تھا۔ اس کی آواز سن کر اکثر لوگ اس کا مذاق بناتے تھے، وہ پھر بھی پرامید تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوگا۔ ایک مرتبہ اس کی آواز سن کر احمد حسین نے اپنے بچّوں سے کہا:

''یہ لڑکا بھی پاگل ہوگیا۔ ایسے چلاّتا ہے جیسے شیر اس کے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اب کہاں شیر؟ اب تو شیر کا بچّہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ شیر تو انگریز بہادر کے زمانے میں تھے۔'' (نیا درندہ)

گڈریا پریشان تھا کہ آخر کوئی شیر، بھیڑیے اور لکڑ بگھے کے نام سے ڈرتا کیوں نہیں ہے؟ آخر اس کو ایک ترکیب سوجھی وہ پہاڑی سے چلاتے ہوئے گاؤں کی طرف بھاگا:

''بھاگو... بھاگو... بلوائی آگئے... دنگائی آگئے... بھاگو۔''

اس کی یہ آواز جیسے ہی لوگوں کے کانوں سے ٹکرائی پورے گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ بے تحاشہ اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ پلک جھپکتے ہی گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہوگئے۔ لوگ اپنی بہو، بیٹیوں اور بچوں کو محفوظ جگہوں پر چھپانے لگے۔ بازار بند ہوگئے۔ ذرا سی دیر میں چاروں طرف سنّاٹا ہوگیا۔ دہشت اور وحشت سڑکوں پر منڈلانے لگی۔ گڈریے کا لڑکا ایک گوشے میں خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔'' (نیا درندہ)

گویا کہ انسان اپنی درندگی میں اصلی درندوں سے بھی آگے نکل گیا ہے۔

ابن کنول کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'اپنے ملے اجنبی کی طرح' ہے جو 1974 میں سکندرآباد سے نکلنے والے رسالہ 'آفتاب سحر' میں شائع ہوا تھا۔ علی گڑھ میں قاضی عبدالستار کی سرپرستی میں ان کا ادبی سفر شروع ہوا جو زندگی کے آخری مرحلے تک جاری رہا۔ انتظامی مشغولیت کی وجہ سے بعد میں انھوں نے افسانے کی طرف توجہ کم کردی تھی۔ لیکن گاہے بگاہے وہ افسانے لکھا کرتے تھے۔ ابن کنول کے افسانے فنی لحاظ سے سیدھے سادے کرداروں پر مبنی اور قصہ پن سے بھرپور ہوا کرتے ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ افسانے کی ابتدا دلچسپ اور خاتمہ معنی خیز ہو۔ وہ اپنے ہر افسانے کے ذریعے کوئی نہ کوئی اہم پیغام قاری کو دینا چاہتے تھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تخلیقات کی وجہ سے وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

حوالہ جات

تیسری دنیا کے لوگ: ابن کنول 1884
بند راستے: ابن کنول 2000
ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار: عزیر احمد 2014
www.ibnekanwal.com

■

Dr. Uzair Ahmad
Asst Professor,
Islampur College (North Bengal University)
Rd, Babupara, Islampur- 733202 (WB)
Mob.:9210919540

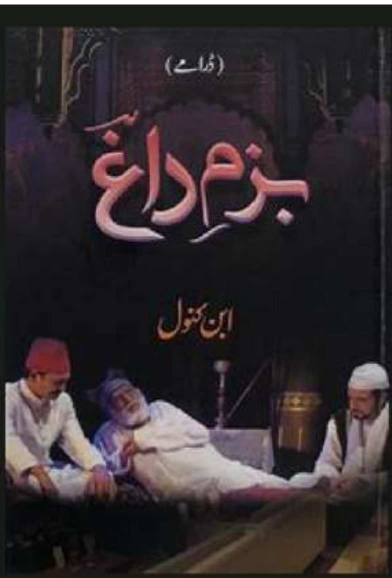

شبیر احمد لون

وہ گیا جس سے بزمِ اردو تھی روشن
پروفیسر ابن کنول

پروفیسر ابن کنول جن کا اصل نام ناصر محمود کمال اور قلمی نام ابن کنول ہے، کی پیدائش 15 اکتوبر 1857 کو ضلع مراد آباد کے قصبہ بہجوئی میں ہوئی۔ ان کے اجداد مغلیہ دور کے حکمران شاہجہاں کی حکومت میں ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہ نے ان کو قاضی کے عہدے پر فائز کیا اور جاگیر بھی دی۔ بعد میں یہ خاندان ڈبائی قصبہ میں آ کر رہائش پذیر ہوا۔ پروفیسر ابن کنول کی عظیم المرتبت شخصیت کے پیچھے جو عناصر کارفرما ہیں ان میں سب سے پہلے پروفیسر صاحب کا خاندان ہے جن کی تربیت و پرورش نے انھیں ایک قابل قدر تخلیق کار بنایا۔ پردادا قاضی ادہم علی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، دادا قاضی شریعت اللہ ایک قابل وکیل اور والد قاضی شمس الدین کنول ڈبائیوی ایک مشہور شاعر اور لوک ناٹک روایت کے علمبردار تھے، انھوں نے دو شعری مجموعے 'بساطِ زیست' اور 'سوز وطن' لکھے ہیں۔ اس طرح جس قصبے میں پروفیسر ابن کنول نے بچپن گزارا وہاں کی ادبی فضا بھی نہایت بلند و بالا تھی جس کے اثرات بھی ان کی شخصیت پر پڑے۔ یہ ادبی فضا جن بزرگوں اور ادیبوں سے پر تھی ان میں وفا ڈبائیوی، دعا ڈبائیوی، انتظار حسین، امید فاضلی، ندا فاضلی اور منیب الرحمان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کی شخصیت کو نکھارنے کے پیچھے جو ایک اور محرک کارفرما ہے وہ گنور سے منٹو سرکل، منٹو سرکل سے پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لے کر دہلی یونیورسٹی تک اساتذہ کی وہ پود ہے جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور جن کی تربیت نے پروفیسر صاحب کو کھرا سونا بنا دیا۔ ان میں حاجی صفدر علی، منشی چھٹن، پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر خلیل الرحمن عظمی، پروفیسر شہر یار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر ابن کنول کے احباب کی صحبت نے بھی پروفیسر صاحب کی شخصیت کو سدا بہار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان رفیقوں اور قرابت داروں میں شارق ادیب، سید محمد اشرف، غضنفر، پیغام آفاقی، طارق چھتاری، غیاث الرحمان، صلاح الدین پرویز، آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، اسعد بدایونی، مہتاب حیدر نقوی وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر ابن کنول کا تعلیمی سلسلہ گنور کے پرائمری اسکول سے 1962 میں شروع ہوا اور پانچویں کے بعد 'منٹو سرکل' میں داخلہ لیا جہاں سے 1972 میں دسویں کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد سائنس میں داخلہ لیا لیکن طبیعت اس جانب نہ گئی اور بی اے کیا۔ 1978 میں علی گڑھ سے ایم اے اردو کیا۔ بعد میں پروفیسر ابن کنول نے دہلی کا رُخ کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دہلی کے ہو کر رہ گئے۔ پی ایچ ڈی تنویر احمد علوی کی نگرانی میں 1984 میں 'بوستانِ خیال کا تہذیبی و لسانی مطالعہ' کے موضوع پر مکمل کیا۔ بعد میں دہلی یونیورسٹی میں ہی بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ کام شروع کیا۔ 1987 سے 1990 تک یہ سلسلہ جاری رہا اور 1990 میں مستقل لیکچرر کے طور پر کام شروع کیا۔ 1998 میں آپ یونیورسٹی کے ریڈر منتخب ہوئے اور 2006 میں لیکچرر سے ترقی کر کے پروفیسر بن گئے۔ 2005 سے لے کر 2008 تک شعبہ اردو کے صدر

بھی رہے اور سال 2022 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر ابن کنول کی زیرِ نگرانی 38 طلبا و طالبات نے ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مکمل کیں۔ 37 سال تک آپ درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ چند روز قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائیوا کے لیے گئے تھے۔ وائیوا کے بعد علی گڑھ میں ہی جمال پور علاقے میں قریبی عزیزوں سے ملاقات کی غرض سے گئے ہوئے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑ گیا اور اے ایم یو کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج لے جایا گیا جہاں 11 فروری 2023 کو آخری سانس لی۔

پروفیسر ابن کنول ایک شریف النفس، ملنسار، خوش خلق، ہنس مکھ اور سادہ گو شخص تھے۔ جب بھی بات کرتے تھے نہایت باریکی اور ٹھہراؤ کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ استاد کم دوست زیادہ لگتے تھے۔ انتہائی باکمال، باصلاحیت اور باذوق تخلیق کار تھے۔ تحقیق وتنقید میں اعلیٰ مرتبت، درس و تدریس میں ماہر اور ایک زود نویس قلم کار کے بطور تقریباً 29 سے زائد کتابیں تصنیف و ترتیب دیں۔ اردو ادب میں پروفیسر ابن کنول ایک جدید افسانہ نگار کے بطور جانے جاتے ہیں لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتیں جس صنف کو ہاتھ لگاتی ہیں وہ ان ہی کی ہو جاتی ہے۔ ان کی تخلیقی کاوشوں میں افسانے، ڈرامے، خاکے، انشائیے، تنقیدی مضامین، سفر نامے اور نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کی ادبی خدمات کے تئیں انھیں مختلف مراحل پر ادبی انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔

ادب کے میدان میں پروفیسر ابن کنول نے طالب علمی کے زمانے میں ہی قدم رکھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب 'انجمن اردوئے معلیٰ' (یہ وہی انجمن ہے جس کی بنیاد حسرت موہانی نے ڈالی تھی) کے سیکرٹری بنے تو اسلم حنیف سے متاثر ہو کر انھوں نے انسان کے چاند پر قدم رکھنے پر پہلی نظم کہی جو ماہنامہ 'نور' رامپور میں شائع ہوئی۔ لیکن جلد ہی پروفیسر صاحب نے اندازہ لگایا کہ ان کا حقیقی میدان افسانہ ہے اور اپنی پوری توجہ افسانہ نگاری پر صرف کی۔ ادبی دنیا میں ان کا قدم رکھنے کے پیچھے ان کے گھر کا ماحول اور دوستوں کا خاصا اہم کردار ہے۔ وہ خود بتاتے ہیں:

''جیسا کہ میں نے کہا کہ گھر میں ادبی ماحول تھا، پھر بچپن ہی سے کچھ دوست بھی ایسے ملے، اسکول ہی کے زمانے میں شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں، گنور میں اس وقت مشاعرے بہت ہوتے تھے۔ علامہ ابراحسنی گنوری اس وقت موجود تھے۔ والد مرحوم مشاعروں میں شرکت کرتے تھے، میں بھی شریک ہوتا تھا۔ علی گڑھ آنے کے بعد باقاعدہ افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ علی گڑھ کے ماحول کا بہت اثر ہوا۔''

(بحوالہ 'اردو فکشن اور علی گڑھ'، ڈاکٹر فرح جاوید ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2012، ص 252)

ابتدا میں آپ ناصر کمال کے نام سے افسانے لکھتے تھے۔ بعد میں ابن کنول کے نام سے لکھتے رہے۔ پروفیسر ابن کنول نے 1972 میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور 1974 میں ان کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'اپنے ملے اجنبی کی طرح' رسالہ 'آفتاب سحر' سکندر آباد میں شائع ہوا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب کے افسانے ملک کے مختلف ادبی رسائل (شاعر، عصری ادب، آہنگ اور نشانات وغیرہ) میں لگاتار شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں میں اساطیری اور تخیلی ادب کی کارفرمائی سے کہانیوں کا رنگ داستانوی ہو گیا ہے لیکن قصہ اور لطفِ خاص سے بھرپور یہ کہانیاں قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ پروفیسر ابن کنول اپنے افسانوں میں عموماً ثقافتی اسالیب کی مہم جوئی میں مصروف نظر آتے ہیں۔

1976 میں ان کا ایک اور افسانہ 'بند راستے' رسالہ 'عصری ادب' میں شائع ہوا تو ڈاکٹر محمد حسن نے داد و تحسین دی جس نے پروفیسر ابن کنول کے حوصلے میں اضافہ کیا۔ جون 1984 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'تیسری دنیا کے لوگ' جمال پرنٹنگ پریس، دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل 15 افسانے شامل ہیں۔ 2000 میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'بند راستے' ہم قلم پبلی کیشنز، دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں افسانے شامل ہیں۔ 2014 میں افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'پچاس افسانے' کتابی دنیا، دہلی سے شائع ہوا جس میں پچھلے دو مجموعوں میں شامل سبھی افسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ نئے افسانے شامل ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کی کامیاب افسانہ نگاری کے پیچھے ان کے استاد قاضی عبد الستار کا ہاتھ ہے۔ اس بات کا اعتراف بھی پروفیسر صاحب نے خود کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''دیکھیے مجاز نے تقریباً سبھی کو متاثر کیا ہے۔ میرے اوپر رشید احمد صدیقی اور قاضی عبد الستار کا بہت اثر رہا۔ رشید احمد صدیقی تو واقعتاً قابل تقلید ادیب تھے اور قاضی عبد الستار کے قدموں میں بیٹھ کر تو میں نے افسانہ لکھنا سیکھا۔ مجھے قاضی صاحب کے اسلوب اور موضوع نے بہت متاثر کیا۔ میرے زمانے کے علی گڑھ کے میرے ہم عمر تقریباً سبھی افسانہ نگاروں نے قاضی صاحب کا اثر قبول کیا۔''

(بحوالہ 'اردو فکشن اور علی گڑھ'، ڈاکٹر فرح جاوید ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2012، ص 253)

صنف 'ڈراما نگاری' میں بھی پروفیسر ابن کنول نے دو مجموعے لکھے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'پہلے آپ' 2008 میں شاع ہوا اور 2020 میں 'بزم داغ' کے عنوان سے دوسرا مجموعہ شائع ہوا، جس میں 4 ڈرامے شامل ہیں۔ اس میں ایک اہم ڈراما 'بزم داغ' اردو کے مشہور شاعر داغ دہلوی کی زبانی پیش کیا گیا ہے جس میں داغ ہی راوی ہیں اور مرکزی کردار بھی۔

پروفیسر ابن کنول ایک معتبر محقق ہیں انھوں نے انتہائی چابکدستی سے تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور اپنے شاگردوں کو بھی صحیح سمت میں تحقیق کی تلقین کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب کی تحقیقی خدمات میں سب سے پہلے 'ہندوستانی تہذیب (بوستان خیال کے تناظر میں)' ہے جو ان کی پی۔ایچ۔ڈی کا موضوع بھی تھا، 1988 میں اردو اکیڈمی، دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو پروفیسر ابن کنول نے اپنے استاد پروفیسر قمر رئیس کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ 'پروفیسر مونس رضا' نے لکھا ہے۔ چوں کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں پروفیسر ابن کنول نے پی ایچ ڈی مکمل کیا اور سند کے طور پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے 'سخن در سخن' کے عنوان سے چند کلمات لکھے ہیں۔ اپنی اس تحقیقی کاوش میں پروفیسر ابن کنول نے پہلے داستان گوئی کے فن پر مکمل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد بوستان خیال کا تعارف پیش کیا ہے۔ اگلے ابواب میں پھر اس عہد کا سیاسی پس منظر، تہذیبی اقدار، معاشرتی حالات، شکوہ سلطنت، تفریحات، اخلاقی اقدار، اعتقادات، رسم ورواج اور فنون لطیفہ پر مفصل گفتگو کر کے مختلف دریچوں کو وا کیا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کی تحقیقی خدمات میں ایک اہم کارنامہ 'داستان سے ناول تک' ہے۔ یہ کتاب 2001 میں بھارت آفسیٹ پریس، دہلی سے اور پھر اضافہ شدہ ایڈیشن کے ساتھ 2003 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی داستان کے فن پر اور اردو کی مختلف ومشہور داستانوں (سب رس، قصہ مہر افروز و دلبر، نوطرزِ مرصع، عجائب القصص، باغ و بہار، مذہبِ عشق، فسانہ عجائب اور بوستان خیال) کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اضافہ شدہ ایڈیشن میں داستان ایک عوامی صنف، اردو داستانوں میں ہندوستان کی تہذیب، داستانوی طریقہ اظہار اور مختصر افسانہ، بوستان خیال کا لسانی مطالعہ اور فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کو پیش کر کے اردو فکشن کی وسعتوں میں اضافہ کیا۔ پروفیسر ابن کنول تنقید

کی نسبت تخلیق اور تحقیق پر زیادہ زور دیتے تھے۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تحقیقی مقالات کی اہمیت سائنس میں بہت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ وہاں نئی ایجادات کے امکانات رہتے ہیں لیکن ادب میں اس کا اطلاق کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن یہی ہو رہا ہے،جس کی وجہ سے تخلیق کار بڑا فنکار ہونے کے باوجود بھی نقاد کے پیچھے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔سمیناروں میں تخلیق کاروں کو کم دعوت دی جاتی ہے اور ناقدین ان کی تخلیقات پر اپنا حلوہ مانڈہ پکاتے ہیں۔''

(پیش لفظ) تنقید و تحسین، پروفیسر ابن کنول، کتابی دنیا، دہلی 2006،ص 8)

اردو تحقیق کے میدان میں پروفیسر ابن کنول کا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کا پہلا ناول 'مراۃ العروس' نہیں بلکہ منشی گمانی لعل کی 'ریاض دلربا' ہے۔

تحقیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ پروفیسر ابن کنول تنقیدی بصیرت رکھتے تھے۔تنقید نگاری کے میدان میں پروفیسر صاحب نے نادر نمونے پیش کر کے اردو تنقید نگاری کو مزید وسعت بخشی۔ان کے تنقیدی رویے کو دیکھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایک منجھے ہوئے تنقید نگار تھے۔تنقید نگاری کے ضمن میں پروفیسر ابن کنول کی متعدد کتابیں ہیں لیکن بنیادی طور پر 'تنقید و تحسین (2006)'، 'اردو افسانہ (2011)، تنقیدی اظہار (2015)، اردو شاعری (2019) اور داستان کی جمالیات (2020) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

'تنقید و تحسین' اگرچہ مضامین کا مجموعہ ہے،جس میں 18 مضامین شامل ہیں لیکن تمام مضامین تنقیدی بصیرت سے تیار کیے گئے ہیں۔خود پروفیسر ابن کنول کے نزدیک یہ مجموعہ تنقید نگاری نہیں بلکہ ذاتی تسکین کا سامان ہے لیکن ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ صاف ہو جاتا ہے کہ پروفیسر ابن کنول نہایت باریک تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔سرسید اور ان کے عہد سے لے کر مراثی انیس و دبیر کے ساتھ ساتھ خطوط غالب، مصحفی کے جائزے اور ہم عصر پاکستانی ادب تک بات کرتے ہوئے بھرپور تنقیدی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔اسی طرح 'اردو افسانہ' جو کتابی دنیا، دہلی سے 2011 میں شائع ہوئی، میں بھی افسانہ نگاری کے مختلف دریچوں کو وا کر کے قارئین کو صنف افسانہ کی بھرپور سیر کرائی ہے۔پریم چند، علی عباس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ابن کنول نے ان افسانہ نگاروں کے معروف افسانوں کو پیش کر کے آنے والی نسل کے لیے راہیں ہموار کیں۔

تیسری کتاب 'تنقیدی اظہار' بھی کتابی دنیا، دہلی سے سال 2015 میں شائع ہوئی اس کتاب میں 19 مضامین شامل ہیں۔اس کے بھی تمام مضامین تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے ہیں۔بہر حال تنقید نگاری کے حوالے سے پروفیسر ابن کنول کا نظریہ بالکل واضح ہے۔شارب ردولوی سے متعلق خاکے میں فرماتے ہیں:

''اگر نقاد نہ ہوں تو کوئی طالب علم کسی امتحان میں پاس نہیں ہو سکتا۔ولی، میر، غالب اور اقبال کو تو چھوڑیے ناصر کاظمی جیسے سہل ممتنع کے شاعر کو بھی سمجھنے کے لیے نقاد کی ضرورت ہوتی ہے۔عہد حاضر میں ولی کے کلام کو تو خود دکن کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔بھلا ہو ڈاکٹر شارب ردولوی کا انہوں نے ولی اور ان کی شاعری پر اتنا تفصیل سے لکھ دیا کہ طالب علموں کو امتحان کے لیے ولی کا کلام پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

(اخبار (قومی آواز)، نئی دہلی، مضمون نگار (جمال عباس فہمی)، 13 فروری 2023)

پروفیسر ابن کنول کی تخلیقی کاوشوں میں افسانے، ڈرامے، تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ خاکے، انشائیے اور سفرنامے بھی شامل ہیں۔خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کی عمر ان کی افسانہ نگاری، تحقیق و تنقید نگاری سے کم ہے لیکن پچھلے تین چار برسوں کے دوران انھوں نے خاکہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا ہے۔خاکہ نگاری میں ان کی کتاب 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' ہے جو 2020 میں کتابی دنیا، دہلی سے شائع ہوئی۔یہ مجموعہ پروفیسر ابن کنول نے عالمی وبائی بیماری کووڈ 19 اور ملک گیر لاک ڈاؤن کے دوران تحریر کیا۔چونکہ آدمی کا باہر نکلنا مشکل تھا اور عالم انسانیت گھروں کے اندر محصور ہو کر رہ گئی تھی،جس کے نتیجے میں پروفیسر ابن کنول یہ خوبصورت کتاب قارئین کے سامنے رکھنے میں کامیاب ہوئے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس نظر بندی میں مجھے میرے اپنے یاد آئے، جن سے میرا خون کا رشتہ نہیں لیکن دل کا رشتہ تھا۔اور دل کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔میں نے انھیں قلم کے ذریعے یاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔12 اپریل کو 'داستان کی جمالیات' کا پیش لفظ لکھ کر کتاب مکمل کی اور 14 اپریل سے خاکے لکھنے شروع کر دیے۔سب سے پہلے اپنے پرائمری اسکول کے استاد کو یاد کیا۔پھر اسکول کے ہم جماعت کی یاد آئی۔پھر علی گڑھ اور دہلی کے اساتذہ کو یاد کیا۔ہر روز ایک خاکہ لکھا، پھر سوچا کہ محنت کیوں رائیگاں جائے،

1 تیسری دنیا کے لوگ 1984
2 ہندوستانی تہذیب (بوستان خیال کے تناظر 1988
3 ریاض دلربا (مرتب) 1990
4 آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ) 1993
5 سیرت مسیح (مرتب) 1998
6 بند راستے 2000
7 داستان سے ناول تک 2001
8 داستان سے ناول تک (اضافہ شدہ) 2003
9 انتخاب سخن (اردو شاعری کا نیا انتخاب) 2005
10 منتخب غزلیات (امیر خسرو سے ناصر کاظمی تک)، 2005
11 منتخب نظمیں 2005
12 اصناف پارینہ (مثنوی، قصیدہ، مرثیہ)، (مرتب) 2005
13 تنقید و تحسین (مضامین) 2006
14 تحقیق و تدوین، (مرتب) 2006
15 باغ و بہار (مقدمہ و متن)، (مرتب) 2008
16 پہلے آپ (ڈرامے) 2008
17 نظیر اکبرآبادی منتخب شاعری (مرتب) 2008
18 مضراب (کلیات کنول ڈبائیوی)، (مرتب) 2010
19 اردو افسانہ 2011
20 مونوگراف (میر امن) 2012
21 اردو لوک ناٹک روایت و اسالیب، (مرتب) 2014
22 تنقیدی اظہار 2015
23 فسانہ عجائب۔(مرتب) 2016
24 اہل الکہف (افسانے)، عربی مترجم احمد قاضی، مصر، 2018
25 اردو شاعری (تنقید) 2019
26 بزم داغ (ڈرامے) 2020
27 داستان کی جمالیات 2020
28 کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے) 2020
29 چار کھونٹ (سفرنامے) 2022
30 بساط نشاط دل (انشائیے)
31 تحریک (تقاریظ)

اسے کتابی شکل دے دی جائے، سو کتاب حاضر ہے۔''

(چار کھونٹ، ابن کنول، کتابی دنیا، دہلی 2020، ص 9)

اس مجموعے میں کل 25 شخصیات (معلمین، محبین، مربین، مشفقین اور منسلکین) کے خاکے ہیں۔سب سے پہلا خاکہ 'منشی چھٹن' 14 اپریل 2020 کو لکھا۔منشی چھٹن پروفیسر ابن کنول کے گنور کے پرائمری اسکول میں استاد رہ چکے تھے۔دوسرا خاکہ 'منٹو سرکل' جو اپنی نوعیت کا پہلا خاکہ ہے جس میں پروفیسر ابن کنول نے اسکول اور ہم جماعتوں کی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔یہ وہ اسکول ہے

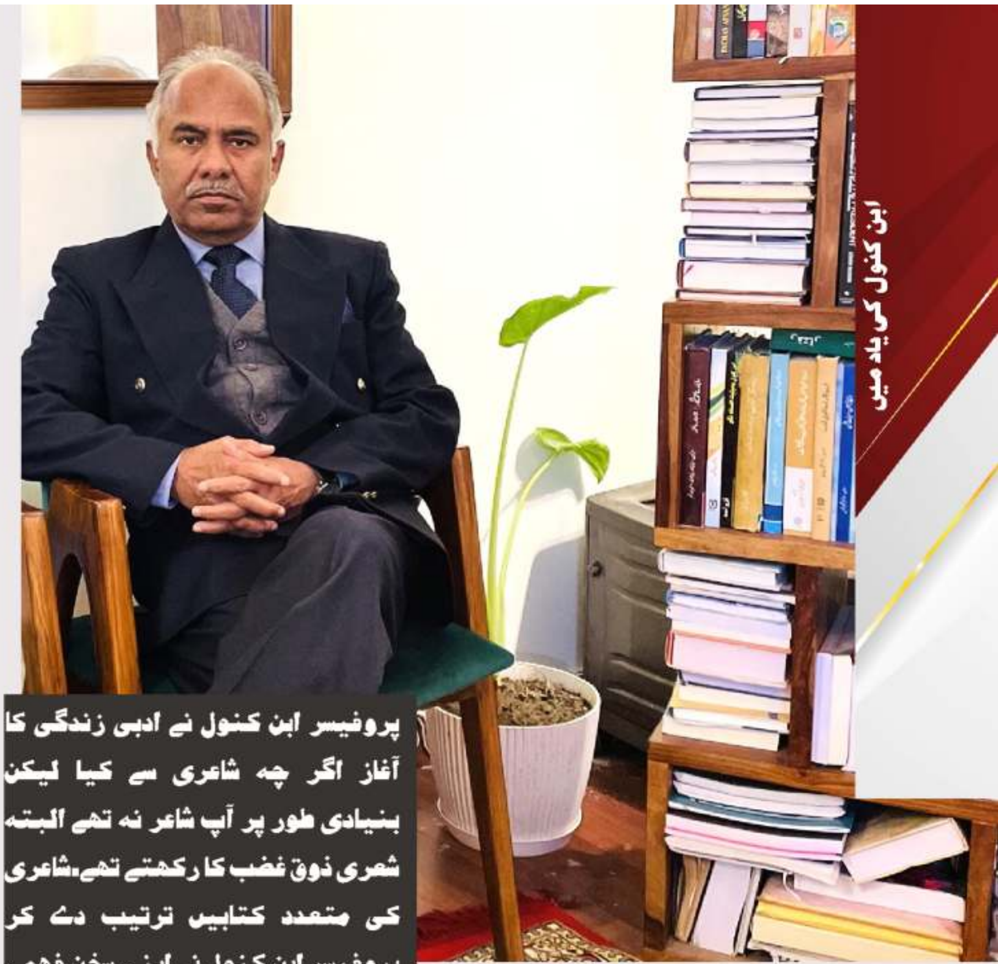

جہاں پرائمری کے بعد پروفیسر ابن کنول کا داخلہ ہوا تھا۔ یہیں سے انھوں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ مذکورہ کتاب میں شامل دیگر خاکے قاضی عبدالستار، قمر رئیس، تنویر احمد علوی، گوپی چند نارنگ، عنوان چشتی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، محمد زماں آزردہ، محمد عتیق صدیقی، پیغام آفاقی، اسلم حنیف اور ارتضیٰ کریم پر مشتمل ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے قارئین کرام کی توجہ اس کتاب کی جانب حلفیہ انداز میں یوں مبذول کرائی ہے:

''جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ یقین کریں یا نہ کریں، آپ کو اختیار ہے۔''

(کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، پروفیسر ابن کنول، کتابی دنیا، دہلی 2020، ص 4)

پروفیسر ابن کنول کی اس تصنیف کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر صاحب نے یہ خوبصورت کتاب تخلیق کر کے اردو خاکہ نگاری کو بامِ عروج وارتقا تک پہنچایا۔ اس کتاب میں شامل خاکوں کے علاوہ پروفیسر ابن کنول کے چند اور خاکے اردو دنیا کی ویب پورٹل 'ادبی میراث' پر دستیاب ہیں جن میں 'خوش گفتار: صدیق الرحمن قدوائی'، 'کتاب دوست: سید شاہد مہدی'، 'سدا بہار پروفیسر اختر الواسع'، 'ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق'، 'خاتونِ مشرق: پروفیسر شمیم نکہت' اور 'خاقانی جامعہ پروفیسر خالد محمود' قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر ابن کنول نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور

پروفیسر ابن کنول نے ادبی زندگی کا آغاز اگر چه شاعری سے کیا لیکن بنیادی طور پر آپ شاعر نه تھے البته شعری ذوق غضب کا رکھتے تھے۔شاعری کی متعدد کتابیں ترتیب دے کر پروفیسر ابن کنول نے اپنی سخن فهمی اور نکته رسی کا بھر پور ثبوت دیا ہے۔اس ضمن میں ان کی ترتیب کرده کتابیں 'انتخابِ سخن(2005)'، 'منتخب نظمیں(2005)'، 'منتخب غزلیات(2005)'، 'اصنافِ پارینه (2005)' اور 'نظیر اکبر آبادی کی منتخب شاعری (2013) لائقِ ستانش ہیں۔اس کے علاوه پروفیسر ابن کنول نے اپنے والد کنول ڈبانیوی کی کلیات کو 'مضراب' کے عنوان سے بھی ترتیب دیا ہے۔

مختلف بین الاقوامی سمیناروں میں بطور خصوصی ممبر کے شرکت کی۔ آپ نے پاکستان، متحدہ عرب امارات، امریکہ، ازبکستان، موریشس، ماسکو اور لندن کا سفر کیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں واقع یونیورسٹیوں کی جانب سے منعقد سمیناروں میں بھی شرکت کی۔ اس کے علاوہ بطور ممتحن بھی آپ نے ملک کی مختلف جامعات کا دورہ کیا۔ اپنے اس سارے سفری سلسلے کو پروفیسر ابن کنول نے 'چار کھونٹ' میں جمع کیا ہے۔ یہ کتاب 2022 میں کتابی دنیا، دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں شامل پہلا سفر 'حج بیت اللہ' سے متعلق ہے۔ اس کے بعد امریکہ، موریشس، لندن (انگلینڈ)، پاکستان (پشاور)، پاکستان (فیصل آباد)، متحدہ عرب امارات، ماسکو، ازبکستان اور پھر اختتامیہ (سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا) لکھا ہے۔ 'چار کھونٹ' کے متعلق محمد زماں آزردہ فرماتے ہیں:

''چار کھونٹ' ابن کنول کے ان سفرناموں پر مشتمل ہے جو انھوں نے سفرِ حج کے علاوہ محض ادبی اجتماعات میں شمولیت کرنے اور اپنے اہل خانہ کو مختلف جگہوں کی سیر و تفریح کرانے کے سلسلے میں کیے ہیں۔ لیکن اپنے ان سفرناموں کے ذریعے ہمیں یعنی قارئین کو شریک کر کے نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ ان کی اپنی شخصیت کے مختلف گوشے اس طرح واضح ہوئے ہیں کہ سامنے نظر آنے والا ابن کنول آنکھوں سے اوجھل ہو کے ایک قدآور، دور دور تک اپنا سایہ پھیلانے والا اور مختلف رنگوں کی روشنیوں کو اپنے اندر جذب کرنے والا ایک محیر العقل ذی روح کا سامنا کرا دیتا ہے۔''

(چار کھونٹ، ابن کنول، کتابی دنیا، دہلی 2022، ص 10)

ابن کنول نے اپنے والد 'کنول ڈبائیوی' کا سفرنامہ 'بحر تجلیات' کو ترتیب دے کر فنِ سفرنامہ نگاری کو مزید تقویت بخشی۔

پروفیسر ابن کنول نے ادبی زندگی کا آغاز اگر چہ شاعری سے کیا لیکن بنیادی طور پر آپ شاعر نہ تھے البتہ شعری ذوق غضب کا رکھتے تھے۔ شاعری کی متعدد کتابیں ترتیب دے کر پروفیسر ابن کنول نے اپنی سخن فہمی اور نکتہ رسی کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ترتیب کردہ کتابیں 'انتخابِ سخن (2005)'، 'منتخب نظمیں (2005)'، 'منتخب غزلیات (2005)'، 'اصنافِ پارینہ (2005)' اور 'نظیر اکبر آبادی کی منتخب شاعری (2013) لائقِ ستائش ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر ابن کنول نے اپنے والد کنول ڈبائیوی کی کلیات کو 'مضراب' کے عنوان سے بھی ترتیب دیا ہے۔

بہرحال پروفیسر ابن کنول کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے جس کو اس مختصر سے مقالے میں قید کرنا ناممکن ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پچھلی پانچ دہائیوں پر محیط ہیں اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ لکھتے رہے۔ ان کی ہر تخلیق اور ہر قدم ایک نئی منزل کا پتا دیتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

■

Shabeer Ahmad Lone
R/o: Frisal Kulgam - 192232 (J&K)
Mob.: 9906638397
Email.: shabeerlone2018@gmail.com

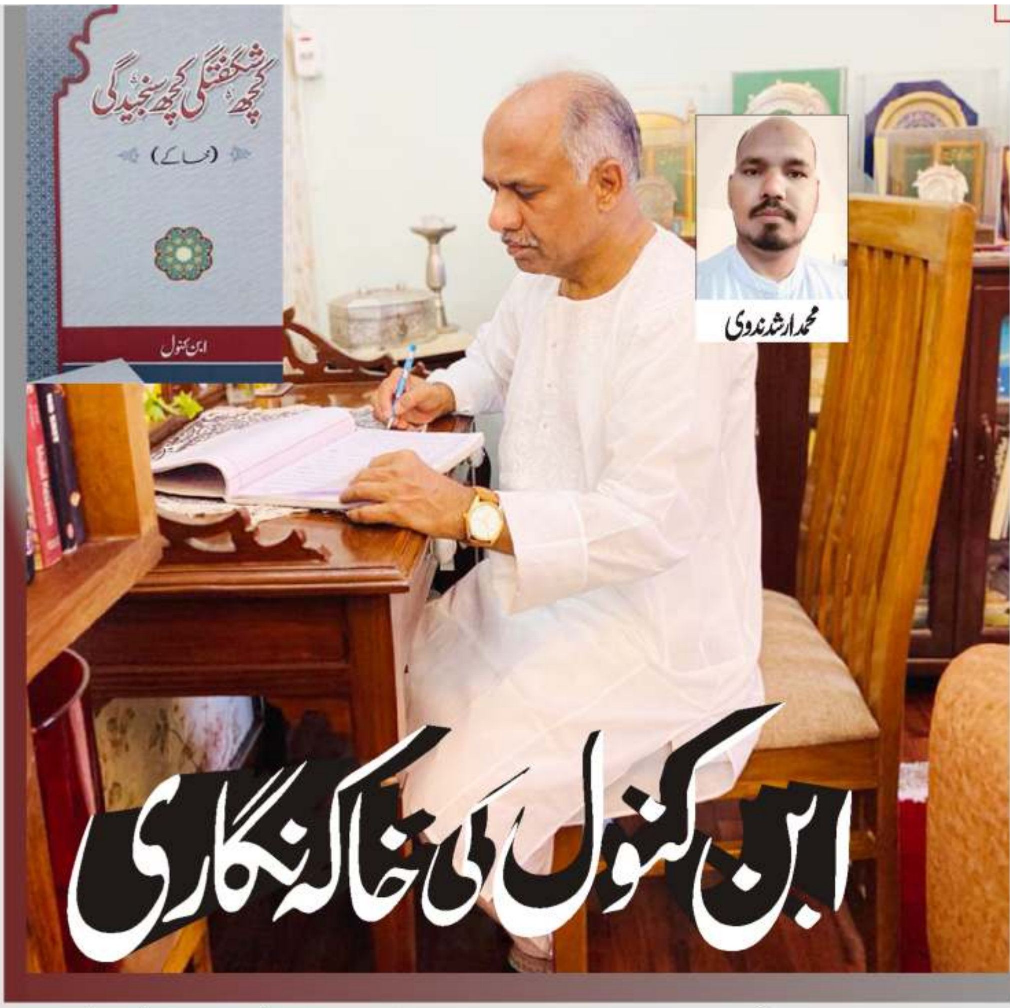

محمد ارشد ندوی

ابن کنول کی خاکہ نگاری

اردو کی جدید اصناف نثر میں ایک اہم صنف خاکہ نگاری بھی ہے۔ بقول ابن کنول:

''خاکہ نگاری بہت ہی نازک صنف ہے، شیشہ گری ہے۔ ذرا سی لغزش سے خاکہ نگار بھی اور وہ شخصیت بھی جس پر خاکہ لکھا گیا ہے، برباد ہو سکتے ہیں۔ غزل کی طرح اس میں اشاروں اور کنایوں میں بات کی جاتی ہے۔ جو شخص اشاروں میں بات نہیں کر سکتا وہ خاکہ نہیں لکھ سکتا۔ خاکہ میں مختصر الفاظ میں مکمل شخصیت پیش کرنی ہوتی ہے۔ تحریر کو دلچسپ بنانا بھی ضروری ہے ورنہ کوئی قاری کسی کے بارے میں کوئی تحریر کیوں پڑھے گا..... اس لیے مزاح کی چاشنی ضروری ہے۔''

(کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، ص10)

وہیں ابن کنول یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک اچھے خاکہ نگار کو چاہیے کہ وہ ایمانداری کا ساتھ کبھی بھی نہ چھوڑے کیونکہ ہر ذی شعور کے اندر اچھی اور بری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''کسی بھی شخص کی شخصیت خاکہ میں اسی وقت ابھر کر سامنے آسکتی ہے جب اس کی اچھائیوں کے ساتھ اس کی خامیاں بھی بیان کی جائیں۔ یہی خاکہ نگار کی دیانت داری کا تقاضا ہے۔''

قدیم اردو نثر ونظم میں خاکہ نگاری کے نقوش جابجا ملتے ہیں۔ چاہے وہ قصیدہ ہو یا ہجویہ قصیدہ، مثنوی ہو یا مرثیہ۔ فکشن کی اصناف میں ناول، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ میں بھی خاکے کے مختلف نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اگر ابتدائی خاکہ نما نقوش کی بات کریں تو ان میں محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے بعد اس صنف کو مکمل فنی اور ہیئتی مقاصد کے اعتبار سے آگے بڑھانے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، اشرف صبوحی، عبدالمجید سالک وغیرہ ہیں۔ خاکہ نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے والوں میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، محمد طفیل، فکر تونسوی، شوکت تھانوی، مالک رام، شاہد احمد دہلوی کے علاوہ مجتبیٰ حسین، خواجہ احمد فاروقی، عرش ملسیانی، صالحہ عابد حسین، عبدالقوی دسنوی، رضیہ سجاد ظہیر، یوسف ناظم، وہاب عندلیب، سلیمان اطہر جاوید وغیرہ نے طنز ومزاح کے ذریعے اس صنف کو بام عروج پر پہنچایا۔

خاکہ نگاروں کی اس فہرست میں ایک نام ابن کنول کا ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' ہے جس میں 25 خاکے ہیں۔ ہر خاکے میں کچھ شگفتگی کی جھلک پائی جاتی ہے تو کہیں سنجیدگی کا اظہار ملتا ہے، ان کے تمام تر خاکے شخصیات پر مبنی ہیں، ان میں بعض خاکے اساتذہ کرام، کچھ نامور ہستیوں کی عقیدت میں اور بعض اپنے ہم عصر دوست احباب پر فنکارانہ انداز میں تحریر کی ہیں۔ ابن کنول اپنے خاکوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اس کتاب میں جو خاکے شامل ہیں ان میں میرے قابل احترام اساتذہ ہیں، کچھ ایسی شخصیات ہیں جن سے مجھے عقیدت ہے یا جن کا میں احترام کرتا ہوں، کچھ میرے وہ دوست ہیں جن کے ساتھ زندگی کا طویل سفر طے کیا ہے، کچھ خرد دوست ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ اس میں ایک خاکہ جو میں نے اپنے اسکول 'منٹو سرکل' کے صد سالہ جشن پر لکھا تھا وہ شامل ہے۔ منٹو سرکل میری زندگی کا اہم حصہ ہے۔ آخری خاکہ ایک ملازم پر ہے، اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایسی شخصیات کی کتنی ضرورت ہوتی ہے جنھیں ہم کمتر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔'' (کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، ص11)

تمام تر خاکے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ مطالعے کے دوران تلخ حقائق کو بھی بڑی فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے جو کھلکھلا کر ہنسنے کے بجائے زیر لب مسکراہٹ کے مصداق ہے۔ یہی مہارت خاکوں کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ان کے خاکوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان خاکوں پر مشتمل ہے جس میں ان کے اساتذہ کرام اور وہ افراد ہیں جن سے انھیں عقیدت ہے۔ ان میں منشی چھٹن، قاضی عبدالستار، قمر رئیس، تنویر احمد علوی، گوپی چند نارنگ، حیات اللہ انصاری، عصمت آپا، محمد عتیق صدیقی، عینی، محمد زماں آزردہ وغیرہ اہم ہیں۔

خاکوں کے دوسرے حصے میں ابن کنول نے اپنے ہم عصر دوست واحباب جن میں کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے بھی تھے، ان کو بھی موضوع بنایا ہے، ان میں ارتضیٰ کریم، ایڈووکیٹ اے رحمٰن، علی احمد فاطمی، پیغام آفاقی، فاروق بخشی، خواجہ محمد اکرام الدین، محمد کاظم، عظیم صدیقی، اسلم حنیف، نعیم انیس کے علاوہ ایک خاکہ ایسا بھی ہے انسان کی زندگی میں جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس کے باوجود اس کے بنا کوئی کام بھی نہیں ہوتا ہے، وہ آخری خاکہ 'محمد شریف' کا ہے جو دراصل ایک ملازم ہے۔ اس خاکے کی تحریک انہیں مولوی عبدالحق کی 'نام دیو مالی' اور رشید احمد صدیقی کی 'کندن' سے ملی ہے۔

مجموعہ 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' کا پہلا خاکہ 'منشی چھٹن' ہے۔ ابن کنول کا یہ خاکہ تعلیمی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ انسان کی زندگی میں بہت سے اساتذہ کرام آتے ہیں لیکن چند ہی نقش بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے ابتدائی استادوں میں منشی چھٹن کا کردار بہت اہم ہے جو آرٹ اور

ریاضی کے ماہر استاد ہیں۔ان کی ذاتی صفات اور کردار سے بہت متاثر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی خوبیوں کو بہت سراہا ہے۔اس خاکے کو پڑھنے کے بعد مجھے بھی اپنے استاد محترم پروفیسر ابن کنول کے گفتار و کردار، شفقت و محبت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔دونوں کی زندگی میں یکساں مماثلت پائی جاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسکول کے منشی اور یہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ابن کنول کی زبانی یہ تحریر دیکھیں:

''ہر طالب علم کی زندگی میں استاد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔بعض اساتذہ ذہن پر اپنی شخصیت کے ایسے نقش چھوڑ جاتے ہیں جو تمام زندگی دھندلے نہیں ہوتے، خصوصاً اسکول کے استاد... لیکن چھٹن منشی جی کا چہرہ اور ان کی باتیں اب بھی یاد ہیں۔سنا ہے، بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔میرے ذہن میں وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ان کی وہی صورت اور وہی مشفقانہ باتیں مجھے یاد دلاتی رہتی ہیں۔انسان بچھڑ جاتا ہے لیکن اس کا کردار اسے زندہ رکھتا ہے۔'' (کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، ص 16)

ابن کنول نے 'منٹو سرکل' میں حصول علم کے لیے پانچ سال گزارے تھے۔یہ پانچ سال ان کی زندگی کے ہر دلعزیز تھے۔'منٹو سرکل' دراصل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قدیم اور تاریخی اسکول ہے جو 1909 میں وائسرائے لارڈ منٹو کے مالی تعاون دینے کی وجہ سے اس کا نام 'منٹو سرکل' قرار پایا۔ابن کنول نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس اسکول کی علمی، ادبی، تہذیبی اور روایت کو پیش کیا ہے، ماضی کی یادوں کے ساتھ ساتھ اپنے دوست واحباب اور نامور شخصیات کا بھی ذکر کیا ہے جو سرسید کے خوابوں کی تعبیر ہیں۔اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان کی زندگی میں اس اسکول کی تعلیم و تربیت کا اثر اخیر عمر تک نظر آتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔

''اسکول میں گزارا ہوا وقت کبھی دل سے محو نہیں ہوتا اور پھر منٹو سرکل جیسا اسکول جو ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ایک تہذیبی مرکز ہے، جو سرسید کا خواب ہے اور ہم اس کی تعبیر ہیں۔'' (کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، ص 23)

'قاضی عبدالستار' پر قلم بند کیا گیا خاکہ ابن کنول کا اہم خاکہ ہے۔یہ خاکہ منفرد اسلوب کا ہے۔ابن کنول ان سے بہت متاثر تھے، افسانہ نگاری کی تربیت انہی سے لی تھی کیونکہ قاضی صاحب کا اردو فکشن' ناول اور افسانے میں بہت بڑا نام تھا۔قاضی صاحب بڑے خوددار انسان تھے۔خودی کو ہمیشہ بلند رکھتے تھے، حق گوئی اور بے باکی ان کے خمیر میں تھی۔ابن کنول کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ اپنے خاکے میں یوں کیا ہے:

''قاضی صاحب نے زندگی چاہے 'غالب' کی طرح گزاری ہو، لیکن 'خالد بن ولید' کی طرح رسول خدا سے محبت کرتے، مجاہدانہ انداز 'صلاح الدین ایوبی' جیسا تھا، 'داراشکوہ' سے گنگا جمنی تہذیب کا درس لیا تھا۔وہ 'شب گزیدہ' فنکار 'غبار شب'، میں بھٹکتے ہوئے 'بادل' کو 'مجو بھیا' کا یہ پیغام دیتا تھا کہ اب کسی 'حضرت جان' کا 'پہلا اور آخری خط' نہیں آئے گا۔'پیتل کا گھنٹہ'، 'بس ایک کہانی' بن چکا تھا۔'نیا قانون' آنے کے بعد 'میراث' میں بس ایک 'دیوالی' کا دیا بچا تھا جو 'لالہ امام بخش' نے 'ٹھاکر دوارے' کی 'مالکن' کے آگے رکھ دیا تھا، جس کی مدھم روشنی سے 'تاجم سلطان' کا حسن دمک رہا تھا، لیکن 'بھولے بسرے' کبھی 'مجرئی' ہوتا تھا۔'' (کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، ص 34)

ابن کنول کے کچھ خاکے ایسے ہیں جو انتقال کے بعد لکھے گئے ہیں ان میں ایک خاکہ 'قمر رئیس: ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے' ہے۔اس خاکے میں قمر رئیس کی سوانحی زندگی کی ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے۔ابن کنول اور قمر رئیس کے مابین شاگرد اور استاد کا رشتہ خوب نظر آتا ہے۔علی گڑھ میں قاضی عبدالستار کی سرپرستی رہی تو دہلی میں قمر رئیس رہبر و رہنما اور شفیق انسان کی شکل میں رہے۔ابن کنول اس خاکے میں شوخی و ظرافت کا سہارا لے کر اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔قمر رئیس کی شخصیت کثیر الجہات تھی، فکشن کے اہم ناقد تھے، ترقی پسند تحریک ہمیشہ ان کی وجہ سے فعال رہی اور اچھے شاعر بھی تھے، شاعرانہ مزاج رکھتے تھے، غزل جیسی صفت ان کے خمیر میں پیوست تھی۔ایک جگہ اس شوخ مزاج پر ابن کنول لکھتے ہیں کہ:

''اتنے نرم دل تھے کہ جس نے ہنس کے بات کی، بس اسی کے ہو لیے۔خصوصاً اگر سامنے کوئی صنف نازک ہے تو تمام طاقت لسانی اور شیریں زبانی مع تبسم صرف کر دیتے تھے۔قمر صاحب تو اب دنیا میں نہیں ہیں لیکن جن حسین چہروں کو دیکھ کر وہ باغ و بہار ہو جاتے تھے خواہ مخواہ ان کی رسوائی ہوگی۔پریم چند نے کہا تھا کہ اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔قمر صاحب نے زندگی کا معیار تو بدل لیا لیکن حسن کا معیار جو غزل اور داستان میں تھا وہی رکھا۔'' (ایضاً، ص 47)

ابن کنول نے 'مشکل کشا: محمد کاظم' نامی خاکے میں ان کی شخصیت کو واضح کیا ہے۔آپ ڈرامے کے ماہر استاد ہی نہیں بلکہ ہر فن کے استاد ہیں۔ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اداکار اور ہدایت کار بھی ہیں۔آپ کی شخصیت ہر فن مولا ہے۔ابن کنول اسی ہر فن مولا استاد کو استادی کا مقام متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میں نے غور سے دیکھا، یہ کون ہے؟ یہ تو کاظم ہے، ڈاکٹر محمد کاظم، دہلی یونیورسٹی کے شعبہ 'اردو میں استاد... واقعی یہ استاد ہے ... ہر جگہ استادی دکھا تا ہے۔ہر فن میں استاد ہے۔بنگالی ہے نا، بنگالی تو ہر فن مولا ہوتے ہیں، ڈرامہ بہت کرتے ہیں، بنگالیوں کے لیے زندگی ہی ڈرامہ ہے۔ہر بنگالی خود کو ستیہ جیت رے سمجھتا ہے۔کاظم بھی کچھ ایسا ہی ہے اور ستیہ جیت رے بھی کیا وہ تو ماضی ہے، کاظم تو حال ہے۔'' (ایضاً، ص 226)

ابن کنول کے خاکوں کا مجموعہ 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خاکوں میں ظرافت اور شوخی کا عنصر جا بجا نظر آتا ہے، یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ابن کنول کے زیادہ تر مضامین شخصی خاکے کے زمرے میں آتے ہیں۔ان کے خاکوں میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے اثرات کافی حد تک پائے جاتے ہیں۔ابن کنول نے داستانوی اثرات کے سبب خاکوں میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور تجربات کو خوب برتا ہے۔

'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' میں ابن کنول کا امتیازی وصف یہ ہے کہ طنز کا پہلو تو ہے لیکن اس طنز میں اخلاقی سبق کارفرما ہے۔وہ زبان و بیان کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ان کے خاکوں میں رنگ برنگ کے ادبی اسلوب جلوہ افروز ہے۔زبان و بیان میں شگفتگی اور سنجیدگی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔جملوں اور محاوروں کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔انھیں خوبیوں کے باعث ان کے جملوں میں ندرت اور دلکشی پائی جاتی ہے یہی ان کے خاکوں کی انفرادیت ہے۔اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ ابن کنول کے یہ تمام خاکے نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے اور خاکہ نگاری کی دنیا میں بہترین نمونہ کے طور پر جانے جائیں گے۔

■

Dr. Md Arshad Nadwi
Assistant Professor (Ad-hoc)
Department of Urdu
Dyal Singh College (M),
(University of Delhi)
Lodhi Road, New Delhi-03
Mob:9213307499
Email :arshaddu786@gmail.com

غضنفر اقبال

پروفیسر ابن کنول کا آخری انٹرویو

پروفیسر ناصر محمد کمال ابن کنول (1957-2023) ادیب باکمال تھے۔ان کا تحریر کردہ ادب آئینہ روشن ہے جس پر مرحوم کے نشانات اور نقوش گہرے ہیں۔ (غ الف)

غضنفر اقبال: مرحوم کنول ڈبائیوی ایک معروف قومی شاعر اور آپ کے والد گرامی تھے،آپ نے والد محترم کے سلسلے میں قابل قدر کام بھی بحسن وخوبی انجام دیے ہیں، کنول ڈبائیوی کے فکر وفن کی دور حاضر میں کیا معنویت ہے؟

ابن کنول: میرے والد کنول ڈبائیوی تھے،جن کا پورانام قاضی شمس الحسن تھا،اوران کا قصبہ ڈبائی ضلع بلندشہر سے تعلق تھا، جہاں کے انتظار حسین، منیب الرحمٰن، ندافاضلی اور وفاڈبائیوی وغیرہ بہت سے شاعر گذرے ہیں، دراصل جس زمانے میں والدصاحب نے شاعری کی ابتدا کی، وہ جدوجہدآزادی کا زمانہ تھا،اس لیے ان کی شاعری میں نہ جدوجہد آزادی اور وطن پرستی کا جذبہ خاص طور سے ابھر کر آیا،حب الوطنی دراصل وطن کی ہر چیز سے محبت کے اظہار کانام ہے،والدصاحب نے جدوجہد آزادی میں شرکت بھی کی،اوراسی لیے آزادی کی تحریک میں شامل ہوکر دوبار جیل بھی گئے۔ان کی شاعری آج بھی معنویت رکھتی ہے،آج بھی ہمارے ملک کوقومی یکجہتی کی ضرورت ہے۔ دلوں سے نفرتیں دور کرنے کی ضرورت ہے، وطنی شاعری یاقومی یکجہتی کی شاعری کی اہمیت ہر زمانے میں رہتی ہے،چاہے وہ حالی ہوں،سرور جہان آبادی ہوں، اقبال ہوں، جگن ناتھ آزاد ہوں یا اورایسے شاعر ہوں جنھوں نے وطن پرستی یا قومی یکجہتی کے گیت گائے ہیں،شاعری کی ہے،اس کی اہمیت ہر زمانے میں ہوتی ہے،ایک نظم ہے،والدمحترم کی کہ۔

ملک میں آج جو ہیں بھائی کے بھائی کے دشمن
ہیں حقیقت میں وہی اپنے وطن کے رہزن
اس کا ارباب خرد دیں مجھے معقول جواب
فائدہ بخشے گا کیا ملک کو یہ ان کا چلن
ملک میں ایسے ہی بیراگ سے خطرہ ہے تمھیں
دل میں نفرت کی نہاں آگ سے خطرہ ہے تمھیں
آستینوں میں پلے ناگ سے خطرہ ہے تمھیں

یہ شاعر کی خواہش یاشاعر کاانتباہ کہ ہمارے دلوں میں جونفرت پیداہورہی ہے،وہ ملک کے لیے خطرناک ہے،اسی نظم میں آگے ہے۔

کیا تمھیں مذہب اسلام سکھاتا ہے یہی
کیا تمھیں وید کا فرمان بتاتا ہے یہی
فرض انساں ہے زمانے سے محبت کرنا
دین ہر اک کا ہمیشہ سے جتاتا ہے یہی
اختلافات کے ہرراگ سے خطرہ ہے تمھیں
دل میں نفرت کی نہاں آگ سے خطرہ ہے تمھیں
آستینوں میں پلے ناگ سے خطرہ ہے تمھیں

ان کی شاعری کی اہمیت جوآج سے انھوں نے تقریباً ساٹھ ستر سال پہلے یا آزادی کے بعدجونظمیں کہی ہیں، ان کی اہمیت آج بھی ہے، دیکھیے ہرملک میں امن و

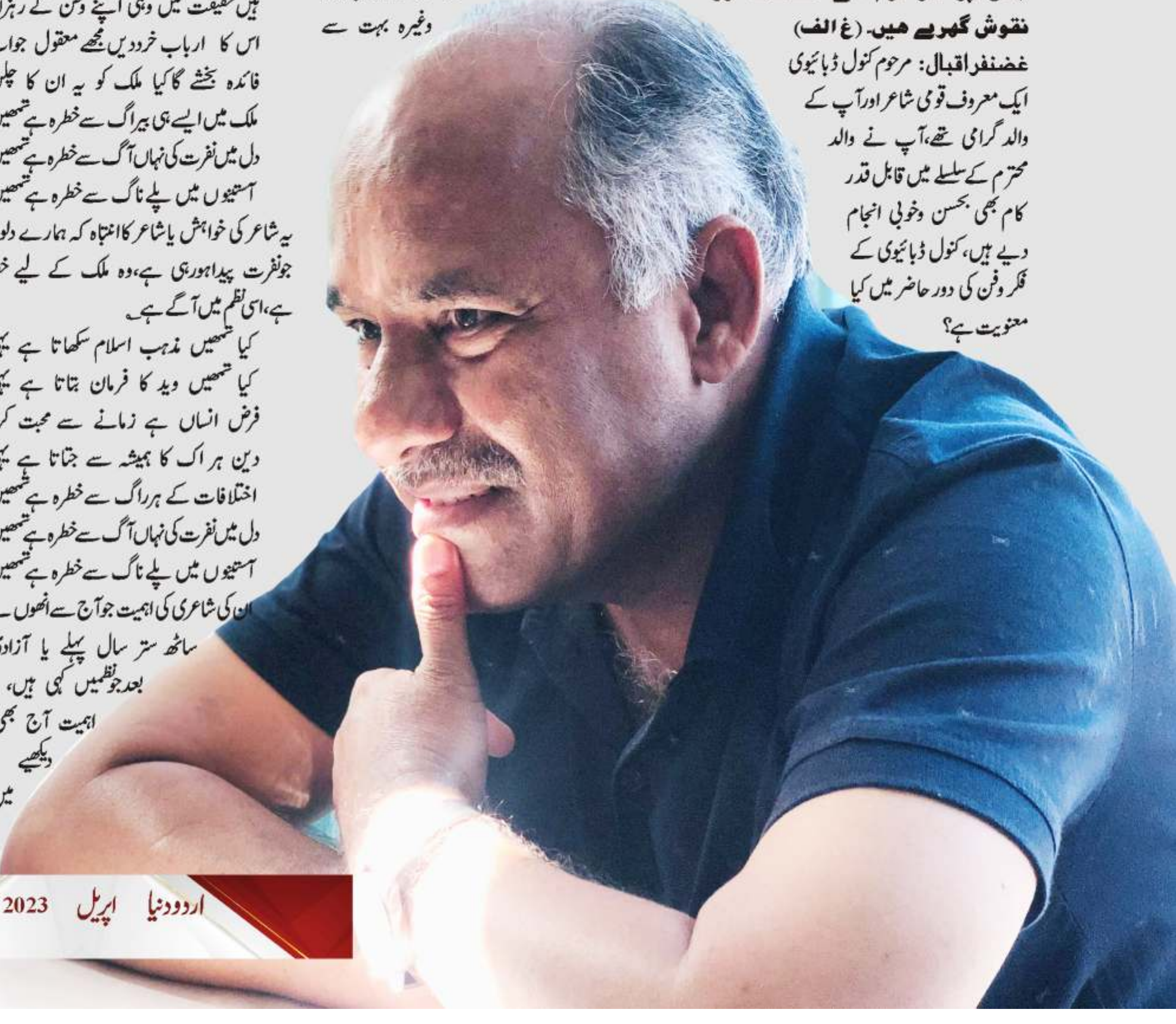

سکون اسی وقت قائم رہتا ہے جب وہاں کے تمام عوام آپس میں امن سے زندگی گذاریں۔

دیکھیے یہ عام فہم زبان میں جوانھوں نے بات کہی ہے، کہ ہندوستان اسی وقت ترقی کرسکتا ہے جب آپس میں سب محبت اور میل جول سے رہیں گے،اسی کا ایک بند ہے۔

ہندو یہاں کا باسی مسلم یہاں کا ساکن
ہر فرد ہے یہاں کے امن و اماں کا ضامن
یکساں ہو سب کا ظاہر یکساں ہو سب کا باطن
یہ راز دوست پنہاں آپس کی میت میں ہے
بھارت کی انتی کا رستہ پریت میں ہے

میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آج کے عہد میں بھی ان کی شاعری میں سمجھتا ہوں اس اعتبار سے بہت اہم ہے،وہ چاہتے تھے کہ ہمارا ملک ایک جنت نشاں بن جائے۔

کب دین سکھاتا ہے کسی فرد سے نفرت
گیتا ہو کہ انجیل کہ قرآن کی آیت
ہر دین کی تعلیم کا عنوان ہے الفت
پھر شمع نئی گلشن ہستی میں جلا دو
اشجار محبت کے ہر اک سمت لگا دو
تم ہند کو اک مرکزِ تمثیل بنا دو

تو آپ جب ان کی کتابیں پڑھیں گے یا ان کی نظمیں پڑھیں گے،ان کے مجموعے چھپے تھے سوز وطن، بساط زیست، اور پھر کلیات 'مضراب'، تو اس میں آپ دیکھیے گا کہ اس طرح کی وطن پرستی،حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی نظمیں ہیں جن کی آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ معنویت بھی اور ضرورت بھی ہے۔

س: آپ کے افسانوی ادب میں داستان، حکایت اور قصے کے گہرے اثرات ہیں،انداز بیان دلچسپ اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ پروفیسر محترم کیا افسانے کی تعریف ممکن ہے؟

ج: جی ہاں میں نے کافی افسانے ایسے لکھے ہیں گذشتہ چالیس سال میں، جن پر داستانوی اسلوب کا اثر ہے، حکایتوں کے انداز میں، ضمنی کہانیوں کے انداز میں، جیسے داستان میں ہوتا ہے کہ ان میں ضمنی کہانیاں شامل ہوتی ہیں،اور اس کے ذریعے اپنے نقطہ نظر یا تھیم کو بیان کیا جاتا ہے، تو میں نے داستان کا اسلوب بھی اختیار کیا، کیونکہ میں نے داستانوں پر براہ راست کافی کام کیا ہے، پڑھی ہیں طویل داستانیں پڑھی ہیں، چاہے وہ داستان امیر حمزہ ہو یا بوستان خیال ہو، چھوٹی داستانیں باغ و بہار، فسانہ عجائب اور قصہ حاتم طائی وغیرہ، داستانوں کا مطالعہ بھی رہا، اس کا اثر مجھ پر یہ آیا کہ جب میں نے افسانے لکھے تو افسانوں کے اسلوب یا انداز پر وہ داستانوی اثرات آئے، دیکھیے آپ خود افسانے کے بہت اچھے ناقد ہیں آپ کے والد حمید سہروردی صاحب میرے بڑے اچھے دوست ہیں اور بہت اہم افسانہ نگار ہیں جو پچھلی نصف دہائی سے افسانے لکھ رہے ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ افسانے کی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے، افسانہ نگار کو اپنی بات کہنے کے لیے جو اسلوب یا جو ہیئت پسند آتی ہے، اس میں اپنی بات کہتا ہے، افسانہ نگار کا مقصد اپنی بات کو قاری تک پہنچانا ہے یا اپنے جذبات، احساسات کے اظہار کے لیے وہ کوئی بھی جامہ پہنا سکتا ہے، کوئی بھی شکل دے سکتا ہے، کوئی بھی اسلوب دے سکتا ہے، تو آپ دیکھیں کہ آٹھویں دہائی کے بعد لکھنے والے افسانہ نگاروں نے جو قصے کہانیاں یا افسانے لکھے ہیں ان سب کے اسلوب مختلف ہیں، سب کی ہیئت مختلف ہے تو یہ طے کرنا کہ افسانے کے لیے ایک خاص اسلوب یا خاص ہیئت ہی ہوگی میرا خیال ہے مناسب نہیں ہے، اگر سلام بن رزاق اپنے انداز سے لکھتے ہیں، حمید سہروردی اپنے انداز سے لکھتے ہیں، انور قمر یا سید محمد اشرف کا انداز الگ ہوتا ہے، اسی طرح حسین الحق ہوں یا شفق ہوں یا انور خاں کوئی ہو سب کے اپنے اسلوب الگ الگ ہوں گے، جس طرح شاعر اپنے اسلوب کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے اس کی شناخت بنتی ہے، اسی طرح افسانہ نگار بھی اپنے اسلوب اور موضوعات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں افسانہ ہو یا ناول ہو کوئی ایک ایسا سانچا تیار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اس سانچے کے مطابق اپنے احساسات یا جذبات کا اظہار کریں گے تبھی وہ افسانہ ہوگا، ہاں افسانے میں قصہ پن، کہانی پن ہونا چاہیے۔ دیکھیے کہانی چاہے ناول ہو داستان ہو یا افسانہ تینوں میں قصہ ہوتا ہے۔ اس کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار کی اپنی مرضی ہے موضوع کی ضرورت ہے۔ دیکھیے موضوع خود اسلوب کو لے کر آتا ہے یہ افسانہ نگار کے مزاج پر بھی منحصر ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو داستانوی اسلوب اختیار کیا ہے کچھ افسانو ں میں، لیکن داستانوی اسلوب اختیار کرنے کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ وہ قدیم داستان بن گئی، اس کا تعلق عہد حاضر کے افسانوں سے ہی ہے۔ اس میں موضوعات یا مسائل جو سماجی مسائل ہیں وہ آج ہی کے ہیں، ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں نے جن میں اہم نام انتظار حسین کا ہے بہت سے افسانہ نگاروں نے داستانوی اسلوب کو اختیار کیا ہے، لیکن عہد حاضر کے مسائل کو ہی اس اسلوب میں یا اس انداز میں اس شکل میں بیان کیا گیا ہے۔

س : میر امن دہلوی کو اردو ادب و شعر نے فراموش کردیا، کیا یہ بات درست ہے؟

ج: نہیں! ایسا نہیں ہے، میر امن کو فراموش نہیں کیا ہے اردو ادب نے، اور میرا خیال ہے کر بھی نہیں سکتے، دیکھیے باغ و بہار جو میر امن کی اہم داستان ہے یا اردو کی اہم داستان ہے اس نے اردو زبان یا اردو نثر کو ایک اہم اسلوب عطا کیا ہے، میر امن سے پہلے اس قصہ چہار درویش کو حسین عطا خاں تحسین نے بھی نوطرز مرصع کے نام سے لکھا تھا لیکن اس کا اسلوب عام نہیں ہوسکا۔ اسے وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، جو باغ و بہار کو حاصل ہوئی، آج جب اردو نثر کی تاریخ پر یا اردو نثر کی ارتقا کی بات کرتے ہیں تو ہم ادب کے طالب علم باغ و بہار کو اہمیت دیتے ہیں کہ جدید اردو نثر کے ارتقا میں میر امن نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہر جگہ ہر یونیورسٹی میں، ہر کالج میں، باغ و بہار شامل ہے، اس کے ذکر کے بغیر اردو نثر کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی، اب یہ کہا جائے کہ میر امن کو فراموش کردیا تو مجھے مناسب یا صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ہر ابتدائی کتاب چاہے سب رس ہو یا قصہ مہر افروز دلبر ہو یا نوطرز مرصع ہو یا عجائب القصص یا فسانۂ عجائب یا اور داستانیں ہوں ادب میں سب کی تاریخی اہمیت ہے انھیں نہ نظر انداز کرسکتے ہیں اور نہ فراموش کرسکتے ہیں تو آج میر امن کی بھی اہمیت ہے، باغ و بہار کی بھی۔

س : اردو کے داستانوی ادب کی روایت کیا ہے؟

ج: اردو میں داستانوں کی جب ہم بات کرتے ہیں یا اس کی روایت کی یا اس کے آغاز و ارتقا کی تو سب سے پہلے ہماری نظر 'سب رس' پر جاتی ہے۔ ملا وجہی نے جسے 1635

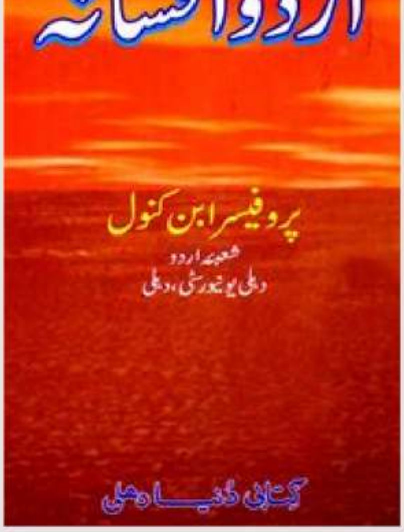

میں لکھا،اس وقت تک مثنویوں کا تو رواج تھا،یا شاعری کی طرف زیادہ توجہ تھی،نثر بہت کم لکھی جارہی تھی،ملاّ وجہی نے اس طرف توجہ دی اور فارسی کی داستان یا فارسی کے قصے 'حسن ودل' کواردو کا جامہ پہنایا،جو دکنی اردو ہے شمالی ہند میں جب ولی کے آنے کے بعد اردو شاعری کی طرف توجہ دی گئی تو نثر بھی لکھی جانے لگی جب کہ اٹھارہویں صدی میں اردو کے شاعر نثر بھی فارسی میں ہی لکھتے تھے، سارے تذکرے فارسی میں ہیں۔لیکن اٹھارہویں صدی میں چند داستانیں لکھی گئیں' قصہ مہرافروز دلبر'عیسویں خاں بہادر کی، جو محمد شاہ کے زمانے میں یا حسین عطا خاں تحسین کی'نوطرز مرصع'،'نوآئین ہندی' مہر چند کھتری نے لکھی،محمد غوث زریں نے بھی قصہ چہار درویش لکھا، بادشاہ شاہ عالم نے بھی ایک داستان 'عجائب القصص' تصنیف کی،لیکن داستانوں کو عام کرنے میں یا داستانوں کواردو میں پیش کرنے میں فورٹ ولیم کالج نے اہم کردار ادا کیا،فورٹ ولیم کالج میں اردو میں بہت سی فارسی، سنسکرت اور عربی وغیرہ سے داستانیں ترجمہ ہوئیں جس میں باغ و بہار،آرائش محفل،داستان امیر حمزہ بہت سی داستانیں وہاں پر آئیں اور داستانوں کی مقبولیت بھی بڑھی، پھر آپ دیکھیں کہ دہلی اور لکھنؤ میں داستانیں لکھی گئیں، 1824 میں رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب لکھی اور اس پر بار بار نظر ثانی کر کے اس شکل میں پیش کیا جو آج ہمارے سامنے ہے،انیسویں صدی کے اواخر میں اردو کی طویل ترین داستانیں سامنے آئیں داستان امیر حمزہ،طلسم ہوشربا اور بوستان خیال،داستانوں کی مقبولیت یہ تھی کہ اس کے کئی کئی ایڈیشن سامنے آئے۔یہ دوسوسال کی روایت ہے جس میں متعدد اردو کی داستانیں لکھی گئیں اور پھر جب ناول اور افسانہ شروع ہوگیا تو داستانوں کا رواج کم ہوگیا تو میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں 'سب رس' سے لے کر اور 'بوستان خیال' تک یا داستان امیر حمزہ تک ایک اچھی خاصی روایت ہے داستان گوئی کی اور داستان گوئی نے اہم کردار ادا کیا ہے اردو نثر کے فروغ میں۔

س: اگلے وقتوں کے معروف داستان گو میر تقی خیال اور ان کی داستان بوستان خیال آپ کی نگاہ میں؟

ج: دیکھیے اردو میں جن داستانوں کے میں نے نام لیے اس میں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی لیکن اردو میں جو طویل داستانیں ہیں۔صرف دو ہی ہیں، ایک داستان امیر حمزہ اور ایک بوستان خیال،داستان امیر حمزہ 46 ضخیم جلدوں میں ہے،جہازی سائز کی جلدیں ہیں اور بوستان خیال پندرہ جلدوں میں ہے،بوستان خیال میر محمد تقی خیال کی

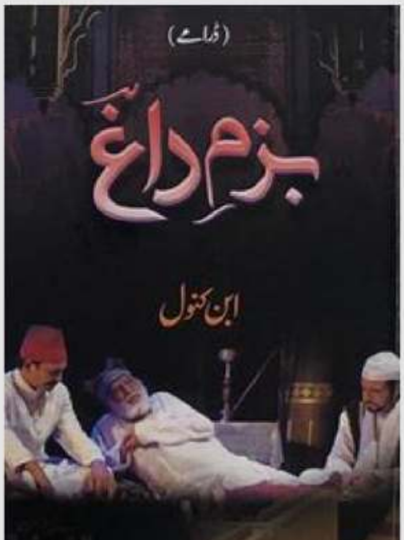

تصنیف کردہ ہے،جو انھوں نے فارسی میں اٹھارہویں صدی میں محمد شاہ کے زمانے میں لکھی،اور خیال گجرات کے رہنے والے تھے تلاش معاش یا روزگار کی تلاش میں دہلی آئے،ایک محفل میں داستان کی ابتدا کی،بادشاہ تک ان کی رسائی ہوئی،اور باقاعدہ یہ داستان لکھی گئی،ہمارے یہاں اکثر یہ ہوتا ہے داستانوں میں کہ کوئی کیرکٹر یا کردار تاریخ سے لے لیتے ہیں اور پھر اس کے اطراف جو ہے کہانیاں جوڑتے ہیں جیسے آپ دیکھیں کہ رستم سہراب کی کہانی ہو یا شیریں فرہاد کی کہانی ہو یا لیلی مجنوں کا قصہ ہو، ان کے اطراف ایسے متعدد واقعات جوڑ دیے ہیں جس سے حیرت واستعجاب کی فضا بنتی ہے اور قصہ گوئی کے ذیل میں وہ آجاتے ہیں،اسی طرح داستان امیر حمزہ میں حضرت امیر حمزہ کا کردار لے لیا، بوستان خیال میں سلطان معزالدین جو مصر کے فاطمی خلفا میں سے ایک کردار ہے جو بہت اہم کردار ہے جنھوں نے قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی قائم کی تھی یہ آج سے آٹھ سو نو سو سال پہلے تھے،سلطان معزالدین اس کے مرکزی کردار ہیں ان کے اجداد کا بھی اس میں ذکر ہے،مہدی نامہ،قائم نامہ،اسمعیل نامہ یہ سب اسی کے حصے ہیں،تو ان تاریخی کرداروں کو لے کر میر محمد تقی خیال نے اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے ایک طویل داستان ہمارے سامنے پیش کی۔انیسویں صدی میں اس کے ترجمے ہوئے،اردو میں جو پندرہ جلدوں میں موجود ہیں بہت اہم ترجمے ہیں خاص طور سے مرزا غالب کے ایک بھانجے تھے خواجہ امان دہلوی انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں وہ بہت اہم مانے جاتے ہیں،یہ ترجمے دہلی سے بھی شائع ہوئے لکھنؤ میں بھی بہت سے لوگوں نے کیے،رام پور میں بھی کیے،تو اس اعتبار سے یہ داستان بہت اہم ہے، کہ اردو میں طویل داستان کی روایت میں جن داستانوں کا نام لیا جاتا ہے اس میں بوستان خیال بھی شامل ہے، ان داستانوں میں چاہے داستان امیر حمزہ ہو یا بوستان خیال جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ داستان کے فن میں ضمنی کہانیاں شامل ہوتی ہیں،داستان میں تو ان میں بھی متعدد کہانیاں،سیکڑوں کہانیاں،قصہ در قصہ شامل ہوتے چلے گئے ہیں،یہ داستانیں بظاہر آج ان کی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن اگر ہم ان کا تہذیبی مطالعہ کریں تو ان داستانوں میں اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ موجود ہے،آج کے عہد میں داستان کی اہمیت یہی ہے کہ یہ اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ پیش کرتی ہے،اور اسی اعتبار سے ہمیں پڑھنا چاہیے،داستانوں میں یا مثنویوں میں ان کے عہد کی تہذیب بھی ملتی ہے اور الفاظ کا ذخیرہ ہمیں مل جاتا ہے،تو 'بوستان خیال' میرا خیال ہے کہ اردو کی بہت اہم داستانوں میں شمار ہوتی ہے۔

س: آپ نے مقبول ترین ادبی شخصیات کے خاکے تحریر کیے ہیں۔آپ کے خاکے خاصان ادب نے بہت پسند کیے ہیں،کیا شخصیت پر لکھی جانے والی ہر تحریر خاکہ ہوتی ہے۔

ج : جی ہاں میں نے ادھر گذشتہ دوسالوں میں کافی اہم اور اپنی قریبی شخصیات پر خاکے لکھے ہیں،اور ان خاکوں کا ایک مجموعہ 2020 میں 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' کے نام سے شائع بھی ہوا،کووڈ 19 کے دور میں جب سب نظر بند تھے تو میں نے صرف قلم کا سہارا لیا تاکہ وقت ضائع نہ ہو، میرے خاکوں کے مجموعے میں قمر رئیس بھی شامل ہیں، قاضی عبدالستار بھی شامل ہیں،حیات اللہ انصاری،عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، محمد زماں آزردہ، جیسی شخصیات شامل ہیں میں نے اس میں اپنے اساتذہ اور اپنے دوستوں کے اوپر خاکے شامل کیے ہیں اور انہیں پر خاکے لکھے ہیں۔دیکھیے خاکہ ہر شخص ہر کسی پر نہیں لکھ سکتا، کیونکہ خاکہ وہی لکھ سکتا ہے،یا اسی پر لکھا جا سکتا ہے جسے آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہو یہ ایک طرح سے آبزرویشن ہوتا ہے میں نے اپنے اساتذہ کو یا اپنے دوستوں کو جنھیں میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے ان پر خاکے لکھے ہیں،ان کی ایک ایک نقل،ان کی ایک ایک حرکت پر یا ان کی عادت و اطوار پر جس کا میں نے مطالعہ کیا ہے،یہ خاکے میں نے تحریر کیے ہیں۔آپ نے جو کہا کہ کیا کسی شخصیت پر ہر تحریر خاکہ ہوتی ہے ایسا نہیں ہے خاکے کی کچھ خاص ہیئت ہوتی ہے، ہیئت سے مراد یہ ہے کہ کچھ ضرورت ہوتی ہے کوئی اسلوب ہوتا ہے کسی شخصیت پر ہم لکھتے ہیں تو وہ سوانح بھی کہی جاتی ہے، مضمون بھی کہہ سکتے ہیں لیکن خاکے میں کچھ طنز، کچھ مزاح ایک خاص اسلوب کے ساتھ بے تکلفی کے ساتھ ہونا چاہیے، خاکہ کوئی سنجیدہ مضمون نہیں ہوتا،آپ دیکھیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے خاکہ اڑانا تو یہ اس

بات کی دلیل ہے کہ خاکہ اڑانے سے مطلب یہ ہے کہ اس میں طنز و مزاح تو شامل ہوگا ہی، اگر آپ کسی شخصیت پر کوئی مضمون یا کتاب تحریر کرتے ہیں تو وہ سوانح کہلائے گی اگر سنجیدگی سے لکھیں گے۔ اگر کچھ سنجیدگی اور کچھ شگفتگی ہوگی تو وہ خاکہ ہوگا، میں نے پروفیسر عتیق اللہ کا بھی خاکہ لکھا ہے شاہد علی خان کا بھی لکھا ہے، شاہد مہدی کا بھی لکھا ہے، تو ان لوگوں کے جو خاکے ان میں کہیں مزاح بھی ہے کہیں طنز بھی ہے لیکن اس میں کہیں ایسا نہیں ہے کہ میں نے جس شخصیت پر لکھا ہو اس کی دل آزاری ہو، خاکہ نگار کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ اس شخصیت سے اپنی قربت کا اظہار ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا ہے، بہت سنجیدگی سے بات اس میں نہیں کی جاتی ہے، بات سنجیدہ ہوتی ہے، سچ ہوتی ہے سب کچھ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ خاکے میں قاری بھی لطف اندوز ہو، محظوظ بھی اور کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، خاکہ نگار کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ وہ جس کا خاکہ لکھ رہا ہے اسے تکلیف دینا چاہتا ہے، میں نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں جو لکھا ہے، سب کچھ سچ ہے لیکن اس انداز سے لکھا ہے کہ اسے تکلیف نہ پہنچے اس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا بھی خاکہ ہے، علی احمد فاطمی کا بھی خاکہ ہے اور میرے بہت سے نوجوان دوستوں میں ڈاکٹر محمد کاظم کا بھی خاکہ ہے فاروق بخشی کا بھی خاکہ ہے، شمس تبریزی کا بھی خاکہ ہے ان لوگوں پر میں نے لکھا ہے جو میرے بہت قریب ہیں اور جنھیں میں تقریبا چالیس پچاس سال سے جن کا میرا ساتھ رہا ہے تو یہ خاکوں کا مجموعہ دیکھیے ابھی یہ سلسلہ جاری ہے کس کس کا خاکہ اڑتا ہے۔

س: کتاب 'بساط نشاط دل' سے آپ کی بحیثیت انشائیہ نگار ایک مستحکم شناخت بنتی ہے، ڈاکٹر وزیر آغا اور عہد موجود کے انشائیوں کے کیا امتیازات ہیں؟

ج: خاکوں کے بعد جی ہاں میں نے انشائیوں کی طرف توجہ دی اور 2021 میں 'بساط نشاط دل' کے نام سے میرا انشائیوں کا مجموعہ شائع ہوا، ظاہر ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ انشائیہ وہ صنف ہے کہ کسی بھی موضوع پر آپ بہت ہی لائٹ موڈ میں یا ہلکے پھلکے انداز میں مزاح کے ساتھ اس طرح پیش کریں کہ قاری لطف اندوز ہو محظوظ ہو، میرا تعلق علی گڑھ سے رہا، علی گڑھ میں میری تعلیم ہوئی، وہاں جس شعبے میں میں نے تعلیم حاصل کی، پروفیسر رشید احمد صدیقی مشہور انشائیہ نگار اس شعبے کے صدر رہ چکے تھے مجھے رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے بہت متاثر کیا، کووڈ کا زمانہ تھا گھر میں قید تھے تو میں نے جو انشائیے لکھے اس میں کووڈ پر بھی لکھا، لاک ڈاؤن پر بھی لکھا اور خود پر کہ میں ایک پروفیسر ہوں، صحافت کا جو آجکل حال ہے دیکھ رہے ہیں جس طرح ٹی وی پر اینکر بات کرتے ہیں میں نے تو اس طرح بہت سے موضوعات پر، دیکھیے تخلیق جو ہوتی ہے وہ احساسات اور جذبات کا اظہار ہے اس کے مختلف پیرائے ہوتے ہیں کوئی افسانہ لکھ کر کرتا ہے کوئی ناول لکھتا ہے کوئی شاعری کرتا ہے تو میں نے افسانے بھی لکھے جیسے میرا افسانوی مجموعہ آیا پچاس افسانے، پھر اس زمانے میں میں نے خاکے لکھے، انشائیے لکھے جن کے مجموعے چھپ چکے، اور پھر حال ہی میں میری کتاب آئی 'چار کھونٹ' کے نام سے، یعنی جو میں نے دنیا کے سفر کیے۔ 'چار کھونٹ' جو میرے سفرناموں کا مجموعہ ہے اس میں

حج کا سفرنامہ بھی ہے امریکہ، انگلینڈ، ماریشس اور روس، ازبکستان، دبئی، پاکستان یہ قریب تقریبا دس ممالک کا سفر ہے جو میں نے 'چار کھونٹ' کے نام سے پیش کیا اس میں تھوڑا بہت طبیعت میں جو میرے مزاح ہے شامل ہے تا کہ پڑھنے والا محظوظ ہو سکے، اسی زمانے میں میری ایک کتاب اور بھی آئی، 'داستان کی جمالیات' جو 2021 میں شائع ہوئی، آدمی اگر چاہے تو نظر بندی کی حالت میں جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر لکھی، میں نے کووڈ میں جو لاک ڈاؤن رہا دو سال میں کئی کتابیں میری منظر عام پر آئیں، بلکہ جو میری تقاریظ کا مجموعہ تھا جو میں مختلف لوگوں کی کتابوں پر پیش لفظ لکھے تھے تقریباً پچھتّر جو مجھے مل سکے، وہ بھی تبریک کے نام سے شائع کرائے، ڈراموں کا مجموعہ 'بزم داغ' کے نام سے شائع ہوا، بس یہی کام پچھلے تین چار سالوں میں کیا، اور میں کووڈ کے زمانے میں بھی کہتا رہا اپنے طالب علموں سے اور نئے لکھنے والوں سے کہ دیکھیے وقت کو ضائع مت کیجیے، اپنے وقت کا صحیح استعمال کیجیے، اگر آپ کے اندر لکھنے کی صلاحیت ہے، تو اس کا استعمال آپ کو زندہ رکھے گا، ہر آدمی کو موت آتی ہے لیکن جو کچھ تخلیق چھوڑ جاتا ہے، اسے موت نہیں آتی، وہ مرتا نہیں ہے، جیسے شعر ہے۔

اولاد سے جیا تو جیا تین چار پشت
باقی سخن سے نام سخنور کا رہ گیا

نئے لوگ لکھ رہے ہیں آپ بھی لکھتے ہیں اور لکھتے رہنا چاہیے آج ہم میر، غالب، اقبال یا پریم چند یا اور دوسرے لوگوں کو جانتے یا پڑھتے ہیں تو صرف اس لیے جانتے ہیں کہ ان کی تخلیقات ہمارے سامنے ہیں، ان کی شاعری ہو، یا نثر ہو، ناول ہو، اس کی وجہ سے وہ زندہ ہیں، تخلیقات یا ادب کبھی ختم نہیں ہوتے وہ انسان کو زندہ رکھتا ہے، آدمی کو زندہ رکھتا ہے، اور خاص طور سے میں اردو کے اپنے ادیبوں سے کہوں گا کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں، کہ ہم اردو میں لکھتے ہیں، تو جو سب زبانوں کا حال ہے وہی اردو کا ہے، اردو میں گزشتہ دہائیوں میں بہت اچھی کتابیں چھپ رہی ہیں، لیکن اس میں معیار بھی اچھا ہے چھپائی بھی اچھی ہے، تو مایوس نہیں ہونا چاہیے، لکھتے رہیے۔

س : کیا بھارت میں تنقید تمام ہوگئی؟

ج: جی نہیں! ایسا نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان سے تنقید ختم ہو رہی ہے، تنقید ہر عہد میں لکھی گئی، یہ الگ بات ہے کہ نظریات بدلتے چلے گئے، تنقیدی نظریات، پرکھنے کا انداز جس طرح بدل جاتا ہے، اسی طرح تنقیدی نظریات بھی بدل گئے، حالی سے لے کر آج تک مختلف نظریات سے تخلیقات کو پرکھا گیا، تو آج بھی تنقید موجود ہے، نوجوان بھی تنقید لکھ رہے ہیں، پرانے لوگ بھی لکھ رہے ہیں، تنقید ختم نہیں ہوئی ہے، اور تنقید تو تخلیق کے لیے لازمی ہے، جب تک تنقید نہیں ہوگی تو تخلیق نکھر کر سامنے نہیں آسکتی کوئی بھی چیز ہو جب تک اس کے محاسن اور معائب کو بیان نہیں کیا جائے گا تو اس میں خوبی پیدا نہیں ہو سکتی، خوب سے خوب تر کی تلاش کا نام ہی تنقید ہے۔

س : آپ کا قاری کے لیے کوئی پیغام؟

ج : آج کا قاری بہت سمجھ دار ہے اسے نقاد سے زیادہ اچھے اور برے کی پہچان ہے، بازار میں کتابیں بہت ہیں، اچھی کتابوں کا انتخاب کیجیے۔

■

Dr. Ghazanfar Iqbal
"SAIBAN" Zubair Colony,
Hagarga Cross, Ring Road,
Gulbarga-585104, Karnataka.
CellNo.09945015964
email: ghazanfaronnet@gmail.com

محمد شمشاد

صرف ادب نہیں، زبان پر بھی توجہ کی ضرورت ہے

"اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟
ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔"

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: اپنی بات، خیالات، احساسات، اور جذبات کو دوسرے تک پہنچانے یا دوسروں کی بات کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام مادری زبان کے ذریعے ہی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ مادری زبان کی ترقی اور ترویج وترسیل ہی اس قوم کی ترقی کے لیے ضامن بنتی ہے اگر کسی قوم کے لوگوں کو سماجی، سائنسی تاریخی اور فلسفے کے وہ تمام مواد اس کی مادری زبان میں نہیں ملتے ہیں جو انھیں درکار ہیں تو یقیناً اس قوم کے لوگ اپنی مادری زبان سے گریز کرتے ہوئے دوسری زبانوں کو سیکھنے اور پڑھنے کی جانب رخ کرنے لگتے ہیں اور آخر کار وہی دوسری زبان ان کے لیے مادری زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ظاہر ہے اس ترقی یافتہ اور جدید دور میں اگر کوئی زبان اس جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ نہ ہوگی تو یقیناً اس زبان کا زوال پزیر ہونا لازمی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے زبان کو روزگار سے وابستہ کرنا لازمی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ تمام علوم جو ایک طالب علم کی ضروریات کو پورا کرتے ہوں اسے ان کی زبان میں با آسانی دستیاب کی جائیں تاکہ طالب علموں کو دوسری زبانوں کی جانب رخ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑ سکے اور وہ اپنی مادری زبانوں میں ان سے استفادہ کرسکیں اور وہ ترقی کی ساری منزلیں طے کرسکیں اس کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو مواد اردو زبان میں نہیں ہے انھیں دوسری زبانوں سے اردو زبان میں منتقل کیا جائے بلکہ دنیا کے تمام علوم کو اردو میں ترجمہ کرانے کی ضرورت ہے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: زبان سے تہذیب وثقافت کا ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ کسی قوم کی زبان میں اس کی تہذیب وثقافت کی جھلک ملتی ہے بلکہ زبان ہی کسی قوم کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے مثلاً اردو ہندوستانی زبان ہے یہی وجہ ہے کہ اس زبان میں یہاں کا ہر کلچر اردو کے افسانوں میں جہاں عیدالفطر کی خوشیاں ملتی ہیں تو وہیں دیوالی اور دسہرہ اور راکھی کی خوبیاں بھی ملتی ہیں جہاں جگن ناتھ آزاد نعت رسول کہتے ہیں تو پریم چند عید کی مٹھائیاں بانٹتے نظر آتے ہیں یعنی اس زبان میں پورے بھارت کی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: جی ہاں یہ بالکل جڑا ہوا ہے کسی زبان کی موت کا مطلب اس ملک اور قوم کی موت ہے اس لیے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی زبان سے ہی جڑا ہوتا ہے اگر ہم اپنی زبان کی حفاظت میں ناکام ہوتے ہیں تو ہماری قوم کی موت یقینی ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: یقیناً آج کے دور میں سائنس وٹکنالوجی کسی بھی قوم کے ہر فرد کے لیے لازمی ہے یہی اس کی ترقی کا لازمی عنصر ہے اس کی کمی کی وجہ سے اردو والے اور ان کے بچے سائنسی علوم کے میدان میں اپنی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کر پا رہے یہ اردو والوں کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہے۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ دور میں اردو زبان کو کسی اور سے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ اردو کے نام پر جو لوگ اپنی روزی روٹی چلا رہے ہیں انھیں سے اردو کو زیادہ خطرہ ہے ان میں افراد پیش پیش ہیں۔ اردو والوں میں افراد ایسے بھی ہیں جو نام ونہاد کے لیے اردو کا دم بھرتے ہیں اور اردو تنظیموں کو اپنے جیب میں لیے پھرتے ہیں جس کے وجہ کران سے کبھی بھی اردو زبان کا بھلا نہیں ہوسکتا ہے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو کا مستقبل بہت روشن ہے اس کی وجہ میں یہ مانتا ہوں کہ اسلامی فقہ پر جتنا کام اردو زبان میں کیا گیا ہے شاید ہی کسی اور زبان میں کیا گیا ہو امارت شریعہ بہار و اڑیسہ اس کی مثال ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی اسلامی تاریخ یا لسانیات پر ریسرچ کرنا چاہے تو خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے بنا اس کا کام پورا نہیں ہوسکتا یعنی یہ تمام مواد بھی اردو میں ہی موجود ہے اس کے علاوہ اسلامی شریعت کا کوڈی فیکیشن بھی اردو زبان میں ہی پہلی بار کیا گیا ہے جو امارت شریعہ بہار کے سابق امیر شریعت قاضی مجاہدالاسلام صاحب مرحوم نے کرایا تھا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کو بھی نئی ٹکنالوجی اور روزگار سے جوڑنے کی بھر پور کوشش کی جائے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: دراصل کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سما چکا ہے کہ انگریزی زبان کا استعمال احساس برتری کی علامت ہے اور اردو احساس کمتری کی۔ جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے ہر زبان کی اپنی اپنی افادیت اور اہمیت ہے کسی کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں اور نہ ہی ان کا ایک دوسرے سے کوئی میلان ہے مثلاً علامہ اقبال، مرزا غالب، فیض، شوق، حالی، پریم چند، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ کا کوئی ثانی نہیں ہر ایک کا اپنا ایک مقام ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو کے ادبا کسی دوسری زبان کے ادبا سے کسی طرح بھی کم مقام رکھتے ہیں اردو تو ایک ایسی شریں زبان ہے جس کے ہر لفظ میں چاشنی اور محبت کی شرینی ہے جس میں حسن و جمال ہے جسے نہ جاننے اور نہ سمجھنے والے بھی سننے سے انکار نہیں کرتے ہیں۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: ہاں درحقیقت یہی بات صحیح ہے کہ اردو کے زیادہ تر ادارے اور تنظیمیں اردو زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دیتے رہے ہیں جبکہ ادب کے ساتھ اردو زبان پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ ان میں توازن برقرار رہے ایسی بات نہیں ہے کہ اردو کتابوں کی اشاعت رک گئی ہے بلکہ ہندوستان کے بہت سارے ادارے اچھے خاصے ٹائٹل کے ساتھ بڑے اداروں میں شامل ہو چکے ہیں البتہ ان مکتبوں کے ذریعے ان کتابوں کے مصنفوں کو اس کا معاوضہ نہیں مل پاتا ہے جس کے وجہ سے وہ کسمپرسی کے حالات سے گزر رہے ہیں جس پر توجہ دینے کی ضرورت بھی ہے۔

س: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: کلاسیت اور جدیدیت پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ تو نہیں پہنچتا ہے مگر اس سے زبان کو کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: میرا تعلق گیا بہار سے ہے۔ گیا ضلع میں مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول جا کند، بالا پور ہائی اسکول بیلا گنج، قاسمی ہائی اسکول، ہادی ہاشمی ہائی اسکول اور قاسمی مڈل اسکول گیا اور مڈل اسکول چیرکی ہے اور ایک کالج مرزا غالب کالج گیا ہے سات مسلم اقلیتی تعلیمی ادارے ہیں جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ہمارے شہر میں ایک اردو لائبریری ہوا کرتی تھی جس کی عمارت منہدم ہوجانے کی وجہ سے اردو لائبریری ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی ہے ایک گورنمنٹ لائبریری ہے جہاں کوئی اردو کا اخبار نہیں آتا ہے جماعت اسلامی کی لائبریری میں اردو اخبارات کے ساتھ کچھ رسالے آتے ہیں رہا دیہاتوں میں ہر علاقے میں پہلے لائبریری ہوا کرتی تھی وہ سب بھی اب بند ہو چکی ہیں بس اقلیتی اسکول اور کالج کی لائبریریاں ہیں جہاں اردو کے اخبارات آتے ہیں لیکن وہاں اردو کا کوئی رسالہ نہیں آتا ہے۔ مگدھ یونیورسٹی اور گیا کالج، اے ایم کالج اور جگجیون کالج کی لائبریریوں میں بھی کوئی اردو کا اخبار یا رسالہ نہیں آتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے یہاں کوئی بھی کارکردگی نہیں ہو رہی ہے جو بھی اور جہاں بھی کچھ اردو کی ترسیل کے لیے کام ہو رہا ہے وہ پرانے ہی انداز سے ہو رہا ہے اس جانب کوئی نئی پہل نہیں کی گئی ہے جو قابل افسوسناک پہلو ہے اب تو تنظیمیں اور انجمنیں بھی نام برابر نظر آتی ہیں ہاں کچھ لوگ پاکٹ انجمن ضرور لیے پھرتے نظر آتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: گیا ضلع دور قدیم سے ہی اردو کے لیے زرخیز رہا ہے یہاں اختر اورینوی، انجم مانپوری، انور عظیم، قاضی عبدالودود، امداد امام اثر، نذیر زیدی، طیب عثمانی، قیصر عثمانی، فہیم الدین احمد فہیم، علی حیدر ملک، کلام حیدری، کلیم اختر، ناوک حمزہ پوری، فرحت قادری، م ق خان، اعجاز مانپوری، حفیظ مہتاب، حسین الحق، سرور عثمانی، ضیاء الرحمٰن جعفری، ضمیر الدین عرش گیاوی، نجم عثمانی، مشہور شخصیات نے اردو ادب میں گرانقدر خدمات انجام دیں اور قومی و بین الاقوامی شہرتیں حاصل کی۔ مناظر حسن شاہین، عین تابش، شہزاد انجم، عشرت ظہیر، معصوم احمد کاظمی، شاہین نظر، محمد شمشاد، بدنام نظر، ناہید اختر، شاہ محمد عثمانی، شاہ رشاد عثمانی، صغیر قادری، سین اختر، سید احمد قادری، تابش خیر، زین رامش، فردوس گیاوی، احمد صغیر، مرغوب اثر فاطمی، محفوظ عالم،

موجودہ دور میں اردو زبان کو کسی اور سے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ اردو کے نام پر جو لوگ اپنی روزی روٹی چلا رہے ہیں انھیں سے اردو کو زیادہ خطرہ ہے ان میں افراد پیش پیش ہیں۔ اردو والوں میں افراد ایسے بھی ہیں جو نام ونہاد کے لیے اردو کا دم بھرتے ہیں اور اردو تنظیموں کو اپنے جیب میں لیے پھرتے ہیں جس کے وجہ کران سے کبھی بھی اردو زبان کا بھلا نہیں ہوسکتا ہے۔

یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہو کہ ہماری تحریریں اردو رسم الخط میں ہوں تاکہ دوسرے لوگ بھی اس کی کوشش کر سکیں۔ ہر جگہ خوشخطی و کیلی گرافی کے کورس کا پروگرام شروع کرنا چاہیے بلکہ گاہے بہ گاہے اس کا مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد بھی ہونا چاہیے ان پروگراموں میں ان کے ماہرین کو بھی مدعو کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمارے بچوں کی حوصلہ افزائی کر سکیں اور اس کے ذریعے ہمارے بچوں کو اس خوشخطی اور کیلی گرافی میں اپنا مستقبل نظر آئے اور اس سے محبت ہو جائے یعنی وہ اردو کو اپنے روزگار میں شامل کرسکیں۔

شاہد اختر، چونچ گیاوی اور صدف اقبال کچھ ایسے نام ہیں جنھوں نے موجودہ دور میں بھی قومی سطح پر اپنی پہچان بنائی ہے لیکن ان میں کچھ شخصیات ایسی ہیں جن کی خدمات کا اعتراف قومی سطح پر نہیں ہوسکا ہے۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوشش کررہے ہیں؟

ج: میں کارواں ویلفیئر ایسوسی ایشن سے وابستہ ہوں اور اردو زبان وادب کی ترقی وفروغ کے سلسلے میں ہمہ وقت جدو جہد کرتا رہتا ہوں میں اردو رسم الخط کی بقا کے لیے سوشل میڈیا پر مستقل طور پر متحرک رہتا ہوں اور لوگوں سے اپیل کرتا رہتا ہوں کہ وہ اپنی تحریروں میں اردو رسم الخط کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں اس کے علاوہ میں واٹس اپ پہ اردو ادب گروپ کا فاؤنڈر ہوں جسے میں نے 2016 میں بنایا تھا۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو کو روزگار سے جوڑا جائے مثلاً ترجمہ نگاری، (اردو فارسی، اردو ہندی، اردو عربی، اردو انگلش، اردو سنسکرت،) سماجی، سائنسی، تاریخی، سوشل، تمام کورسیز کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے اس کے علاوہ کیلی گرافی، اور خوشخطی کو بھی روزگار کے طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے جہاں بھی کچھ لوگ اردو کو پڑھنا اور جاننا چاہتے ہوں ان علاقوں میں اردو کے شارٹ کورسیز شروع کیے جائیں۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہو کہ ہماری تحریریں اردو رسم الخط میں ہوں تا کہ دوسرے لوگ بھی اس کی کوشش کرسکیں۔ ہر جگہ خوشخطی و کیلی گرافی کے کورس کا پروگرام شروع کرنا چاہیے بلکہ گاہے بہ گاہے اس کا مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد بھی ہونا چاہیے ان پروگراموں میں ان کے ماہرین کو بھی مدعو کرنا چاہیے تا کہ وہ ہمارے بچوں کی حوصلہ افزائی کرسکیں اور اس کے ذریعے ہمارے بچوں کو اس خوشخطی اور کیلی گرافی میں اپنا مستقبل نظر آئے اور اس سے محبت ہو جائے یعنی وہ اردو کو اپنے روزگار میں شامل کرسکیں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اردو ہندوستان اور پاکستان کے تمام علاقے میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں تقریباً تمام علاقائی زبانوں کے کچھ نہ کچھ الفاظ شامل ہیں اور یہی اردو کی خاصیت ہے اس کے فروغ کے لیے علاقائی سطح پر کوی سمیلن اور کہانی سملین منعقد کرنا چاہیے تا کہ دوسری علاقائی زبانوں کے اسکالروں اور عوام کے سامنے اردو کی ترویج کا موقع فراہم ہوسکے۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں۔ میرے اہل خانہ کی نہ صرف زبان اردو ہے بلکہ مادری زبان بھی اردو ہے میرے گھر تمام افراد اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں میں نے اپنے بچوں کو اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی بھی تربیت دی ہے بلکہ علاقے کے لوگ میرے خاندان کو 'اردون' (اردو بولنے اور جاننے والے) بولتے ہیں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: جی ہاں بالکل صدفی صد، میں نے اپنے دادا اور والد کو اردو بولتے اور پڑھتے دیکھا تھا اور اب ہم لوگ بھی اردو بولتے اور پڑھتے ہیں ان شاء اللہ میری آئندہ نسل بھی اردو کو زندہ رکھے گی۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: اردو زبان میں اردو شاعری اور افسانہ وناول نگاری کو عروج حاصل ہے جو کسی دوسرے زبان کو حاصل نہیں ہے آج کل سوشل میڈیا پر غیر اردوداں حضرات بھی اس ضمن میں دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اردو شاعری کو سنتے سمجھتے ہیں اور افسانے و افسانچے کو اپنی زبان میں ترجمہ کے ذریعے پڑھتے ہیں ان میں بہت سارے لوگ اردو پڑھنا چاہتے ہیں اس لیے ہمیں ان کی جانب ایک نہیں دس قدم بڑھانا چاہیے اس کے علاوہ اردو ہندی کوی سمیلن، افسانوی و کہانی مجلس منعقد کرنا چاہیے تا کہ اردو زبان کی ترویج و ترسیل کے راستے ہموار ہوسکیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: ہمارے علاقے میں تقریباً تمام کالجز اور یونورسٹیز میں اردو کے شعبے قائم ہیں جن میں اردو زبان کی تعلیم دی جاتی

اردو کو روزگار سے جوڑا جائے مثلاً ترجمہ نگاری، (اردو فارسی، اردو ہندی، اردو عربی، اردو انگلش، اردو سنسکرت)سماجی، سائنسی، تاریخی، سوشل، تمام کورسیز کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے اس کے علاوہ کیلی گرافی، اور خوشخطی کو بھی روزگار کے طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے جہاں بھی کچھ لوگ اردو کو پڑھنا اور جاننا چاہتے ہوں ان علاقوں میں اردو کے شارٹ کورسیز شروع کیے جائیں۔

ہیں گیا میں اردو پڑھنے والوں کی اچھی تعداد موجود ہے اگر ریاست بہار میں معلّمی کے پیشے کے علاوہ دوسرے پیشے میں بھی روزگار کے مواقع مل جاتے تو بہت خوش آئند بات ہوتی مثلاً پولس، کورٹ اور رجسٹری آفس میں۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: اردو کی ترویج اشاعت کے لیے سائنسی، سماجی، ثقافتی اور ہندوستانی اور عالمی تاریخی مواد کو پورا کرنے کے لیے غیر سرکاری تنظیموں سے مدد لی جاسکتی ہے۔

■

Mohd Shamshd
Fatma Nagar, Dhipa Toli, Pundag
Ranchi-834004
Mob.:7011595123
Email: mshamshad313@gmail.com

محمد سراج عظیم

عصر حاضر کے ادب اطفال میں سائنس و ٹیکنالوجی رجحانات و امکانات

اردو میں ادب اطفال کے نقوش محققین کی تحقیق کے مطابق امیر خسرو کی قلندرانہ تحریروں سے ملتے ہیں۔ جن میں کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوسخنے، انمیلیاں، دوہے اور گیت وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح اگر دکنی اردو کے حوالے سے بات کریں تو باقاعدگی سے بچوں کے ادب کا آغاز ولی دکنی سے ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانے میں ادب اطفال کی الگ سے کوئی شناخت نہیں تھی بلکہ غیر ارادی طور پر پڑھے لکھے لوگ عام فہم زبان میں اس وقت کے لحاظ سے پند و نصائح کی وہ باتیں جو سماج میں صالح اور مثبت رویوں اور عادات کو مہمیز کریں وہ تحریر کرتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ اس طرح کا تخلیقی مواد زیادہ تر یا تو مدارس کے طلبا کو یا گا گا کر دف یا ایک تارے کی تان پر چوپالوں یا میلے ٹھیلے وغیرہ میں سنایا جاتا تھا۔ جو کسی طرح مستورات کو ازبر ہو جاتا تھا اور وہ بچوں کو سنایا کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں کے ادب کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ترویج خام ادب اطفال کے طور پر مستورات سے منسلک ہوگئی، اور اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کہانیاں، لوریاں، کہاوتیں اور تقریبات میں گیت یہ سب عورتوں سے ہی منسوب تھیں۔ یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ امیر خسرو اور ولی دکنی کے وقت میں اگر بچوں کا ادب تھا تو شاعری کی شکل میں تھا، اگر نثری ادب کو سمجھا جائے تو نثری ادب وہی ہے جو عورت نانی، دادی کی شکل میں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اتنی طویل ہوا کرتی تھیں کہ ایک ایک ہفتے کا دورانیہ ہوا کرتا تھا۔ تاریخی پہلو سے یہی نانی، دادی کی کہانیاں بچوں کا ادب ہوا کرتی تھیں اور اسی کو ہم خام ادب اطفال کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کا واضح کردار نانی، دادی ہی ہوا کرتی تھیں۔ یہ روایت نہ صرف اردو زبان کی تھی بلکہ دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔

اگر عالمی پیمانے پر ادب اطفال کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انگریزی اور چینی زبان میں ادب اطفال کی روایت قدیم ترین ہے۔ اس کے بعد روسی اور اطالوی زبان آتی ہے۔ ہماری ہند آریائی زبان میں بھی ادب اطفال کی تاریخ زمانہ قدیم سے ہے، جہاں پرانوں کی کہانیاں سب سے قدیم مانی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باقاعدہ آثار پنچ تنتر کی کہانیوں اور بیتال پچیسی میں ملتے ہیں۔ ان کہانیوں کا بھی مرکز مٹھ یا پاٹھ شالائیں تھیں اور ہندو مذہب میں بھی کہانیوں کا بیان عورتوں کی زبان کے ذریعے ہی تھا۔ یعنی ادب اطفال کی ترویج کا ایک اہم ذریعہ مستورات ہی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ بچہ زمانہ طفلی سے شعور کی منزل پر پہنچنے تک ماں کے زیر اثر رہتا ہے۔

اردو میں ادب اطفال کی باقاعدہ شروعات کے آثار اٹھارویں صدی سے ملتے ہیں۔ جب میر تقی میر اور نظیر اکبرآبادی نے شعوری طور پر اپنے کلام میں ان موضوعات کو استعمال کیا جو ادب اطفال سے تعلق رکھتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنے یہاں عہد طفولیت کی ان دلچسپیوں کو بڑی خوبی سے برتا ہے جو کسی بھی بچے کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ مگر اس وقت میر تقی میر اور نظیر اکبرآبادی کی ان کوششوں کو عوامی ادب کہہ کر کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی نہ ان کی کاوشات کو ادب اطفال کے نام سے گردانا گیا۔ اسی اثنا میں انجمن پنجاب، فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ تحریک، اور دہلی کالج انیسویں صدی کے اوائل میں وجود میں آئے۔ تین قابل قدر انگریز شخصیات جان گلکرسٹ، کرنل ہالرائڈ اور ای ویٹ نے درس و تدریس کی کتابیں تیار کرائیں۔ جس میں فارسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے شامل تھے یہ درسی کتابیں اپنے متن اور افادیت کی رو سے اس قدر مقبول ہوئیں کہ بعض کتابیں ساٹھ کی دہائی تک اسکولوں میں شامل نصاب رہیں۔ ان درسی کتب کی تیاریوں میں مولانا محمد حسین آزاد، امام بخش صہبائی، مولوی ضیاء الدین، مولانا اسمٰعیل میرٹھی، مولوی ذکاء وغیرہ کے نام نامی عزت و احترام کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اہم ہیں۔ درسی کتب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جہاں بہت سے نام ہیں وہاں مولانا اسمٰعیل

میرٹھی ادب اطفال میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے درسی کتب کی تیاریوں میں خود بچوں کی استعداد اور فہم کے مطابق مواد تیار کیا، جو ادب اطفال میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اسمٰعیل میرٹھی بچوں کے کل وقتی ادیب تھے جنھوں نے اپنے آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

اسی دور کے کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو ذاتی طور پر بچوں کے ادب پر کتابیں شائع کرواتے تھے، جو سرکاری اداروں کے زیر نگرانی نہیں تھے۔ مگر ان کی کتابیں تدریسی مقاصد کو پورا کر رہی تھیں۔ جن میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی وغیرہ تھے جنھوں نے ادب اطفال میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آزادی سے پہلے ادب میں حفیظ جالندھری نے جہاں ادب عالیہ میں اپنا مقام بنایا وہیں بچوں کے ادب کے لیے بہت اہم کام انجام دیے۔ ان میں سے ایک عمر و عیار کو دو جلدوں میں پیش کیا۔ جو یکساں طور پر بڑوں اور بچوں میں مقبول ہوا، اور کئی زبانوں میں منتقل ہوا اس پر فلمیں اور ٹی وی سیریل بھی بنے۔ اس کے علاوہ الف لیلہ کی کہانیاں بچوں کے لیے آسان زبان میں منتقل کیں، جو ایک زمانے تک مقبول رہیں۔ امتیاز علی تاج نے بچوں کے لیے ایک ناقابل فراموش مزاحیہ کردار چچا چھکن خلق کیا۔ یہ کردار بھی اردو ادب میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کے چرچے آج تک زندہ ہیں اور اس کو دوسری زبانوں نے بھی اپنایا، سماج میں یہ کردار کسی شخص کے بے وقوف اور حجتی ہونے کے لیے مثال بھی بن گیا۔ ابھی حال ہی میں انقلاب میں 'چچا چھکن کے کارنامے عصر حاضر میں' کے عنوان سے مختلف تخلیق کاروں سے تخلیق کرا کر شائع کرائے گئے، جن کو لوگوں نے دلچسپی سے پڑھا۔ چچا چھکن بھی ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جلوہ افروز ہیں۔ مگر چچا چھکن کے بعد اردو ادب یا ادب اطفال میں کوئی دوسرا مقبول عام کردار معرضِ وجود میں نہیں آیا۔

ہمارے سابق صدر جمہوریہ اور بانیان جامعہ میں سے ایک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنے رفقا اور اساتذہ کو اپنی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے بچوں کا ادب تخلیق کرنے کی ترغیب دلائی۔ جن میں ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، محمد مجیب، شفیع الدین نیر، قدسیہ زیدی، حسین حسان، اطہر پرویز اور عبدالغفار مدھولی وغیرہ شامل تھے، خود ذاکر صاحب نے بھی بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی مشہور زمانہ ابو خاں کی بکری آئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے سید عابد حسین کی ادارت میں سنہ 1926 میں 'پیام تعلیم' کے نام سے بچوں کا ماہنامہ شروع کیا۔ جس میں بچوں کی دلچسپی کا ایسا مواد شامل ہوتا تھا جو معیاری ہونے کے ساتھ مقبول عام تھا۔ اس طرح سے جامعہ کے مصنفین کا ادب اطفال میں اہم رول رہا ہے۔ اسی زمانے میں دہلی سے ماہنامہ 'کھلونا' بھی نکلتا تھا۔ جس میں اس کے مالک و مدیر یوسف دہلوی اور ان کے بیٹے الیاس دہلوی نے پہلی بار کارٹون کی شکل میں لطائف اور کہانیاں شامل کیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے رسالے میں پہلی بار کہانی اور نظم کی مناسبت سے کھلونا میں ملازم آرٹسٹوں سے تصاویر بنوائی جاتی تھیں۔ اس زمانے کے آس پاس یا اس سے پہلے یا بعد میں بچوں کے کئی رسائل شائع ہوئے۔ جس میں بریلی سے ٹافی، مرادآباد سے چندا نگری، بجنور سے غنچہ، لکھنؤ سے کلیاں وغیرہ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے بھی بچوں کے کافی رسائل شائع ہوئے۔ جن کی ایک طویل فہرست ہے مگر وقفے وقفے سے قاری کی بے اعتنائی اور مالی بحران کی وجہ سے بند ہوتے گئے۔ جن رسائل کو تاریخ کے اوراق بھلا نہیں پائیں گے ان میں سب سے اہم 'کھلونا' مکتبہ الحسنات کے رسالے 'نور' اور حلال، لکھنؤ کا کلیاں ہیں۔

ادب اطفال میں اچھے اور معیاری ہر طرح کے ناول بھی لکھے گئے۔ سراج انور کے ناول نیلی دنیا، کالی دنیا، خوفناک جزیرے، کرشن چندر کے ستاروں کی سیر، الٹا درخت، مالیگاؤں کے یوسف انصاری نے جہاں روسی ادب اطفال اور فارسی ادب سے ترجمے کیے جن کی تعداد تقریباً سو ہوتی ہے انھوں نے بھی ایک ناولٹ زہرہ کا سفر لکھا اور دسیوں کامک کہانیاں لکھیں اور اپنے شاہین پبلی کیشنز اردو کے کامکس شائع کیے۔ شوکت تھانوی نے بھی بچوں کے لیے ناول اور ناولٹ لکھے۔ اس کے علاوہ اسی کی دہائی تک ادب اطفال کا ایک سنہرا دور رہا۔ جس میں کہانیاں، نظمیں، ناول، ڈرامے، کامکس وغیرہ کافی تعداد میں لکھے گئے اور قارئین میں مقبول بھی ہوئے۔ مگر سنہ 80ء کے بعد جیسے ادب اطفال پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا اور لگنے لگا کہ شاید ادب اطفال اپنی زندگی کی آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ادب اطفال میں پھر سے زندگی کی حرارت محسوس کی جانے لگی اور بچوں کا ادب نئی توانائی کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلانے لگا۔

یہاں تک ادب اطفال کے ماضی کی روشن تصویر کو بیان کرنے کا مقصد تھا کہ عصر حاضر میں رونما ہونے والی متحیرانہ سائنسی اور تکنیکی تبدیلیوں کے مطابق اردو زبان میں ادب اطفال کی اہمیت اور افادیت کا تعین اور ترجیحات کا احاطہ کیا جا سکے۔ یہ انکشاف شاید کچھ حضرات کو سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ میں اردو زبان اور ادب اطفال کے تعلق سے جو اعداد و شمار یہاں پیش کر رہا ہوں وہ حیران کن ہیں۔ اب آیئے ادب اطفال کے اعداد و شمار پر نظر ڈالتے ہیں۔ انگریزی زبان کا ادب اطفال سب سے زیادہ انگلینڈ میں 96 فی صد لکھا، پڑھا جاتا اور شائع ہوتا ہے۔ جب کہ لندن شہر میں یہ صد فی صد ہے۔ کناڈا میں 79 فی صد جرمنی میں 82 فی صد ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اردو ادب اطفال کل 37 فی صد ہے۔ جب کہ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں حیرت انگیز طور پر 25 فی صد ہے جہاں اردو کے تقریباً ساٹھ رسائل نکلتے ہیں اور بہت ضخیم کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے مگر اعداد دوسری داستان بیان کرتے ہیں یعنی برصغیر ہند و پاک میں ادب اطفال کی حالت دگرگوں ہی کہی جا سکتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم مجموعی طور پر ادب اطفال کے لیے کتنے سنجیدہ اور فعال ہیں۔ یہ اعداد و شمار کیا سیکڑوں سوالات کے ساتھ ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں؟

"اگر عالمی پیمانے پر ادب اطفال کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انگریزی اور چینی زبان میں ادب اطفال کی روایت قدیم ترین ہے۔ اس کے بعد روسی اور اطالوی زبان آتی ہے۔ ہماری ہند آریائی زبان میں بھی ادب اطفال کی تاریخ زمانہ قدیم سے ہے، جہاں پرانوں کی کہانیاں سب سے قدیم مانی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باقاعدہ آثار پنچ تنتر کی کہانیوں اور بیتال پچیسی میں ملتے ہیں۔ ان کہانیوں کا بھی مرکز مٹھ یا پاٹھ شالائیں تھیں اور ہندو مذہب میں بھی کہانیوں کا بیان عورتوں کی زبان کے ذریعے ہی تھا۔ یعنی ادب اطفال کی ترویج کا ایک اہم ذریعہ مستورات ہی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ بچہ زمانہ طفلی سے شعور کی منزل پر پہنچنے تک ماں کے زیر اثر رہتا ہے۔"

یہ حال ہے ہماری زبان اردو اور ادب اطفال کا جہاں آج ہم ایک چوراہے پر کھڑے ہیں اور اس کشمکش میں مبتلا ہیں کہ سامنے کا راستہ ایک شاندار، کامیاب مستقبل کی جانب جاتا ہے۔ جب کے ہمارے پیچھے کا راستہ ہمیں ناکامیوں، نامرادیوں کے اندھیرے میں ضم کرنے کے لیے کافی ہے اور دائیں بائیں صرف بھٹکنے والوں کے لیے ہے۔ زندگی میں صرف ادب ہی نہیں ہر شعبہ حیات میں اکیسویں صدی کے نزدیک پہنچتے پہنچتے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایسی حیرت انگیز تبدیلیاں یا ترقیاں رونما ہوئیں کہ متحرک اذہان ایک خلفشار کا شکار ہونے لگے اور ہر لمحہ سائنسی ایجادات کے بدلتے منظرنامے سے انگشت بدنداں ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے ہم رکاب کرنے کی کوشش شروع کردی۔ چاہے ادب ہو یا کوئی بھی شعبہ حیات ہو، جنھوں نے اپنے آپ کو وقت کے دھارے کی سمت اور رفتار سے مطابقت دے لی وہ کامیابی کی بلندیوں پر نظر آنے لگے جو چوک گئے یا بے اعتدالی برتی وہ ماضی بن گئے۔ تبدیلی قانون فطرت ہے تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کو اپنانا زندہ قوموں کی نشانی ہے۔ ادب میں عمومی طور پر اور ادب اطفال میں خصوصاً اس کا اطلاق ضروری ہے۔ بچہ آنے والے مستقبل کا فرد ہے اور مستقبل سائنس وٹیکنالوجی کی حیراں سامانیوں کے ساتھ ظاہر ہوگا، اگر اس کی تیاری آج کا بچہ نہیں کرے گا تو جینا محال ہوگا۔

اکیسویں صدی میں انسانی رویوں اور سوچ میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی کہ وہ ٹیکنالوجی کی یلغار کی وجہ سے اس کا اسیر ہوگیا جس کی وجہ سے وہ تمام انسانی وسماجی سروکاروں سے بے بہرہ ہوگیا اور اس کی دلچسپیوں کا سامان سائنس وٹیکنالوجی کی بے ہنگم ترقی میں ضم ہوکر نتیجے کی ہاں یا نا کے عملی ثبوتوں پر مرکوز ہوگئے اور اس کا سب سے زیادہ شکار نسل نو ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی پریشانی ادب اطفال میں آئی۔ کیوں کہ آج کا بچہ تخیلاتی دنیا میں جینا نہیں چاہتا۔ وہ حقیقت جاننا چاہتا ہے کیوں اور کیسے؟ آج کا بچہ کسی بھی شعبہ حیات میں سائنٹفک حقائق کی روشنی میں اس عمل کا جواب چاہتا ہے۔ اس لیے وہ کتب بینی سے اس لیے دور ہے کہ وہاں اس ادب میں اس کو تصوراتی اور تخیلاتی دنیا کی غیر یقینی سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو اس کے ہاں یا نا کے حل کی نفی کرتا ہوا لگتا ہے۔

آج کا بچہ ہر لحظہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی سے اسکرین کا عادی ہوگیا ہے۔ چاہے وہ ٹی وی پر کارٹون کہانیاں پوکے مان، سیان چینگ، ہو یا کمپیوٹر پر انٹرنیٹ سرفنگ سے خلائے بسیط میں خلائی جہازوں یا راکٹوں کے ذریعے دوسرے سیاروں کے اسفار ہوں، ان کی جانکاری یا موبائل پر مختلف گیمز، وہاٹس ایپ یا دوسری ایپس ہوں ان سے کائنات کے ان رازوں سے واقفیت حاصل کرتا ہے جو تخیلات کی دنیا سے نکال کر اسے رازہائے کائنات سے روشناس کراتے ہیں۔ جو اس کی دلچسپی کا سامان تو فراہم کرتے ہی ہیں مگر حقیقت کی ایسی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ چاند کی بڑھیا کے تصوراتی خیال کو یکسر بھلا کر سرخ سیارے کی سرخی کی گتھی سلجھانے کی جانب کمر بستہ نظر آتا ہے۔ آج ہر زبان کا ادب اطفال، اگر وہ آج کے دور سے مطابقت نہیں رکھتا اور دور حاضر کے بچوں کے رجحان، دلچسپیوں اور اس کی ذہنی پرواز کو گرفت میں نہیں لیتا تو وہ بے ثباتی اور اس سے دوری کا سبب بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس صورت حال میں اردو کا ادب اطفال کہیں بچھڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے ماضی کے مقابلے آج کتابیں بہت شائع ہو رہی ہیں۔ بہت ادب اطفال لکھا جا رہا ہے مگر معصوم قاری ندارد ہے۔ کیا کبھی تخلیق کاروں، شاعروں نے سوچا ہے کہ وہ جو ادب تحریر کر رہے ہیں، جس کے لیے تحریر کر رہے ہیں وہ اس قاری کے ذہنی میلانات کو طے کر رہا ہے اس کی دلچسپیوں اور اس کی ضرورتوں کے مطابق ہے۔ اگر نہیں تو یقیناً بچے کی افتاد طبع اور رجحان کا معیار اس کی کتب بینی اور ادب سے دوری کا باعث ہوگا۔ جیسا کہ میں نے کہا دور حاضر کا بچہ ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کا اتنا اسیر ہوگیا ہے کہ آج خلائی فنتاسی، ماحولیات، سائنسی کہانیاں اس کی دلچسپی اور ترجیحات میں سے ہیں۔ ہمارا ادب اطفال اس فرسودہ اور کلاسیکی تحریروں کے سحر سے نہیں نکل سکا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آج کا قاری ادب اطفال پڑھنا نہیں چاہتا اس کی توجہ ادب اطفال کی جانب مبذول کرانے کے لیے ہمیں دور حاضر کے حساب سے ادب اطفال میں نئے رجحانات، اور ایجادات کو ادب اطفال میں بروئے کار لانا پڑے گا۔ ہم تو آج تک اردو کے بچوں کے ادب میں کارٹونی کہانیوں کا سلسلہ رائج نہیں کر سکے۔ صرف امنگ اور گل بوٹے میں کارٹونی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ وہ بھی وہی پرانے طرز کی کہانیوں پر مبنی۔ ہم چچا چھکن کی طرح کوئی مقبول عام اسکرین پر کردار پیدا نہیں کر سکے جبکہ ہمارے ہی ملک کی ہندی زبان میں چھوٹا بھیم جیسا مقبول کردار جو آج پوری دنیا میں دیکھا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کے معاشرے سے نکلا ہوا کردار روشن دماغ کی نشانی ہے۔ اس کے آگے کتابوں کی دنیا کی بات کریں تو انگریزی کی مصنفہ جے کے راؤلنگ کی ہیری پوٹر سیریز کو لیں تو پتہ چلے گا کہ جادو کی پرانی کہانیوں کو نیا لباس پہنا کر راؤلنگ نے لاکھوں قارئین کی دلبستگی کا کام کیا بلکہ آج وہ دنیا کی امیر ترین مصنف میں شمار ہوتی ہے۔ کیا ہمارے قلمکار حضرات کے پاس سائنسی سوچ ونظریات کا فقدان ہے۔ کیا ہماری سماجی معاشرتی اور فکری دنیا الگ ہے۔ کیا ہم ایک پچھڑی ہوئی ہاری قوم ہیں جو عصر کے روشن سائنس و ٹیکنالوجی کے ہالوں سے بے بہرہ وقت کے اندھیروں میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ نہیں بالکل نہیں۔ ہمارا ماضی بہت روشن رہا ہے جہاں ہم نے دنیا کو سائنس طب ارضیات معاشیات اور بہت سے ایسے میدان جہاں انسانیت کی پہنچ نہیں تھی وہ ایجادات اور فکر و فلسفہ دیا۔ یہ بھی درست ہے کہ اردو ادب ہر زمانے میں اس کے تقاضوں کے لحاظ سے اپنے آپ کو ایک مضبوط اور متحرک ادب بن کر پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

آج ہمیں ضرورت ہے کہ ہم دنیا اور وقت کے بدلتے منظرنامے کے مطابق اپنے اردگرد ادب اور سوچ کو ڈھالیں۔ آج ضرورت ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات کو ادب اطفال کے لیے بروئے کار لاتے ہوئے، کارٹون کہانیاں، اینیمیشن، سائنس فنتاسی، دلچسپ ناول جن میں خلائے بسیط کے قصے، جاسوسی قصے جس میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہو، وہ کردار جو سائنس کی نئے نئے ایجادات کا استعمال کر کے ماسٹر فار آل ایکشن ہو ادب اطفال میں ان سب کی آمیزش اور بہتایت کی ضرورت ہے۔ اردو میں بچوں کا ادب لکھنے والوں کو ان سب باتوں اور سائنس وٹیکنالوجی کی ایجادات اور سائنسی رجحانات کی سوچ سے پر ادب تحریر کرنا ہوگا تب ممکن ہوگا کہ اردو ادب اطفال کا معصوم قاری کتب بینی کی جانب متوجہ ہو۔ تحریر کرنے کے لیے اور بہت کچھ ہے مگر یہ موضوع دور حاضر کے حساب سے کافی طویل گفتگو کا متقاضی ہے جس پر سیر حاصل تبصرہ اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ میں وقت کی قلت اور طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات یہاں ختم کرتا ہوں۔ ادب اطفال کو دور حاضر کے مطابق تحریر کرنے اور قاری کو اس جانب راغب کرنے کے لیے ہمیں عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ادب اطفال کو تخلیق کرنا پڑے گا۔

■

Mohammad Siraj Azeem
A-47, Zakir Bagh,
Opp. Surya Hotel, Okhla Road
Jamia Nagar
New Delhi-110025

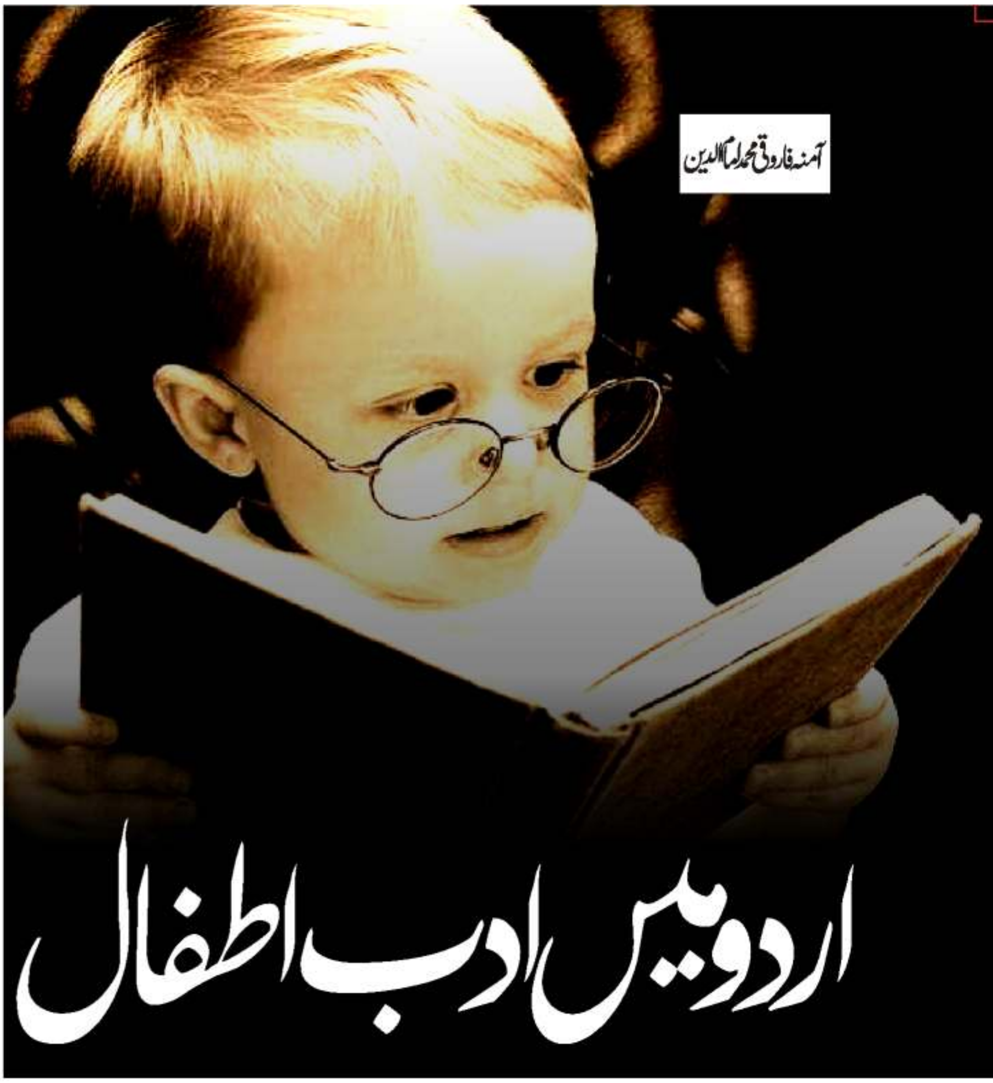

اردو میں ادب اطفال

آمنہ فاروقی محمد امام الدین

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خاندان، قوم اور ملک کے روشن مستقبل کا انحصار بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے۔ آج کا بچہ کل کا شہری ہے، اس لحاظ سے بچے 'قومی امانت' ہوتے ہیں اور اس امانت کا تحفظ معاشرے کے ہر فرد کی ذمے داری ہے۔ یہ ذمے داری تقاضا کرتی ہے کہ معاشرے، قوم و ملک کا مفید خادم بنانے کے لیے اس کی جسمانی نشوونما کے ساتھ اس کی عمدہ ذہنی تربیت اور شخصیت کی متوازن نشوونما پر بھی توجہ دی جائے۔ اس مقصد کے حصول میں 'ادب' ایک اہم اور مؤثر وسیلہ ثابت ہوا ہے، مگر افسوس کہ ہم نے اس 'مؤثر وسیلے' کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اسے دینا چاہیے تھی۔ ہمارے اکثر ادیبوں، ناقدوں اور محققین نے ادبِ اطفال سے بے اعتنائی برتی اور اسے بچکانہ سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کے لیے لکھنا کسرِ شان سمجھا۔ اسی بے اعتنائی کا نتیجہ ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب کا سرمایہ کیا کیفیت اور کیا کمیت دونوں اعتبار سے ناقص و کمزور ہے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ادب اطفال کا کوئی معیار مقرر نہیں ہوسکا۔ بیشتر ایسا سرمایہ ہے جن میں بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی سطح، ان کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کا مطلق خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ اردو کی ٹریجڈی ہے کہ جس ادب پر اردو زبان کی بقاء اور بچوں کے مستقبل کا انحصار ہے اسی کو ہم نے اکثر نظر انداز کیا ہے۔ مقام شکر ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں ہمارے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققین نے اس ادب پر توجہ دینا شروع کیا ہے۔

بچوں کی طرح ان کا ادب بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ادبِ اطفال کے اثرات دیر پا اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف بچوں کی مسرت میں اضافہ کرتا ہے، بلکہ ان کے اعمال و اقدار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے کردار کی تخلیق میں ادب ہی اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اردو میں بچوں کے ادب کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ بچوں کا ادب کسے کہتے ہیں؟ ایک عرصے تک بچے کی شخصیت نظر انداز کی جاتی رہی ہے لیکن نفسیاتی تحقیقات و انکشافات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ:

''بچہ ایک جامد تختی نہیں بلکہ ایک زندہ متحرک اور باشعور ہستی ہے'' [1]

بچوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے، ان کی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے، ان کی اپنی ضرورتیں اور دلچسپیاں، احساسات، سوجھ بوجھ، شعور اور عادتوں میں تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ غرض بچوں کے شعور احساس اور فہم و ادراک کی دنیا بڑوں سے بالکل الگ ہوتی ہے اس لیے:

''وہ ادب جس کے ذریعے بچوں کی دلچسپی اور شوق کی تسکین ہو اور جو مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات، ضرورتوں، دلچسپیوں، میلانات اور ان کی فہم و ادراک کی قوت کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہو صحیح معنوں میں 'بچوں کا ادب' کہلانے کا مستحق ہے۔'' [2]

اس اعتبار سے جب ہم اردو میں بچوں کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ معیاری ادب کی کمی کا یہ نتیجہ ہے کہ بچوں کی صحیح ڈھنگ سے ہمہ جہتی نشوونما نہیں ہو پارہی ہے۔ خواندگی اور اکتساب علم کے ابتدائی مراحل میں بچوں کے لیے زائد از نصاب لٹریچر بے حد ضروری ہے۔ اس لٹریچر کی بدولت جہاں مطلوبہ لسانی مہارتوں کا حصول سہل ہوتا ہے، وہاں اس سے ان کی ذہنی و جذباتی نشوونما میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اور تعلیم کے اعلیٰ مراحل طے کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اردو میں ادبِ اطفال کی ابتدا اور نشوونما شاعری ہی سے ہوئی اور دکنی دور نیز شمالی ہند کے ابتدائی دور میں بچوں کے ادب کے تحت منظومات کا ہی اضافہ ہوتا رہا۔ نثر میں اٹھارہویں صدی کے اواخر تک کوئی قابل ذکر تصنیف ایسی نہیں ملتی جس کو ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرسکیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کی تحقیق کے مطابق 1793 میں سب سے پہلے لکھنؤ کے اِنشاء اللہ خاں اِنشا نے بچوں کے لیے نثری تصنیف 'رانی کیتکی کی کہانی' پیش کی۔ بقول ڈاکٹر مظفر حنفی:

''اِنشاء اللہ خاں اِنشا کی یہ کہانی نہ صرف بچوں کے لیے سب سے پہلی نثری کہانی ہے، بلکہ ہندی اور اردو دونوں کے افسانوی ادب (Fiction) کی ابتدا ہی اِنشاء اللہ خاں اِنشا کی اس تخلیق سے ہوتی ہے اور اس کو بچوں کے ادب کا سنگِ بنیاد کہا جاسکتا ہے۔'' [3]

مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی، اسماعیل میرٹھی، نذیر احمد دہلوی، سورج نارائن مہر اور محمد حسین آزاد نے بچوں کے لیے خوب لکھا۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور الطاف حسین حالی پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے قصّے کو باقاعدہ اخلاقی تربیت کے لیے استعمال کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد واحد بزرگ ہیں جنھوں نے بچوں کے قواعد زبان و بیان اور اِملا کی درستگی پر خاصا زور دیا اور اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھی۔

جنوری 1802 میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی زیر نگرانی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا اور جان گلکرسٹ نے اردو لغت مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ چند نامور اہل قلم کی خدمات حاصل کیں۔ چونکہ یہ ادارہ انگریز فوجیوں کو اردو زبان سکھانے کے لیے قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت میر امن دہلوی، رجب علی بیگ سرور، حیدر بخش حیدری، للولال جی، اور دیگر ماہرین نے عربی، فارسی اور ہندی ادب کو جن میں داستانیں بھی شامل تھیں اردو کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔ یہ داستانیں روانی اور سلاست کے اعتبار سے بچوں کے ادب کے لیے انتہائی مناسب کرداروں، بہادری، سچائی، دانائی اور سبق آموز تحریروں و واقعات سے مزین ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ اردو ادب کا بہترین سرمایہ یکجا کیا گیا اور اس کالج کی تصانیف سے برصغیر میں بچوں کے ادب کا دامن مالا مال ہوا۔ ابتدائی اٹھارہویں صدی عیسوی میں ولی دکنی اور ان کے دیوان کی دہلی میں آمد کے بعد سے شمالی ہند میں بھی لکھنے والے اردو میں ادبی تخلیقات پیش کرنے کی جانب مائل ہوئے، جن میں بچوں کا ادب بھی شامل ہے۔ چنانچہ میر تقی میر جیسے عظیم المرتبت غزل گو کی کلیات میں بھی بچوں کے لیے مثنوی نما نظمیں مل جاتی ہیں۔ یہ اپنے موضوع اسلوب اور زبان ہر اعتبار سے بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان میں بطور خاص موہنی بلی، بکری اور کتے، مور نامہ، مچھر، کھٹمل، وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن کو ہم ادبِ اطفال میں شامل کر سکتے ہیں۔

میر تقی میر کے بعد بچوں کے شاعر کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ نظیر نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادہ زبان ہے، جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے پاک ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں بچوں میں حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں اخلاقی اقدار اور قومی تشخص کے نقوش کو ابھارتی ہیں۔ محمود الرحمٰن نے نظیر اکبر آبادی کی ایسی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

"اردو میں بچوں کے لیے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس میں نہ صرف پند و نصیحت کارفرمائی ہے بلکہ مذہبی عناصر کی جلوہ گری بھی ہے۔ صحیح معنوں میں نظیر اکبر آبادی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب کو مذہب اور لغت کی سنجیدہ بزم سے نکال کر نونہالوں کے بزم میں پہنچا دیا ہے۔ جہاں ان کے اپنے جذبات اور احساسات نمایاں ہیں۔"[4]

ان کی کلیات میں ایسی بہت سی نظمیں مل جاتی ہیں جو بچوں کے ادب میں قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس ضمن میں نظیر اکبر آبادی کی ایامِ طفلی، معصوم بھولے بھالے، تربوز، کن کوے اور پتنگ، گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، تل کے لڈو، ہرن کا بچہ، واہ کیا بات کورے برتن کی، وغیرہ بچوں کی پسندیدہ نظمیں ہیں۔ بچوں کے لیے جتنا کچھ نظیر اکبر آبادی نے لکھا ہے، ان سے قبل اردو میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لکھا۔ ان کی نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں اخلاقی اقدار پر زور دیا گیا ہے یہ نظمیں اپنے پرلطف پیرایہ بیان اور طرز ادا کی وجہ سے خشک اور بے کیف محسوس نہیں ہوتی۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ بچوں کے ادب کی ہم بات کرتے ہیں تو خیال سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد کی نظم و نثر کی طرف ہی جاتا ہے، لیکن دراصل اس کی اولیت کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے۔ 'قادر نامہ' میں ان کے اس طرح کے اشعار۔

وہ چراوے باغ میں میوہ جسے
پھاند جانا یاد ہو دیوار کا
پل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ
ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا
واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق بھی سے ہے تجھے اشعار کا

یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالب بچوں کے ادب کی ضرورت سے غافل نہ تھے، یہ الگ بات ہے کہ غالب کی پرواز بہت اونچی تھی اور اس سطح پر زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی بات ہم اقبال کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال کے یہاں بھی اس نوع کی نظمیں بہت ہیں جنھیں ہم بچوں کی نظمیں کہہ سکتے ہیں۔ ایسی نظمیں 'بانگ درا' میں بھی شامل ہیں اور اقبال کے دیگر کلام میں بھی۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی اقبال کی بعض نظمیں بعض انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں۔ اقبال نے خود اس بات کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ ایسے خوبصورت ترجمے ہیں کہ ان پر طبع زاد شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ عبدالقوی دسنوی رقمطراز ہیں:

اقبال بچے کے ذہن کی تعمیر اس طرح کرنا چاہتے تھے۔ جس سے وہ ایسا انسان بن سکے جو خدا آگاہ ہو، صداقت شعار ہو، حریت پسند ہو، ہمدرد مجسم ہو، غرور و تکبر کی لعنت سے پاک ہو، محسن شناس ہو خدمت گزار ہو، غریبوں کا مددگار ہو، کمزوروں کا حامی ہو، وطن پرست ہو انسان دوست ہو برائیوں سے پاک ہو اور پیکر عمل ہو۔[5]

محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ نے اردو میں مختلف اصناف اور موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ ان لوگوں کی تحریروں میں بچوں کے لیے بھی بہت سی تخلیقات نظم و نثر میں موجود ہیں۔ شفیع الدین نیر نے بچوں کے ادب کے جس وافر ذخیرے کا ذکر کیا ہے وہ محمد حسین آزاد، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، اور سر سید احمد خاں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ کہ اردو ادبِ اطفال میں سنہ 1857 کی جنگ آزادی ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، جس کے زیر اثر شعر و ادب کی قدیم اور فرسودہ روایات میں ایک تغیر رونما ہوا۔ تخیل سے کنارہ کشی کر کے حقیقت آرائی کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ معاشرے اور پوری ادبی دنیا میں بدلتے ہوئے ان حالات نے بچوں کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ یہ وہ سیاسی اور سماجی ماحول تھا جس میں حالی، شبلی، نذیر احمد، اور آزاد کی پیشروی میں چکبست، اقبال، سرور جہاں آبادی، اسماعیل میرٹھی، تلوک چند محروم جیسے شعرا نے بچوں کے اخلاق عادات اور ان کی ذہنی نشو و نما سے متعلق مفید اور ادبی حسن سے آراستہ نظموں اور کہانیوں کی تخلیق کی اور اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے ادبِ اطفال کی بنیادیں مستحکم کیں۔ ان فنکاروں نے بچوں کے جذبات اور خیالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی تخلیقات پیش کی جن میں نہ صرف بچوں کی دلچسپی کا سامان بکثرت تھا بلکہ یہ ان کے سن و سال اور مذاق و مزاج سے مطابقت و موافقت بھی رکھتی تھیں۔ آزاد کی مرتب کردہ کتابیں بچوں کی اخلاقی تربیت اور زبان کی درس و تدریس کے مطالبات پورا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں مختلف مضامین کی تعلیم بھی دیتی ہیں۔ اس طرح صحیح معنوں میں ہمارے یہاں بچوں کے ادب کی شیرازہ بندی کرنے اور درسی کتب کو جدید تقاضوں کے مطابق منظم کرنے کا ابتدائی معرکہ محمد حسین آزاد نے ہی سر کیا۔ ڈاکٹر اسد اریب نے محمد حسین آزاد کو بچوں کی درسی کتب کا بانی قرار دیا ہے۔[6]

محمد حسین آزاد نے اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب اور بچوں کے لیے نظمیں سلام علیک، جیسا چاہو سمجھ لو، ہے امتحاں سر پر کھڑا، زمستان، شبِ سرما، شبِ ابر، ہمتِ مرداں، جاڑا جیسی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ ان میں ہمتِ مرداں مقبول ترین نظم ہے۔ اس نظم کا ایک بند بطور نمونہ۔

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

منظومات کے علاوہ محمد حسین آزاد نے نثر میں بھی بچوں

کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ان کی نثری تصانیف میں آئینہ صحت، قصص الہند، اور نصیحت کا کرن پھول وغیرہ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ بلا شبہ آزاد اردو ادبِ اطفال کے معماروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ مولانا حالی نے قوم کے نونہالوں کی فلاح و بہبود اور ان کی بہترین ذہنی اور جسمانی تربیت پر ہمیشہ زور دیا۔ حالی ایک ماہر تعلیم تھے، ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ محکمۂ تعلیم میں گذرا، یہی سبب ہے کہ حالی بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی پیچیدگیوں، ان کی ضروریات اور مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ حالی کی بیشتر تحریروں میں بچوں کے لیے بہت سی تخلیقات نظم و نثر میں موجود ہیں۔ حالی کو لڑکیوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کی بڑی فکر رہتی تھی۔ اپنے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے حالی نے 'مجالس النساء' لکھی۔ یہ کتاب لڑکیوں کے لیے سب سے پہلی درسی کتاب ہے۔ اگر چہ 'مجالس النساء' سے قبل ڈپٹی نذیر احمد کی 'مراۃ العروس' آچکی تھی، لیکن 'مراۃ العروس' اور 'مجالس النساء' میں بڑا فرق یہ ہے کہ نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی تھی۔ جبکہ حالی نے 'مجالس النساء' لکھتے وقت پوری قوم کی بچیوں کی تعلیم و تربیت پیش نظر رکھی تھی۔

'مجالس النساء' کے ذریعے حالی نے لڑکیوں کی تعلیم عام کرنے پر زور دیا ہے، ساتھ ہی ان میں سماجی بیداری، اپنی ذمے داری اور اپنے حق کو پہچاننے کا جذبہ بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حالی نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ زبان اسلوب اور موضوع ہر اعتبار سے حالی کی ایسی نظمیں صرف بچوں کے لیے ہیں، یہی سبب ہے کہ اسماعیل میرٹھی نے اردو زبان کی پانچویں کتاب میں حالی کی نظمیں امید، علم کی ضرورت، راست گوئی اور اپنی ترقی آپ کرو شامل کی ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ خدا کی شان، غوث اعظم، جواں مردی کا کام، میں کسان بنوں گا، سپاہی، موچی، پیشہ، دھان بونا، نیک بنو، بلی اور چوہا، نیکی پھیلاؤ، مرغی اور اس کے بچے، شیر کا شکار، لاڈلا بیٹا، ایسی نظمیں ہے جو حالی نے خاص بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ اپنی نظم 'کہنا بڑوں کا مانو' میں کہتے ہیں۔

ماں باپ اور استاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمھارے زحمت
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو
دنیا میں کی جنھوں نے ماں باپ کی اطاعت
دنیا میں پائی عزت عقبی میں پائی راحت
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو
ماں باپ کی اطاعت دونوں جہاں کی دولت
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

اِسماعیل میرٹھی جو ادبِ اطفال کے شہنشاہ کہلائے جاتے ہیں، اردو ادب میں ادبِ اطفال کی بہترین کتابیں وہ مانی جاتی ہے جو اسماعیل میرٹھی نے مرتب کیں۔ ان درسی کتابوں کے لیے میرٹھی نے جو حکایات خود لکھی ہیں ان میں بیشتر کے ماخذ سنسکرت کی 'پنچ تنتر' اور فارسی کی 'بستانِ حکمت' اور 'انوارِ سہیلی' ہیں یہ حکایات اخلاقیات، مذہب کی تعلیم پر مبنی ہیں۔ ان میں بہادروں کے کارنامے بھی شامل ہیں، باجے کا بھوت، ایک شیر اور چیتا، سرکشی کا انجام، محمود غزنوی اور بڑھیا، محنت سونے سے بہتر ہے وغیرہ اِسماعیل کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

ان درسی کتابوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتابیں بچوں کو جہاں زبان سکھاتی ہیں، وہاں ان کو سائنس، عام معلومات، تاریخ جغرافیہ اور زراعت پر مفید مواد فراہم کرتی ہیں۔ ایسے معلوماتی اور سائنسی مضامین میں پانی کی شکلیں، پلاٹینم، سونا، چاندی، پارہ، انسان کا بدن، ہوا اور پانی، کوئلے کی کان، چھاپے کی ایجاد، ریلوے انجن کا موجد جارج، قوس قزح، وغیرہ لائق ذکر ہیں۔ اِسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے تاریخی مضامین بھی لکھے۔ ان مضامین کے ذریعے تاریخی شخصیتوں سے روشناس کرایا ہے۔ جلال الدین اکبر، نور جہاں، ارسطو، راجا بکرما جیت، شیر شاہ سوری، محمود غزنوی اور بڑھیا، نوشیروانِ عادل، تیمور، راجہ بیربل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اقبال کی ان تخلیقات کو ادبِ اطفال میں شاہکار نظموں کا درجہ حاصل ہے، جو 'بانگ درا' کلام میں شامل ہیں۔ ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدردی، ایک پرندہ اور جگنو، پرندے کی فریاد، ہندوستانی بچوں کا گیت (میرا وطن) ان نظموں میں پہلی چھ انگریزی سے ماخوذ ہیں اور آخری دو نظمیں اقبال کی طبع زاد تخلیقات ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ اقبال کی فلسفیانہ نظمیں عہد طفلی، بچہ اور شاعر، بچہ اور شمع، طفل شیر خوار، ماں کا خواب وغیرہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ابتدا ہی سے اقبال بچوں کے بارے میں غور و فکر کرتے رہے تھے۔

بچوں کے شاعر کی حیثیت سے تلوک چند محروم کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ جنھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کی ذہنی نشو و نما کے لیے صحت مند شعری ادب تخلیق کیا۔ محروم کی ایسی نظموں کے مجموعے 'بہارِ طفلی' اور 'بچوں کی دنیا' کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ صرف 'بہارِ طفلی' میں پچیس نظمیں ہیں، جس میں خدا کا شکر، ہمارا دیش، سویرے اٹھنا، اچھے کام، محنت، صفائی، دشمنی، ہم ہر گز جھوٹ نہ بولیں گے، جھوٹ بڑا پاپ ہے، اچھا آدمی، پھول برسات وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔ بچوں کی دنیا کی نمائندہ نظموں میں دعا، خدا کی قدرت، بچوں کا نیا سال، اچھا بچہ، صبح ہولی، پہلے کام پیچھے آرام، میری کتاب، جھوٹ، استاد کی چھڑی، ورزش، قرض، بارش، گنگا، وقت کی پابندی، ان کی ایسی نظمیں ہیں جو اپنی افادیت اور معنویت کے سبب بچوں کی درسی کتب میں بھی شامل ہیں۔

تلوک چند محروم بچوں کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے صرف نظمیں ہی لکھی، ایسی تمام نظمیں اردو ادبِ اطفال کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی اور زمانے کے ساتھ ہی بدل جاتے ہیں موسم، آب و ہوا اور انسان تک۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج بھی بچہ اسی صدیوں پرانے اس زمانے میں موجود ہے۔ اس کا بچپن آج بھی دادی، نانی کی کہانیوں کے لیے ہمک رہا ہے۔ اور میں تو یہاں تک وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ کہانی نے اگر جنم لیا ہوگا تو وہ پہلی کہانی کسی بچے کے لیے اس کی نانی یا دادی کے ذریعے سنائی گئی کہانی ہی ہوگی۔

اردو ادبِ اطفال کی کہکشاں میں کئی بڑے ادیب ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا دشوار طلب ہے، لہٰذا جن ادیبوں کا ادب مطالعے سے گزرا اسے قرطاس پر لکھ لیا۔ میں جانتی ہوں کہ میں تمام ادیبوں کے ساتھ انصاف نہ کر پائی۔ اگر تمام کا ذکر کروں تو مقالہ طویل ہو جائے گا لہٰذا اپنے مضمون کو مختصر اور جامع کرتی ہوں تا کہ عنوان سے ہٹ نہ جائے اور مضمون کی اہمیت واضح ہو جائے اور قصہ مختصر ہو جائے۔

حواشی

1 اردو میں ادبِ اطفال: ایک جائزہ، پروفیسر اکبر رحمانی 1991، ایجوکیشنل اکادمی اسلام پورہ جلگاؤں، ص 68
2 ایضاً، ص 68
3 ڈاکٹر مظفر حنفی: اردو میں ادبِ اطفال، مشمولہ جہات و جستجو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 84
4 محمود الرحمٰن 'آزادی کے بعد بچوں کا ادب' ماہنامہ کتاب لاہور بچوں کا ادب نمبر جنوری 1979، ص 9، مدیر ذوالفقار احمد تابش
5 عبدالقوی دسنوی 'بچوں کے اقبال' نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ص 39-38
6 ڈاکٹر اسد اریب: بچوں کا ادب، کاروانِ ادب 1982، ص 48

■

Amena Farooqui Mohd Imamuddin
Pramila Devi Patil Arts & Science College
Neknoor,
Distt: Beed-431122 (Maharashtra)
Mob.:9834249968

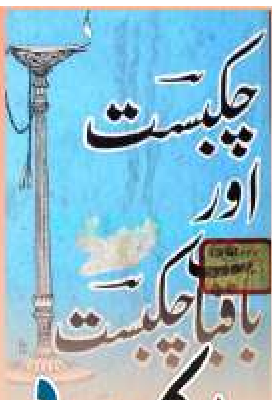

رؤف خیر

ملک التجار کالی داس گپتا رضا کی ادبی خدمات

مشرقی افریقہ ہم جیسے بیشتر لوگوں کے لیے ایک خواب ناک بلکہ خوفناک علاقے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مگر بعض جیالوں نے ایسے 'بے ادب' مقام کو بھی اپنی ذات سے سیراب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ تجارت کے سلسلے میں جناب کالی داس گپتا رضا نے اسے چنا۔ نیروبی۔ کینیا میں ہیرے جواہرات سے کھیلنے والے رضا صاحب مشرقی افریقہ کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کی ایک تحقیقی کتاب 'ہندوستانی: مشرقی افریقہ میں' دسمبر 1977 میں منظر عام پر آئی۔

کالی داس گپتا رضا صاحب کے اپنے بیان کے مطابق ان کا جنم 25 اگست 1925 کو مکند پور ضلع جالندھر کے مشہور اگروال خاندان میں ہوا۔ آپ کا خاندانی پیشہ ساہوکاری رہا ہے۔ تجارت ہی کی غرض سے رضا صاحب جون 1949 میں مشرقی افریقہ چلے گئے جہاں نیروبی میں 4 اگست 1956 کو آپ کی شادی ساوتری دیوی سے ہوئی جو لاچپت رائے گپتا کی صاحب زادی ہیں۔ رضا صاحب کے خسر تنزانیہ کے شہر اروشا میں مقیم تھے۔ مشرقی افریقہ سے کالی داس گپتا رضا 1970 میں ہندوستان لوٹ آئے اور بمبئی میں اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا۔

آپ نہ صرف بہت اچھے شاعر تھے۔ ظاہر ہے حضرت جوش ملسیانی جیسے ماہر زبان و بیان کے شاگرد تھے اور خود بھی عروض و زبان میں درجۂ استناد رکھتے تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے مختلف ادبی موضوعات پر دادِ تحقیق بھی دی۔ نہ صرف یہ کہ جناب کالی داس گپتا رضا نے خود بے شمار تحقیقی کارنامے انجام دیے بلکہ کوئی اللہ کا بندہ میدانِ تحقیق میں سرگرداں ہے تو جہاں تک ہو سکے دامے درمے سخنے اس کی مدد کرنے پر بھی ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ مشہور و معروف محقق و مدوّن و نقاد رشید حسن خان صاحب مثنوی سحر البیان کی تدوین میں مصروف تھے مختلف کتب خانوں سے اس کے ممکنہ نسخے منگوار ہے تھے۔ انھیں ایک ایسا مخطوطہ بھی چاہیے تھا جو حیدرآباد کے ایک ادارے میں موجود تھا مگر اس کے سربراہ اس کی نقل دینے پر راضی نہیں تھے کہ اس سے مخطوطہ کم زور ہو جاتا ہے۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے رشید حسن خان کی فرمائش مجھے لکھ بھیجی۔ میں نے اپنے ذرائع کام میں لاکر مثنوی سحر البیان کے مخطوطے کی نقل کروائی اور گپتا رضا صاحب کو بھیج دی جو انھوں نے رشید حسن خان تک پہنچادی۔

کالی داس گپتا رضا صاحب ہر قسم کے انعام سے بے نیاز تحقیق و تخلیق و تنقید میں شاہ کار پیش کرنے میں مصروف رہے تاہم اپنی خدمات کے اعتراف کیے جانے کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ وہ ایک زمانے تک شکوہ سنج بھی رہے کہ کوئی قابلِ ذکر انعام سے انھیں نوازا نہیں گیا پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ 2001 میں پدم شری جیسے اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا اور کالی داس جی صدرِ جمہوریہ سے یہ اعزاز حاصل کرنے کے لیے ممبئی سے دہلی پہنچ بھی گئے تھے مگر 22 مارچ 2001 کو اس تقریب کے انعقاد سے صرف تین گھنٹے پہلے ان کے قلب پر حملہ ہوا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ افسوس۔

قسمت تو دیکھیے کہ ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

'ہندوستانی مشرقی افریقہ میں' تقریباً ایک سو چالیس سال کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ جزائر زنجبار ومبا کے ساحلی علاقے پر سید سعید ملک التجار تھا جو اباضیہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ سلطان زنجبار انتہائی راسخ العقیدہ مسلمان تھا مگر حیرت کی بات یہ کہ وہ انتہائی سیکولر مزاج بھی تھا۔ اس کی تمام کروڑ گیری کا مختار Customs Master جے رام شوجی ہے جو پکا وشنو ہندو تھا یہ سلطان کا دستِ راست تھا۔ اس کی جے رام شوجی کمپنی مشرقی افریقہ کی معتبر کمپنی شمار ہوتی رہی ہے۔

تجارت کا دارومدار ذرائع حمل و نقل پر ہوتا ہے چنانچہ ریل گاڑیاں ممباسا سے نیروبی اور وکٹوریہ جھیل کے کنارے کسمو تک چلنے لگیں۔ کالی داس گپتا رضا نے افسوس کے ساتھ لکھا کہ بیسیوں ہندوستانی بھائی ریلوے لائن بچھاتے وقت شیروں کے منہ کا نوالہ بھی بنتے رہے۔ رضا صاحب نے بے شمار مصدقہ کتابوں کے حوالے سے مشرقی افریقہ کی تاریخ بیان کردی۔ وہاں آپ نے شعر و ادب کی محفلیں بھی برپا کر کے اردو ادب کو بھی زندہ رکھنے کے جتن کیے۔

(بحوالہ 'ہندوستانی مشرقی افریقہ میں' جلد اول مطبوعہ ول پبلی کیشنز چرچ گیٹ بمبئی 20، 1977)

مشرقی افریقہ میں مرزا غالب اور علامہ اقبال کا شہرہ سن کر کالی داس گپتا رضا کو بڑی خوشی ہوئی۔ ان شاعروں سے ان کی عقیدت میں اضافہ ہوا۔ بعد میں 'دیوانِ غالب' کی تاریخی اعتبار سے ترتیب کے علاوہ غالبیات کے سلسلے میں بے شمار تصنیفات و تالیفات نے جناب کالی داس گپتا رضا کو ماہر غالبیات بنا کر دم لیا۔ آپ نے 'غالب اور اقبال مشرقی افریقہ میں' لکھ کر اس دور کے اربابِ ذوق کی نشان دہی کی جنھوں نے مشرقی افریقہ جیسے صحرا میں بھی غالب و اقبال کے گلستان سجائے رکھے تھے۔ یہاں کالی داس گپتا رضا کی تحقیق پیش کی جاتی ہے: 'سبدِ گل' نمبر 2 صفحہ 17 مطبوعہ 1938 پر مقدمے میں درج ہے:

دوسرے مشاعرے میں بزم کا موضوعِ بحث غالب تھا۔ چنانچہ اس ایشیا کے امام الشعرا کی نہ صرف زندگی بلکہ اس کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی''۔

آگے گپتا رضا نے ایک ماہ نامے کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ماہ نامہ 'الادب' کے تیسرے شمارے جون 1945 میں ایک مضمون باسط مستقلی کا 'غالب کی صحبتیں' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں سید غوث علی شاہ قلندر اور غالب کی صحبتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا تھا''۔

ممباسا (کینیا) کے ایک سکول کے پرنسپل مہدی صاحب نے 1968 میں چونسٹھ صفحات کی ایک کتاب 'بزمِ غالب' کے نام سے چھاپی جو صد سالہ جشنِ غالب کے سلسلے میں مشرقی افریقہ سے غالب کے ایک پرستار کا ہدیۂ عقیدت ہے۔

اس کے علاوہ 1969 میں غالب صدی تقاریب کے

سلسلے میں خود کالی داس گپتا رضا کے دولت خانے پر ایک محفل نیروبی میں 15 مارچ 1969 کو کینیا ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس چانن سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ چالیس سے کچھ اوپر افراد جمع تھے۔ مشاعرے کے دو دور ہوئے پہلا طرحی اور دوسرا غیر طرحی۔ دونوں مشاعروں کے درمیان آدھے گھنٹے کے وقفے میں جناب کالی داس گپتا رضا نے تمام حاضرین کی چائے کیک وغیرہ سے تواضع فرمائی۔

(اس تقریب کی رپورٹ ماہ نامہ صبح امید ممبئی کے شمارے بابت جولائی 1969 میں شائع ہوئی تھی)

اس محفل میں غالب کو خراج عقیدت کی چند مثالیں پیش ہیں۔

اشعارِ نو کا روح و قالب غالب
ہر طور نئی بات کا طالب غالب
شاعر تھا ضرور وہ نرالا ورنہ
یوں ہوتی نہ شہر شہر غالب غالب
بالا ہے بلند ہے مقام غالب
مشہور ہے آفاق میں نام غالب
پوچھا کہ ہے اس وقار کا کیا باعث
آواز یہ آئی کہ 'کلامِ غالب'

(کالی داس گپتا رضا)

پرکیف اثر خیز، خرد مند، مدبر
غالب سے سخن سنج کا مذکور ہے گھر گھر
برسی پہ لطیف اس کی میں اتنا ہی کہوں گا
سو سال میں پیدا نہ ہوا ایسا سخنور

(محمد لطیف لطیف)

نیروبی کینیا میں برسوں گزارنے والے اردو ادب کے خدمت گزار جناب ساحر شیوی نے بھی اس محفل میں یوں غالب کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

غالبِ نکتہ داں اے امام غزل
کھِل اٹھے تیری یادوں کے دل میں کنول
شعرِ اردو میں ہے تو ہی یکتائے فن
نام تیرا ہی ہونٹوں پہ ہے آج کل
اس قدر خوب صورت ترے شعر ہیں
چاند تارے بھی ان کا نہیں ہیں بدل

(ساحر شیوی)

کالی داس گپتا رضا نے مشرقی افریقہ میں علامہ اقبال کی مقبولیت کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ 25 دسمبر 1937 کو یوم اقبال منایا گیا تھا۔ شیدائی اقبال محترم جناب چانن سنگھ شفق نے حضرت علامہ (اقبال) کے سوانح حیات بیان فرمائے، محترم سعید مرزا نے اقبال اور ان کا فلسفہ کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ صاحب صدر نے اقبال اور مذہبیات کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ (صدر کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ خیر)

اپریل 1938 میں علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو کینیا کالونی کے دارالحکومت نیروبی میں فوراً ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں اقبال کے پرستار جناب چانن سنگھ شفق نے مقالہ پڑھا تھا۔ (بحوالہ سبد گل نمبر 2 جون 1938)

کالی داس گپتا رضا 1949 میں نیروبی کینیا (مشرقی افریقہ) پہنچے تھے۔ یہاں احبابِ ذوق نے مل بیٹھنے کی ایک صورت نکالی کہ حلقۂ 'گفتوش' قائم کیا جو دراصل (گفت) اور (نوش) کا مخفف تھا۔ اس حلقۂ گفتوش کے زیر اہتمام 21 اپریل 1950 کو یوم اقبال کی تقریب منائی گئی۔ اس تقریب میں کالی داس گپتا رضا نے گیارہ اشعار پر مشتمل خراج عقیدت پیش کیا۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

یہ جو اپنی قوم کا ہر دم شریکِ حال تھا
شاعرِ ملت سراپا شعر سر اقبال تھا
اس نے چند اوراق ہی میں ایک دفتر رکھ دیا
مٹ نہیں سکتی ہے شان وندرت بانگِ درا
بالِ جبریل اور جب ضربِ کلیم انساں پڑھے
ہر قدم پر زندگی سو منزلیں آگے بڑھے
اس کے نغمے حشر تک گونجیں گے ہفت اقلیم میں
اے رِضا جھکتا ہے سر اقبال کی تعظیم میں

سر علی مسلم کلب ہال میں 23 اپریل 1953 کو پھر یوم اقبال منایا گیا جس میں ہندوستان و پاکستان کے ہائی کمشنرس رونق افروز ہوئے تھے۔ شیدائیانِ اقبال سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر بھی جناب کالی داس گپتا رضا نے نظم سنائی جو بہت پسند کی گئی دس اشعار پر مشتمل اس خراجِ عقیدت کا مقطع تھا۔

رضا یہ ہماری طبیعت نے مانا نگاہوں نے دیکھا ذہانت نے جانا
کہ اقبال کی مشعل شاعری میں نئی روشنی ہے نئی زندگی ہے

رضا صاحب نے یہ بھی انکشاف کیا کہ پاکستانی ہائی کمیشن نے 'پیغامِ اقبال' پر بہترین مضمون پر انعام کا اعلان کیا تھا۔ 12 اپریل 1953 کو رضا صاحب نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا اور انعام انہی کے حصے میں آیا۔

اس طرح مشرقی افریقہ میں بھی کالی داس گپتا رضا نے غالب و اقبال سے اپنی ذہنی وابستگی کا ثبوت دیا۔

(بحوالہ 'اسد اللہ خان غالب مرد اور سلسلہ ء غالبیات کے دوسرے مضامین' از کالی داس گپتا رضا پہلا ایڈیشن 1991، ساکار ببلشر پرائیویٹ لمیٹڈ، جولی بھون، نیومرین لائنز۔ ممبئی 400020)

1949 سے 1970 تک آپ مشرقی افرقیہ نیروبی، کینیا میں تجارت میں مصروف رہے۔ آپ نے اردو ہندی انگریزی کتابیں شائع کرنے کے لیے کسی پبلشر کے در پر دستک نہیں دی۔ بلکہ اپنے اشاعتی ادارے خود قائم کیے۔ جیسے ولِ پبلی کیشنز بمبئی اور ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی 40020 جس کے زیر اہتمام کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ خاص طور پر دیوانِ غالب کامل (نسخہ ء گپتا رضا۔ تاریخی ترتیب سے) جناب رضا کا ایسا کارنامہ ہے جو مرزا غالب کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یوں تو کئی دیوانِ غالب شائع کیے گئے مگر یہ ایسا نسخہ ہے جو بڑی عرق ریزی کے ساتھ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1988 میں شائع ہوا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ بک جانے کی وجہ سے اس کا دوسرا ایڈیشن 1990 میں شائع ہوا پھر ترمیم واضافے کے ساتھ غالب صدی تقاریب کے موقع پر 15 فروری 1995 کو اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔

اپنے استاد جوش ملسیانی کے فکر وفن، حالاتِ زندگی اور منتخب کلام پر مشتمل کتاب 1991 میں شائع کر کے انھوں نے حق شاگردی ادا کیا ورنہ عام طور پر جوش ملسیانی کی ایک غزل جس کی ردیف 'دو بٹا تین' تھی پڑھنے میں آتی تھی۔ انھوں نے جوش ملسیانی کی اصلاحوں کا بھی ذکر کیا جو انھوں نے گپتا رضا کے کلام پر دی تھیں۔

اس مرحلے پر جوش ملسیانی کی ایک کتاب 'اقبال کی خامیاں' کا تذکرہ بھی نامناسب نہ ہوگا۔ یہ تنقید لالہ کرم چند کے ہفتہ وار اخبار 'پارس' میں 1927 میں جراح کے نام سے قسط وار شائع ہوتی رہی۔ 1928 میں یہ کتابی شکل میں چھپ کر آئی تو جوش ملسیانی کے ایک شاگرد نوہر یارام دردنکودری (نریش کمار شاد کے والد) اسے لے کر علامہ اقبال کے پاس آگئے۔ اقبال نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پیشانی پر بل لائے بغیر کہا "جوش میرے خواجہ تاش ہیں۔ ان سے میری طرف سے شکریہ ادا کیجیے اور کہیے گا کہ میں اس کتاب سے استفادہ کروں گا۔ یہ واقعہ 1928 کا ہے۔ (اقبال کی خامیاں۔ تعارف)

یہ کتاب کالی داس گپتا رضا نے 1994 میں اپنے ساکار پبلی کیشنز بمبئی 400020 سے پھر شائع کی۔ اس تیسرے ایڈیشن پر ماہ نامہ 'شب خون' الہ آباد میں محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے 'اقبال کی خامیاں' کو رد کرتے ہوئے مدلل جواب اگست 1995 میں شائع کیا۔ جوش ملسیانی کے اعتراضات کو مختلف اساتذہ اردو فارسی کے حوالے سے فاروقی نے ناقابلِ اعتنا ٹھہرایا۔ خود علامہ اقبال نے بھی اس کتاب کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ کالی داس گپتا رضا نے اپنے استاد جوش ملسیانی کے دفاع میں

شمس الرحمٰن فاروقی کا جواب الجواب لکھا جسے فاروقی صاحب نے بڑی فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اپنے رسالے شب خون ستمبر 1996 میں شائع کیا۔ جوش ملسیانی کی نشان زدہ اقبال کی خامیاں، ان کا شمس الرحمٰن فاروقی کی طرف سے مدلل رد اور پھر کالی داس گپتا رضا کا دفاعی مضمون بجائے خود ایک مبسوط جائزے کا متقاضی ہے جس کی فی الحال اس مضمون میں گنجائش نہیں۔

اردو ادب شروع ہی سے غیر مسلموں کا مرہون منت رہا ہے۔ ابتداً ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور ان کے رفقا کی دلچسپی کی وجہ سے اردو پھولتی پھلتی رہی۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو فروغ پاتی رہی۔ منشی نول کشور کے احسانات سے بھی اردو کبھی انکار نہیں کرسکتی، وہ چاہے شعر وادب کا معاملہ ہو کہ مذہب کا، منشی نول کشور نے قرآن اور حدیث بھی اسی احترام سے شائع کی جتنی شعر وادب کی کتابیں زیور طبع سے آراستہ فرمائیں۔ حضرت مالک رام ہوں کہ دتاتریہ کیفی، رتن ناتھ سرشار ہوں کہ فراق گورکھپوری، حکم چند، پریم چند، گیان چند اور گوپی چند نارنگ جیسے نیر نگ زمانہ محسنوں کی وجہ سے آج اردو ادب دیگر زبانوں کے ادب سے آنکھ ملانے کے قابل ہوسکا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اہم نام اعلیٰ حضرت کالی داس گپتا رضا رہے ہیں۔

ماہر غالبیات کی حیثیت سے انھوں نے غالب کی زندگی اور فکر وفن کے بے شمار گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب سے مرتب کردہ دیوانِ غالب کامل (نسخہ گپتا رضا) ان کا ایسا کارنامہ ہے جو انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت غالب کے علاوہ کئی ادیبوں شاعروں کو زندہ رکھنے کے جتن کرتے رہتے تھے۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ ہوں کہ کھیم نرائن رند، جواہر سنگھ جوہر ہوں کہ رتن سنگھ زخمی، کیول رام ہوشیار ہوں کہ آفتاب رائے رسوا، بنسی دھر ہمت ہوں کہ احمد رضا خاں بریلوی، ہر قابل ذکر شاعر کا آپ نے مدلل جائزہ لے کر اس کی اہم تخلیقات کے حوالے سے اسے زندہ رکھا۔ انھوں نے قدیم شعرا کے ساتھ ساتھ جدید دور کے اہم تخلیق کاروں کی کھلے دل سے پذیرائی کی۔ ش ک نظام، عبداللہ کمال، رزاق افسر، نذیر فتح پوری، فیاض فیضی اور مخمور سعیدی وغیرہ کے فکر وفن کو سراہتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ غالب واقبال کی قد آوری کا جائزہ لینے والے کی آنکھوں میں جدید شاعر بھلا کیا سما سکتے لیکن اعلیٰ حضرت نے ان نئے فنکاروں کے اندر چھپے ہوئے کمال کی قدر افزائی کر کے اردو کے روشن مستقبل کی ضمانت دی۔

میں نے علامہ اقبال کے فارسی قطعات 'لالۂ طور' کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ یہ 'قطعات' کے نام سے کتابی صورت میں چھپنے والا تھا تو میں نے اعلیٰ حضرت سے پیش لفظ کی گذارش کی۔ آپ نے حرفِ چند کے عنوان سے میری کوششوں کو سراہا اور میرا دل بڑھایا۔ اعلیٰ حضرت کا یہ پیش لفظ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھے جو آخری خط لکھا تھا اس میں ترجمے کے علاوہ کوئی طبع زاد کارنامہ دکھانے کی ترغیب دی۔ ان کا خط میں یہاں درج کرنا چاہوں گا۔

مجی رؤف خیر...عمر دراز

خط ملا اور حکم نامہ بھی۔ آپ کے تمام قطعات رجسٹری سے واپس بھیج رہا ہوں۔ ایک صفحہ بڑھا بھی دیا ہے۔ جہاں کہیں مناسب ہو بڑھالیں۔

میں ایک عرصے سے محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اس ترجمے پر بڑا ناز ہے۔ اپنے کام پر ناز کرنا قطعی غلط نہیں ہے مگر یہ ترجمہ ہے۔

ترجمہ کبھی آپ کی تصنیف نہیں بن سکتا۔ یہ محض ترجمہ ہی رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا کوئی کام کریں جو قابل رشک ہو۔

قابل رشک کام ہمیشہ نہیں کیا جا سکتا لیکن کبھی کبھار پر ما تما ایسا کام مصنف سے کرا دیتا ہے جو قابل رشک ہوتا ہے اور میں آپ جیسے ذہین شخص سے ایسے ہی کام کی امید رکھتا ہوں۔ زندہ باشید۔

مخلص: کالی داس گپتا رضا (خط پر تاریخ انگریزی میں یوں درج ہے: 25/1/2001)

اعلیٰ حضرت کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ان کی وہ تخلیقات بھی ہیں جو انھوں نے نازشِ کائنات وخیر خلقہؐ کی تعریف وتوصیف میں بہ صد احترام پیش کی ہیں۔ ایک چھوٹا سا نعتیہ انتخاب 'احترام' ان کی عقیدت کی دستاویز ہے۔ اعلیٰ حضرت نے کینیا مشرقی افریقہ میں تقریباً پچیس سال گزارے۔ وہاں بے تعصب ماحول میں آپ نے حضور اکرمؐ کی شان میں مختلف اوقات میں نعتیہ کلام کہا اور بیشتر کلام نقل مکانی کے دوران گم بھی ہوگیا۔ بہرکیف جو کچھ دستیاب ہوا وہ سب 'احترام' میں شامل کرلیا گیا ہے۔

کس کس کو گناؤں میں برکات محمدؐ کی
دن ہی کی سی روشن ہے ہر رات محمدؐ کی
بڑھ کر ہے فضیلت میں، بہتر ہے فضیلت میں
ہر کام محمدؐ کا، ہر بات محمدؐ کی

اعلیٰ حضرت کالی داس گپتا رضا کی نعت گوئی کا مقصد خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

شعر کہتا ہے وہ شہرت کا طلبگار نہیں
درم و دام کا، دولت کا طلبگار نہیں
اے نبیؐ آپ کے اکرام وشفاعت کے سوا
یہ سخنور کسی نعمت کا طلبگار نہیں

نعت کے علاوہ آپ نے روایتی کربلائی واقعات کے زیر اثر کچھ مرثیے بھی کہے جو 'شعورِ غم' کے عنوان سے کتابچے کی شکل میں موجود ہیں۔ ہمارا بیشتر اردو ادب کربلائی علامات سے بھرا پڑا ہے۔ اعلیٰ حضرت گپتا رضا نے کربلا کے واقعات کے ساتھ ساتھ سبطِ رسول حضرت حسینؓ سے اپنی عقیدت کا جو اظہار فرمایا ہے وہ بھی انھیں اعلیٰ حضرت کہنے پر اکساتا ہے۔

ان کی غیر جانبداری اور بے لوث عقیدت ومحبت بھی مجھے ان کا گرویدہ بنا گئی۔ انھوں نے ایک رباعی میں کیا خوب فرمایا۔

بے کار کی باتوں نے ابھارا ہم کو
عیسیٰ بھی محمدؐ بھی ہے پیارا ہم کو
تقسیم مذاہب سے نہیں کچھ بگڑا
انسان کی تقسیم نے مارا ہم کو

'شعورِ غم' نامی کتابچہ آلِ رسول پر ہونے والے کربلائی واقعات کے اظہار پر مبنی ہے۔

بہرحال تحقیق، تنقید، نعت ومنقبت وغیرہ ہر میدان میں آنجہانی نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ انھیں اعلیٰ حضرت کہنا ہر لحاظ سے حق لگتا ہے۔ ان کا وصال۔ اردو ادب کا بہت بڑا داغ ہجر ہے جو ہر صاحبِ ذوق کے دل سے مشکل سے مٹے گا۔ کم سے کم میرے دل سے تو یہ داغ نہ جائے گا کہ اس سانحے کو میں اپنا شخصی نقصان سمجھتا ہوں۔

ماخذ:

1 ہندستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اول) کالی داس گپتا رضا، ول پبلی کیشنز، بمبئی 20۔ (دسمبر 1977)

2 اسداللہ خاں غالب مرد اور سلسلۂ غالبیات کے دوسرے مضامین از کالی داس گپتا رضا۔ ساکار پبلیشرز پرائی ویٹ لمیٹڈ، بمبئی 20 (1991)

3 علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر سہ ماہی اسباق پونہ مرتبین نذیر فتح پوری، امین حزیں، بجے گوڑبولے (جولائی 2001 سے مارچ 2002 تک)

4 اقبال کی خامیاں از جوش ملسیانی (تعارف از کالی داس گپتا رضا)۔ ساکار پبلشرز پرائی ویٹ لمیٹڈ بمبئی 20۔ (تیسرا ایڈیشن 1994)

■

Dr. Raoof Khair
9-11-137/1, Moti Mahal,
Golconda
Hyderabad- 500008
Cell:9440945645
Email.: raoofkhair@gmail.com

محمد اسداللہ

ڈاکٹر منشا کی گل افشانی گفتار

مہاراشٹر کے شہر ناگپور کے بعض تخلیق کاروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ برصغیر میں بھی خوب جانے جاتے ہیں۔ ان میں دو قلم کار ایسے بھی ہیں جن کی شہرت ان کے گھر کی دہلیز پار کر کے شہر کے چوک تک جا پہنچی اس بیان کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ انھیں اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ بعد وفات شہر کے کسی چوک کو ان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ شعرا ہیں۔ ناطق گلاوٹھی اور ڈاکٹر منشا الرحمٰن خان منشا۔ ناگپور میں ان مرحومین کے نام پر پائے جانے والے چوک کو دیکھ کر یہ سوال ذہن میں ضرور ابھرتا ہے کہ آیا یہ یادگار اس شاعر کی عظمت کی دلیل ہے یا اس چوک کی عزت افزائی۔

ودربھ (مہاراشٹر) کے علاقۂ برار کے ایک قصبے پیپل گاؤں راجہ کا ایک نوجوان معلم ناگپور کی اعلیٰ تعلیم گاہ اولڈ مارس کالج کے صدر شعبۂ اردو و فارسی تک کا سفر طے کرتا ہے، اس میں اس کی تگ و دو، ذہانت، زندہ دلی اور خوش گفتاری کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ ڈاکٹر منشا الرحمٰن خان منشا ناگپور کے ایک اہم شاعر ہی نہیں تھے، انھیں سماجی طور پر جو حیثیت، مقبولیت اور عزت حاصل ہوئی اس دیار کے شاید ہی کسی اردو شاعر کے حصے میں آئی ہوگی۔ وہ عام آدمی کے علاوہ شہر کے مشاہیر، صنعت کاروں، ادیبوں شاعروں سے لے کر مہاراشٹر اور ملک کی اہم شخصیات میں خاص طور پر سیاسی لیڈروں میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ ان کی پر اثر شخصیت، گل افشانی گفتار اور لگن نے انھیں اس مقام تک پہنچایا۔ ان کے متعدد شعری مجموعے اور کتابیں شائع ہوئیں جن میں آہنگِ حیات، نوائے دل، آئینۂ اقبال، مطالعہ میر ممنون دہلوی اور عکسِ دوراں قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی نگرانی میں لکھے گئے کئی تحقیقی مقالوں کو ناگپور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی۔ کئی مرتبہ مہاراشٹر اردو اکادمی کے رکن بنے اور دیگر کئی علمی و ادبی اداروں سے وابستہ رہے۔ ملک بھر کے مشاعروں کے علاوہ انھیں دہلی میں لال قلعے کے مشاعروں میں بھی شرکت کے مواقع نصیب ہوئے تھے۔

ناطق گلاوٹھی اور ڈاکٹر منشا الرحمٰن خان منشا اپنی ادبی اور سماجی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی شاعری کی گونج اب بھی ذہنوں میں موجود ہے۔ ناطق گلاوٹھی کا ایک مشہور شعر ہے۔

ناطق نہ ہو جو بات، تو بولے نہ آدمی
بولے تو اس میں بات بھی پیدا کرے کوئی

جن لوگوں کو ڈاکٹر منشا صاحب کی پر لطف محفلوں میں حاضری کا شرف حاصل تھا وہ اس بات کی تائید ضرور کریں گے کہ مرحوم نہ صرف ناطق گلاوٹھی کے معیارِ نطق سے زیادہ ناطق تھے بلکہ قدرت نے انھیں گفتگو اور سخن گوئی میں خوش کلام ہونے کی سعادت عطا کی تھی۔ حسِ مزاح ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو دورانِ گفتگو اور ادبی محفلوں میں اچھل اچھل کر باہر آتی تھی۔ ان میں بات کرنے کا سلیقہ اور باتوں باتوں میں مخاطب کے دل میں اتر جانے کا ہنر تھا۔ جہاں بات نہ بنتی ہو وہاں بات بنانا اور بات سے بات پیدا کرنا انھیں خوب آتا تھا۔ ایک مشاعرے میں ناطق گلاوٹھی موجود تھے۔ منشاء الرحمٰن صاحب جب اپنا کلام سنانے مائیک پر آئے تو ناطق صاحب نے ان کے تخلص پر اعتراض جڑ دیا کہ منشا تو مونث ہے۔ اس پر منشا صاحب نے برجستہ جواب دیا: یہ شخص جو آپ کے سامنے کھڑا ہے، کیا آپ اسے بھی مونث کہیں گے۔

ڈاکٹر منشا صاحب کی شاعری میں لذت، سوز و گداز لطف اور زبان کا چٹخارہ ہے، وہ ان کے بعد نہ صرف ان کی شاعری میں محفوظ ہے بلکہ ان کے نام سے موسوم چوک، واقع جعفر نگر، ناگپور کے آس پاس بھی پھیلا ہوا ہے۔ اس چوک کو اس علاقے کی چٹوری گلی کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شاعری کی طرح دور دور تک لذتِ کام و دہن کا سامان مہیا کرتی ہوئی دکانوں کی قطاریں ہیں۔

ڈاکٹر منشا الرحمٰن خان کی شاعری یوں تو روایتی انداز لیے ہوئے تھی مگر ان کا ذہن نئی ہواؤں میں اڑنے اور جدھر کی ہوا ہو ادھر چلنے کا تھا اسی لیے ان کے یہاں جدید شاعری کا رنگ و آہنگ موجود ہے۔ ایک مشاعرے میں اپنا کلام پیش کرنے سے پہلے انھوں نے کہا: 'ادھر میں نے جدید رنگ میں بھی کچھ کہا ہے۔' اس پر ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب نے جملہ چست کیا: 'آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔'

نئی سمتوں میں سفر کی تمنا کے باوجود روایتی شاعروں کی طرح بات بات پر شعر سنانے کی ان کی عادت آخر تک قائم رہی۔ ان کے اعزاز میں ناگپور میں 'جشنِ منشا' منایا گیا جس میں مشہور اداکار دلیپ کمار نے شرکت کی تھی۔ اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے جب وہ دلیپ کمار کے گھر گئے تو ان کے ایک ہمسفر کے بیان کے مطابق انھوں نے وہاں بہت وقت گزارا اور اس دوران دلیپ کمار کو اپنی شاعری سنانے کی بھرپور کوشش کر ڈالی مگر اس باکمال اداکار کی یہ ادا بھی قابلِ داد ہے کہ وہ ہر بار بات بدل دیتا، اس نے انھیں ایک بھی شعر سنانے کا موقع نہیں دیا۔

سنا ہے ایک مرتبہ ڈاکٹر منشا اپنے چار شاگردوں سمیت ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ منزل تک کا پورا ٹکٹ نہ ہونے کے سبب ٹی سی نے ان چاروں کو پکڑ لیا اور جرمانہ عائد کرنا چاہا۔ وہ اسے ڈاکٹر منشا کے پاس لائے۔ موصوف نے اس سے کہا: میں شاعر ہوں اور یہ چاروں میرے شاگرد ہیں۔ جرمانہ بھرنے میں کوئی مشکل نہیں مگر ہماری ایک شرط ہے، آپ کو ہماری شاعری سننی پڑے گی۔ ٹی سی نے کہا: میں ذرا اور لوگوں کی ٹکٹ چیک کر لوں پھر آتا ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے شاگردوں سے کہا، بے فکر ہو جاؤ اب وہ واپس نہیں آئے گا اور ویسا ہی ہوا۔

ایک مرتبہ سفر کے دوران چند نوجوان ٹرین میں منشا صاحب کی ٹوپی ڈاڑھی اور شیروانی دیکھ کر مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ ایک نوجوان نے پوچھا: آپ کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر منشا صاحب نے کہا، شاعر ہوں تو اس نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے اسے فوراً اپنا ایک شعر سنا دیا جسے سن کر وہ چوکڑی بھول گیا۔

خدا نے آپ کی صورت ہی کچھ ایسی بنائی ہے
ٹکٹ ہوتے ہوئے بھی بے ٹکٹ معلوم ہوتے ہو

بات سے بات پیدا کرنے کی اپنی اس خداداد صلاحیت کو انھوں نے نہ صرف منھ توڑ جواب دینے اور ذاتی کاموں کے لیے استعمال کیا بلکہ وہ اوروں کے کام بھی آتے رہے۔ یہ ان کی وسعت قلبی، زندہ دلی اور لوگوں کے لیے محبت و خلوص کا جذبہ تھا جو لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ منشا صاحب کے اندر چھپا شاعر ان کی سخن طرازی ہی تک محدود نہ تھا وہ ان کی گفتگو میں ہمیشہ حاضر رہتا تھا۔ ان کی خیال آرائی اور نکتہ آفرینی دلوں کو جیت لیتی تھی اور ماحول کو پر لطف بنا دیتی تھی۔ اگرچہ وہ کام کی باتیں نہ کرتے ہوں تب بھی ان کی باتوں سے کتنے ہی

رکے ہوئے کام بن جایا کرتے تھے۔ منشا صاحب جس ماحول اور دنیا میں جی رہے تھے وہاں اکثر لوگ صرف اپنے کام بنانے پر اکتفا کرتے تھے یا دوسروں کے کام بگاڑنے پر تلے رہتے تھے۔ منشا صاحب اپنے یا اپنے متعلقین کے بہت کام آئے۔ خواہ مخواہ دوسروں کا بلکہ اپنے دشمنوں کا بھی کھیل بگاڑنے کا شوق انھیں نہیں تھا۔

ایک مرتبہ جب وہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے ممبر تھے، جدید شاعر اور ناقد ڈاکٹر صفدر نے انھیں بتایا کہ وہ انعام کے لیے اپنی کتاب اکادمی کو نہیں بھجوا پائے ہیں۔ منشا صاحب نے کہا مجھے دے دیجیے میں ممبئی جارہا ہوں وہاں پہنچا دوں گا۔ اس وقت وہ حج کے لیے تشریف لے جارہے تھے اسی کام کے لیے اردو اکادمی کے دفتر پہنچے۔ وہاں لیڈی کلرک جس کا نام دیو بائی تھا اس نے کہا۔ کتاب داخل کرنے کی تاریخ تو گزر چکی ہے۔ منشا صاحب نے اس سے کہا۔ دیکھو میں حج کو جارہا ہوں، دیو کے کام سے جارہا ہوں، تمہارا نام بھی دیو بائی ہے، ہمارا اتنا کام کردو۔ یہ سن کر وہ خاتون خوش ہوگئیں اور اس کتاب کو قبول کرلیا۔ معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن صاحب نے ڈاکٹر منشا صاحب پر لکھے گئے اپنے خاکے 'برف کے لڈو' میں کئی دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ممبئی کے سفر میں وہ ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب اور ڈاکٹر منشا صاحب کے ساتھ تھے۔ واپسی میں کسی وجہ سے ٹرینوں کا آنا جانا بند ہوگیا تو انھیں احمد آباد ہوتے ہوئے ناگپور آنا پڑا۔ ٹکٹ کا مسئلہ درپیش تھا سب پریشان ہوگئے مگر ڈاکٹر منشا تو استقلال کے ہمالیہ تھے۔ وہ ٹکٹ کی لائین میں چلتے ہوئے کھڑکی تک پہنچے درمیان میں لائین میں کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے انھیں سلام کیا۔ بس کام بن گیا۔ وہ نوجوان بھی ناگپور جارہا تھا۔ اس کے ذریعے ٹکٹوں کا انتظام ہوگیا۔ اس کے ساتھ کچھ زنانہ سواریاں بھی تھیں۔ منشا صاحب ان کے سرپرست بن گئے اور انھیں سوار کرواتے ہوئے اپنے لیے بھی اوپر والی برتھ پر جگہ بنالی۔ آغا صاحب لکھتے ہیں کہ ہم لوگ ڈیڑھ پاؤں پر کھڑے رہے کہ پیر رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ دوچار اسٹیشنوں کے بعد منشا صاحب اپنی نیند پوری کرنے کے بعد نیچے اتر آئے اور ہمیں ازراہِ مہربانی اوپر بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے جو نیچے نظر کی تو حضرت کو مسافروں کے ساتھ ناشتے میں مصروف پایا۔ ہمارا یہ حال تھا کہ ٹگ ٹگ دیدم دم نہ کشیدم۔

چند ادبی نشستوں میں مجھے ڈاکٹر منشا صاحب کی صدارت میں اپنے انشائیے پیش کرنے کا موقع ملا اور ہر بار ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات اس جملے سے شروع کی کہ ابھی آپ نے اسداللہ صاحب سے انشائیہ سنا اور اب اس ناچیز سے منشائیہ سنیے۔ کسی مجلس میں ایک صاحب کے متعلق ڈاکٹر منشا صاحب کو یہ بتایا گیا کہ وہ شادی کے موڈ میں بالکل نہیں ہیں۔ منشا صاحب نے انھیں آمادہ کرنے کے لیے کہا اگر آپ شادی کے لیے تیار ہوں تو میں آپ کے لیے دو کام کردوں گا۔ ایک تو یہ کہ مناسب رشتہ تلاش کردوں گا اور دوسرے سہرا لکھ دوں گا۔ ڈاکٹر منشا صاحب کی شاعری اور اسے پیش کرنے کا ان کا انداز دلوں کو لوٹ لینے والا تھا۔ وہ جہاں جاتے اپنی باتوں سے محفل کو گرما دیتے اور جب شعر پڑھتے تو سماں بندھ جاتا۔ ان کی شخصیت کے اس متاثر کن پہلو اور سخن پروری کے پیش نظر ان کے مداح ہندی کے ایک شاعر نے ان ہی کے رنگ میں دو مزیدار اشعار کسی محفل میں سنائے۔

گرمیوں کے گرم دنوں میں ٹھنڈا کلیجہ کرنا ہو تو
شاعری سننا منشا کی آئسکریم کھانا ڈنشا کی

ایک مشاعرہ جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی بھی موجود تھے، منشا الرحمٰن صاحب اپنا کلام پیش کررہے تھے۔ اتفاق سے جو اشعار اس وقت سنائے وہ سنگین حد تک رنگین تھے۔ بیدی صاحب نے انھیں ٹوکا کہ شیروانی داڑھی اور یہ اشعار اس پر ڈاکٹر منشا صاحب نے اپنی حاضر جوابی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ شعر پڑھ دیا۔

رنگین طبیعت ہے تو اشعار ہیں رنگین
داڑھی ہے میرے چہرے پہ دل پہ تو نہیں ہے

ایک وقت تھا کہ ناگپور میں باٹا کے جوتوں کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ اس کمپنی کے منیجر نے منشا صاحب کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ موصوف نے حسبِ معمول مشاعرہ لوٹ لیا۔ مشاعرے کے بعد بات چیت کے دوران ان کے کلام پر سامعین کی جانب سے جو داد ملی اس کا ذکر ہورہا تھا۔ منشا صاحب نے کہا: کیا اچھا ہوتا اگر داد و تحسین کے بجائے باٹا کی جوتیوں کی جوڑیاں مل جاتیں۔ ان کے حاسدین کی بھی کمی نہ تھی کسی نے اس واقعے کو اس سرخی کے ساتھ چھاپ دیا کہ ڈاکٹر منشا کو داد نہیں جوتے چاہیے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے اسکول جانے کے لیے ایک لونا خریدی تھی اور وہ اپنی طبیعت کے مطابق ہر ایک کے کام آتے رہتے تھے۔ اس خدمت گزاری میں ان کی لونا شریک تھی۔ اسی پر اکثر وہ حضرت سید عبدالرحیم صاحب کو سوار کرکے لے جاتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر منشا صاحب نے ان سے کہا: آپ کی یہ لونا زبردست کارِ خیر انجام دے رہی ہے، یہ سیدھی جنت میں جائے گی۔ ڈاکٹر غیاث الرحمٰن صاحب نے کہا: حضرت، دعا کیجیے کہ جب یہ جنت میں جائے تو میں بھی اس پر سوار رہوں۔ ڈاکٹر منشا صاحب نے کہا: ضرور اور میں یہ دعا کروں گا کہ میں بھی آپ کے ساتھ اس پر پیچھے بیٹھا رہوں۔'

ڈاکٹر منشا صاحب اپنی گفتگو میں لفظوں اور ناموں پر بہت جلد گرفت کیا کرتے اور ان سے نئے معنی برآمد کر کے سننے والوں کا دل خوش کردیا کردیتے تھے۔ ایک مرتبہ ناگپور کے سانے گروجی ہائی اسکول و جونیئر کالج کی کسی تقریب میں انھوں نے شرکت کی۔ اس میں کامٹی کے ایک مہمان عبدالرحیم صاحب موجود تھے، شعبہ اردو کے ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن میزبان تھے اور اردو کالج کے پرنسپل کا نام تھا کڑوے۔ ڈاکٹر منشا صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا: اس تقریب نے تو رحمٰن اور رحیم کو ملا دیا، پرنسپل صاحب کا نام حالانکہ کڑوے ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت میٹھے ہیں۔ ناگپور میں ایک تقریب میں ڈاکٹر منشا صاحب موجود تھے جس کی صدارت کے فرائض انجام دے رہی تھیں، ناگپور کارپوریشن کی میئر محترمہ پانڈے صاحبہ۔ کسی نے قومی یکجہتی کی موافقت میں برار کے ایک قدیم شاعر غالباً شاہ غلام حسین ایلچپوری کا ایک شعر سنایا۔

ہندو مسلم کیا ہیں دونوں اک مٹی کے بھانڈے
بعد میں جاکر یہ ہوئے ہیں کوئی ملا کوئی پانڈے

جب ڈاکٹر منشا اپنا کلام سنانے مائک پر تشریف لائے تو کہا قدیم شاعر کے اس شعر سے استفادہ کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔

ہندو مسلم کیا ہیں دونوں اک مٹی کے بھانڈے
بعد میں جاکر یہ ہوئے ہیں کوئی منشا کوئی پانڈے

ڈاکٹر منشا صاحب خود تو ادب کے ڈاکٹر تھے مگر ڈاکٹر کے نام سے موسوم دیگر شعبوں کو بھی انھوں نے ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اپنے بیٹوں کو چن چن کر ان ہی شعبوں میں ڈالا، ادب میڈیسین حتیٰ کہ ویٹرنری ڈپارٹمنٹ کو بھی نہ چھوڑا۔ ان کی رہائش گاہ کے گیٹ پر لگی تختی پر سارے ڈاکٹروں کے ناموں کی تختی دیکھ کر کسی نے 'ہمہ خانہ ڈاکٹر است' کی طرف ان کی توجہ دلائی تو منشا صاحب نے فرمایا: اگلی بار یہاں صرف ایک تختی لگواؤں کا جس پر لکھا ہوگا۔ 'دواخانہ'

اس قسم کے ایک نہ دو بے شمار واقعات ہیں جن سے مرحوم کی زندہ دل اور شگفتہ بیانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی خوبی کے سبب وہ ہر محفل کی جان ہوا کرتے تھے۔ جہاں جاتے لوگوں کے دلوں میں خوشی کی لہر اور چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

■

Muhammad Asadullah
30-Gulistan Colony,
Near Pande Amrai Lawns
Nagpur - 440013 (MS)
Mob.:9579591149

شاذیہ کمال

علامہ واقف عظیم آبادی
حیات اور شاعری

ہمارے اردو ادب میں بہت سی ایسی شخصیات ہوئیں جنھوں نے اردو کی بقا کے لیے خود کو وقف کر ڈالا مگر ان کی خود اپنی زندگی نہایت بے حال اور بدحال رہی ایسے ہی لوگوں میں ایک بہت اہم نام علامہ شاہ فضل امام واقف اروِلی، آروی ثم عظیم آبادی کا ہے۔ ان کی پیدائش 18 مارچ 1916 کو دریائے سون کے کنارے سوسنا نامی ایک گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والد شاہ منظر امام کا شمار ارول کے رؤسا اور اپنے عہد کے قادر الکلام شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کے دادا سید شاہ اظہر حسین بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے اور نانا چودھری منظور احمد، محلّہ چودھرانہ آرہ کے معزز زمیندار اور معروف شاعر تھے۔ دو طرفہ زمیندارانہ ٹھاٹ باٹ اور علم و ادب کا شہرہ خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان گھرانوں کی سخاوت و فیاضی سے بے شمار لوگ فیضیاب ہوتے رہے مگر رفتہ رفتہ یہ باتیں ماضی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ علامہ واقف کے والد کا انتقال ان کے دنیا میں آنے سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ مدرسہ حنفیہ، میر گنج، آرہ میں ہوا جہاں سے انھوں نے مولوی تک کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازیں مدرسہ وحیدیہ آرہ سے عالم اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت کی سند لی۔ اس کے ساتھ معروف شاعر تمنا عمادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ ان کی طبیعت ابتدا سے ہی نہایت موزوں تھی۔ ادب اور شاعری سے ان کا رشتہ جنون کی حد تک تھا اسی جنون نے ان کی زندگی کا ایسا نقشہ بدلا کہ نانِ شبینہ بھی محال بن گئی۔ مگر نامساعد حالات کے باوجود کبھی انھوں نے اپنی انا اور خودداری کا سودا نہیں کیا۔ خود شناسی اور اپنی ذات کا فہم و ادراک انھیں بخوبی تھا۔ تبھی تو انھوں نے اس طرح کے اشعار کہے۔

یہ اُمنگیں، یہ ترنگیں، یہ گلوں سے چھیڑ چھاڑ
فصلِ گل آئی تو عالم ہی نرالا ہو گیا

اشکِ حسرت، چشمِ نم، یاس و حرماں، درد و غم
سیکڑوں عنوان تھے لیکن ایک ہی افسانہ تھا

چراغِ کُشتۂ بزمِ محبت ہوں میں اے واقف
فروزاں عمر بھر رہنا ہے مجھ کو سوزشِ دل سے

سخن ان کا موروثی ترکہ تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا عمرِ طفلی میں ہی شروع کر دی تھی۔

اِن کا بچپن نہایت حسین گزرا۔ نہ فکر معاش، نہ تلاش روزگار، اوپر سے آرہ کا ادبی ماحول۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزل مزاج میں رچ بس گئی۔ مگر ان کی آگے کی زندگی معاشی اعتبار سے بڑی محال بن گئی تھی۔ حالات نے جو کروٹ لیے تھے وہ اس کا شکار ہوئے اور خود ان کی اپنی لاپرواہی اور بے فکری نے انھیں ایسے پڑاؤ پر کھڑا کیا تھا جہاں انھیں دو وقت پیٹ بھرنے کے لالے پڑ گئے تھے اور مرتے دم تک وہ معاشی مسائل سے دوچار رہے۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف خود کیا کہ شعر و شاعری کے شوق، خبط اور موسیقی کے ذوق نے ہم کو تباہ کیا۔ وہ کہتے ہیں ''مشاعرے میں غزل پڑھنی تھی، اس کی تیاری میں منہمک تھا۔ دیوان جی تشریف لائے اور خبر دی کہ سرکاری مالگذاری کے جمع کرنے کی آخری تاریخ 31 دسمبر ہے اور صرف آٹھ یوم رہ گئے ہیں۔ ہم نے اَن سنی کر دی۔ پھر کچھ دن بعد دیوان جی آئے اور کہا کہ آج آخری تاریخ ہے، کچھ صورت نکالیے ورنہ جائیداد نیلام ہو جائے گی، وہ واقعی نیلام ہو گئی۔ یہاں خوشی اس بات کی تھی کہ غزل مکمل ہوئی، رہی جائیداد تو اس کی مالگذاری کے لیے مقدمہ شروع کر دیا''۔ یہ ان کی زندگی کا دوسرا دور تھا جہاں زمینداری کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اِن حالات نے ان کی غزل کی صورت بھی بدل ڈالی۔ اس دور کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ واقف کی شہرت کا خاص سبب ان کے قطعات و رباعیات تھیں جن کی ایک عرصے تک 'واقف آرٹ' اور 'شذرات واقف' کے نام سے مقامی رسالوں اور اخباروں میں اشاعت ہوتی رہی مگر اصنافِ سخن کا کوئی بھی شعبہ ان سے اچھوتا نہیں رہا۔ غزل، نظم، حمد، سلام، نعت، منقبت، قصیدہ، نوحہ، سہرا کے ساتھ ساتھ ظریفانہ اور ہجویہ کلام پر انھیں خاص دسترس حاصل تھی۔ ان کے عہد میں پیروڈی میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔

یہ آبگینۂ دل واقف ضربِ پیہم ہے\
نفس کی آمد وشد زندگی کا ماتم ہے\
یہ اضطراب لیے صبح انقلاب آئی\
چراغِ شامِ غریباں کی روشنی کم ہے\
جو اب چنگ ورباب ہے واقف\
شکستہ دل کی جو آواز آج مدھم ہے

علامہ واقف کی شہرت کا خاص سبب ان کے قطعات ورباعیات تھیں جن کی ایک عرصے تک 'واقف آرٹ' اور 'شذرات واقف' کے نام سے مقامی رسالوں اور اخباروں میں اشاعت ہوتی رہی مگر اصنافِ سخن کا کوئی بھی شعبہ ان سے اچھوتا نہیں رہا۔ غزل، نظم، حمد، سلام، نعت، منقبت، قصیدہ، نوحہ، سہرا کے ساتھ ساتھ ظریفانہ اور ہجویہ کلام پر انھیں خاص دسترس حاصل تھی۔ ان کے عہد میں پیروڈی میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔

علامہ وضع دار اور ظریف طبع انسان تھے۔ وہ جدیدیت کے دور میں پرانی تہذیبوں کی نمائندگی کرنے والے شاعر تھے۔ ان کا طرزِ حیات بھی کسی فلسفے سے کم نہیں تھا۔ کرتے کی جیب میں راکھ اور ہاتھ میں چھڑی لے کر چلنے والی اس ہستی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو خود فاقہ مست رہ کر اپنی ادبی چٹکیوں سے قارئین کے دل میں گدگدی پیدا کر دیتا ہے۔ گرچہ وقت اور حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا مگر اپنے فن کے معاملے میں وہ نہایت انصاف پسند تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں جو کچھ بھی کہا جو بھی لکھا بالکل صاف صاف لکھا ہے۔ انتہائی سادگی اور ظرافت آمیز سنجیدگی سے اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں۔

میرے اشعار میں منظر کشی بھی ہے ظرافت بھی\
قلم نے کھینچ دی تصویر جو خاکہ لکھا میں نے\
زبان سادہ میں رنگینیاں رکھ دیں سیاست کی\
مزہ آنے لگا دونوں کو جب یکجا لکھا میں نے

علامہ واقف کی شاعری میں ظرافت کا برملا اظہار ملتا ہے تو طنز کے پہلو بھی ان کے یہاں خاصے نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنے الفاظ کے تیر ونشتر سے بہتوں کو لہولہان کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار۔

ہوں گی کعبہ میں ادا خاک نمازیں اپنی\
جب کبھی شیخِ حرم کو بھی قضا یاد نہیں\
اے بتو! سنگ حوادث کا نشانہ بن کر\
میں خدا لگتی کہوں اپنا خدا یاد نہیں

ان کی شاعری میں محبوب کا تصور بھی ہے تو وطن سے محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ کریں یہ اشعار۔

کیا چیز ہے جینے کی تمنا مرے نزدیک\
کیا شے ہے مری 'جان' میری جاں تیرے آگے\
کیا شے ہے بزم شعر وسخن کچھ نہ پوچھیے\
کیا چیز ہے فضائے وطن کچھ نہ پوچھیے

وہ اپنی شاعری میں دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کرتے ہیں اور بے ثباتیِ عالم اور زندگی کی جفا سے بے پروا بھی نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

سانس لینے میں بھی ہیں دشواریاں اے ہم نشیں\
زندگی سے موت کا رشتہ نظر آنے لگا\
مدعائے زیست نے کی بے رخی جب اختیار\
میں بھی اس دنیا سے بے پروا نظر آنے لگا

وہ اپنے آپ میں ایک مکمل شاعر تھے۔ انھوں نے زندگی کے گوناگوں مسائل اور اس کے مختلف رنگوں کو اپنی شاعری میں بڑی فنکاری کے ساتھ برتا ہے۔ انھیں اپنی شاعری کی انفرادیت پر خود بھی ناز تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

ہر اک برنگ ٹاپک پر لکھا میرے سوا کس نے\
جو لکھا وہ برنگ، آتش صحرا لکھا میں نے

بہار کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے علامہ واقف کو علم عروض اور شاعری کے فن پر دسترس حاصل تھی۔ ادبی لوازم کی رو سے ان کی شاعری اہمیت اور قدر کی حامل ہے۔ ادبی محاسن سے ان کے اشعار آراستہ پیراستہ ہیں۔ صنعت نگاری، شعر کو خوبصورت، پرکشش اور بامعنی بنانے میں بڑی معاون ہوتی ہیں۔ ردیف اور قافیے کی پابندی سے غزل میں تسلسل اور روانی آتی ہے، اشعار کے درمیان ہم آہنگی قائم ہوتی ہے۔ علامہ نے اپنی غزلوں میں ردیف کا اہتمام بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ مثالیں پیش ہیں۔

بتا اے دوست آوازِ درا آگے ہے یا پیچھے\
تیرا رہبر نصیبِ نقشِ پا آگے ہے یا پیچھے\
چالاک ہے عیار ہے معلوم نہیں کیوں\
جو شخص ہے عیار ہے معلوم نہیں کیوں\
لیلیٰ کرے گی زلفِ پریشاں اِدھر اُدھر\
تو مجنوں بھی ہوگا چاکِ گریباں اِدھر اُدھر\
نہ یہ دنیا ہے مجنوں کی نہ وہ دنیا ہے مجنوں کی\
فقط لے دے کر آوازِ انا لیلیٰ ہے مجنوں کی\
قطرہ نہیں قانون کہ دریا نہیں قانون\
منفی ہو اگر ذہن تو کیا کیا نہیں قانون\
رہے سکون، دلِ مُدعا رہے نہ رہے\
اے ذوقِ سجدہ تیرا نقشِ پا رہے نہ رہے

ان کے کلام میں تشبیہات واستعارات کا خاص اہتمام نہیں ملتا۔ ان کا غزلیہ اسلوب جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے اُن میں اضافت کا نظام خاص ہے۔ علامہ کے فنی اسالیب میں ترکیبِ اضافی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کم ملیں گے جن میں اضافتیں ناپید ہیں۔ اس رو کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مرید پیر مغاں آورد صبح گاہ میں ہے\
ہوائے گوشۂ مے خانہ خانقاہ میں ہے\
ستم ظریف ہے کتنا جمالِ فطرت بھی\
بہارِ خندۂ گل فیضِ اشکِ شبنم ہے\
مستِ خوابِ نگہ یار نہ ہونے پائے\
زندگی نرگسِ بیمار نہ ہونے پائے\
یہ فیضِ گریہ شبنم ہے صحنِ گلشن میں\
پھول کھلتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں

ان کے یہاں اضافتیں بھری ہوئی ہیں جبکہ بیشتر شعرا اس سے اجتناب برتتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بے احتیاطی سے اشعار کے ثقیل ہونے کا خدشہ بنا رہتا ہے۔ مگر علامہ نے اپنی غزل میں ترکیبِ اضافی کا استعمال اس سلیقے سے کیا ہے کہ نہ غزلیت مجروح ہوتی ہے اور نہ اس کی موسیقیت میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

جدیدیت کے دور میں کلاسکی طرز کی شاعری کرنے والے علامہ واقف کو اردو کے علاوہ عربی وفارسی پر قدرت حاصل تھی۔ یہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ اپنی نثری خدمات کے سبب بھی بہار کی ادبی تاریخ میں زندہ جاوید ہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار (اس وقت کے ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری، پٹنہ) کی

فرمائش پر علامہ واقف نے ہندوستان اور صوبہ بہار کی مختلف ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات پر مبنی مخطوطہ تخلیق کیا تھا جو کہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کا یہ بڑا کارنامہ 'نگارشاتِ علامہ واقف' کے نام سے خدابخش لائبریری میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک ان کی نثر نگاری یا انشا پردازی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی رائے بڑی قیمتی ہے:

''اگر علامہ واقف کو نظر انداز کر دیا گیا تو بیسویں صدی کے صاحب طرز نثر نگاروں کی فہرست مکمل نہیں ہوسکتی''۔ اردو کے اس عظیم خادم کی زندگی میں ان کی کوئی کتاب شائع نہ ہو پائی۔ ادھر چند سالوں میں ان کی تخلیقات ان کے چاہنے والوں کی کوششوں سے منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں پانچ شعری مجموعے ہیں اور ایک نثری کتاب ہے۔ یہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔

1 لطف ستم: مرتب سید جاوید حسن
2 رازہائے درونِ پردہ: مرتب کاشف امام 2007
3 گلدستۂ نعت ومنقبت 2008
4 طنزیاتِ واقف (واقف آرٹ کا انتخاب)
5 فردنامہ واقف عظیم آبادی

مضامین کی کتاب (1) مضامین واقف عظیم آبادی 2006

افسوس کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ تھوڑا تھوڑا انتخاب کی شکل میں لطفِ ستم، راز ہائے درونِ پردہ، طنزیات واقف (واقف آرٹ کا انتخاب) اور فردنامہ واقف عظیم ابادی میں آ گیا ہے۔ ڈاکٹر نسیم اختر نے اپنی کتاب 'تلاش وتصنیف' میں وہ پچیس غزلیں اور تین نظمیں محفوظ کردی ہیں جو علامہ واقف نے ان کے سپرد کی تھیں۔ اب تک علامہ کے جتنے بھی انتخاب منظرِ عام پر آئے ہیں وہ دراصل ان کی شاعری کا انتہائی چھوٹا حصہ ہے۔ علامہ نے بڑی بڑی سماجی اور سیاسی شخصیتوں پر ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے مدنظر جو شاعرانہ گفتگو کی ہے اس کا انتخاب اب تک منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ کسی برسر اقتدار سیاسی شخصیت پر کسی شاعر کا ردعمل بھی عوامی جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا موصوف کی شاعری بھی ادب کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔

واقف نے 1967 میں آرہ سے پٹنہ مراجعت کی تھی اور ذریعہ معاش صحافت کو بنایا تھا۔ اس دوران اداریہ نگاری، مضمون نگاری، تبصرہ نگاری اور خبرنویسی سے لے کر شاعری تک وہ سب کچھ کیا جس میں آمدنی کا ذریعہ دکھائی دیا۔ یہیں سے ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ شامل ہوا جسے انھوں نے ''تنگ تغزل'' کا نام دیا۔ انھوں نے اپنے کثرتِ مطالعہ اور اپنی مشاہداتی آنکھوں سے دنیا ومافیہا کے مختلف النوع حالات کو اپنے زورِ قلم سے شاعری میں قید کیا۔ غریبی، بے روزگاری، مہنگائی، بدعنوانی، فرقہ واریت، رہبرانِ ملک وقوم کی بے عملی، عوام کی بے حسی، حالاتِ حاضرہ، قومی وملی مسائل، ملکی وغیر ملکی حالات وغیرہ غرض وہ کون سے مسائل تھے جن پر واقف نے اپنے قلم کی سیاہی صرف نہیں کی ہو۔ چند مثالیں دیکھیں۔

قلب میں اس کے مگر حوصلہ پیدا نہ ہوا
ورنہ ذرہ جسے کہتے ہیں وہ دریا ہوتا

ثریا تک چلی جاتی ہے وہ دیوار بے ڈھنگی
رکھے جب اس کی خشتِ اوّلیں معمار بے ڈھنگی

اُس مرد برہنہ کو بھی تنقید کی سوجھی
مجنوں کو میرا چاکِ گریباں نظر آیا

علامہ واقف کا اردو صحافت سے بڑا گہرا رشتہ رہا۔ واضح رہے کہ اردو صحافت سے علامہ کی وابستگی کا آغاز آزادی سے قبل رسالہ الکوثر میں کالم نگاری سے ہوا اور دہلی، کلکتہ، پنجاب کے متعدد رسائل مثلاً مسلمان، الفقیہ، ریاست، روزنامہ ہند اور ترجمان میں وہ لکھتے رہے۔ وہ ابتدا میں واقف اردولی کے نام سے لکھتے تھے۔ بہار کی اردو صحافت سے علامہ کا تعلق آخر تک رہا۔ وہ روزنامہ سنگم کی ادارت سے جڑے رہے۔ مجاہد اردو اور سیاسی رہنما غلام سرور کو جب جب ملی اور سیاسی مسائل کے سبب جیل جانا پڑتا تو سنگم کی ادارت کے فرائض علامہ بخوبی انجام دیتے۔ ان سب باتوں کا ذکر ان کی نثری کتاب میں موجود ہے۔ 1972 میں انھوں نے ذاتی طور سے ہفت روزہ 'طشت ازبام' کا اجرا کیا جو جلد ہی بند ہوگیا۔

اردو کے اس بے لوث خادم کے بچپن کے اور جوانی کے اوقات جتنے پرسکون گزرے بڑھاپا اس کے برعکس بے سروسامانی میں بیتا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ آرہ میں گزارا اور پھر وہ پٹنہ آ گئے۔ پٹنہ میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ گزارا۔ اپنی عمر کے آخری نصف حصے میں انھیں جن معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا اس کا ایک زمانہ شاہد ہے۔ علامہ کبھی پھلواری شریف میں کرائے کے مکان میں رہتے تو کبھی سبزی باغ سے لے کر پٹنہ سٹی کے علاقے کے درمیان بے مکانی کی صورت حال سے جوجھتے رہے۔ حد تو یہ ہے کہ اکثر اوقات انھیں بنیادی ضروریات کی تکمیل کے مرحلے میں اپنی تخلیقات کو فروخت کرنا پڑتا تاکہ وہ اور ان کا کثیر الاولاد خاندان جو کہ منجملہ آٹھ افراد پر مشتمل تھا کو نان شبینہ نصیب ہوسکے۔ علامہ کی اس مجبوری کا ذکر نسیم اختر کی کتاب 'تلاش وتصنیف'

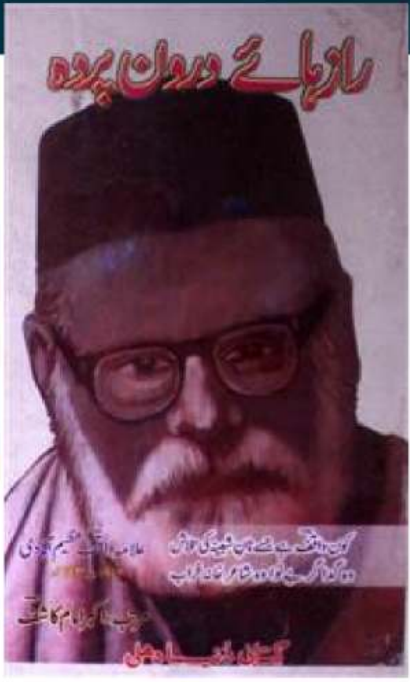

(2013) میں بھی ملتا ہے۔

علامہ واقف کا انتقال 6 دسمبر 1993 کو ساڑھے پانچ بجے شام میں کاکو میں ہوا۔ ان کی لاش آرہ لائی گئی اور اپنے ننیہالی قبرستان بوعلی منزل منشا پانڈے کا باغ، آرہ میں مدفون ہوئے۔ علامہ واقف نے اپنی حیات میں یہ شعر کہا تھا۔

لحد میں یہ فرشتوں نے کہا واقف مبارک ہو
کہ تم کلمہ سے جنت کی فضا لیتے ہوئے آئے

بہت افسوس کی بات ہے کہ بہار کے ادب میں علامہ واقف کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہ مل سکا ہے۔ بہار کے مختلف رسائل وجرائد میں بکھرا ان کا کلام دعوت غور وفکر کے ساتھ اپنی ناقدری کا ماتم کررہا ہے۔ یہ بھی المیہ ہے کہ شذراتِ واقف اور واقف آرٹ ہی ان کی شاعری کی شناخت بن گئی ہے جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ دیگر اصنافِ سخن میں ان کا کلام استادانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی قوت زودگوئی کا بہترین نمونہ ہیں جو نہ صرف اعلیٰ درجے کی کلاسکی شاعری کا درنایاب ہیں بلکہ اس کا معیار بھی ہیں۔

ان کی تخلیقی اور فکری توانائی کا جائزہ لینے کے لیے ان کے ذریعے چھوڑے گئے علمی سرمایے کی مکمل تحقیق ہونی چاہیے۔ ویسے محمد ثاقب نے 'علامہ واقف عظیم آبادی: حیات وخدمات' کے موضوع پر 2006 میں ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی کی نگرانی میں بہار یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔

■

Dr. Shazia Kamal
C/o: Haji Rahmatullah
Milli Masjid Lane, New Millat Colony
Sec-2, Phulwari Sharif
Patna- 801505 (Bihar)
Mob.: 9386134522

کہکشاں عرفان

الٰہ آباد کا ادبی منظرنامہ

(اجمالی خاکہ)

الٰہ باد کی مردم خیز زمین پر یوں تو اردو ادب کی ایک سے بڑھ کر ایک عبقری شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں اور ان شخصیات نے ناقابل فراموش تخلیقات وتصنیفات سے اردو ادب کے خزانے کو معمور کیا ہے۔ صنف شاعری کی بات کی جائے تو طنز وظرافت کا بادشاہ لسان العصر اکبر الہ آبادی کی شاعری کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

نوح ناروی کی شاعری کا خمیر بھی الہ آباد کے ضلع نارا سے اٹھا تھا۔ حالانکہ ان کہ پیدائش ان کے ننہال ضلع رائے بریلی کے بھوانی پور گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپ مشہور ومعروف شاعر امیر مینائی سے اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ جلال لکھنوی سے بھی شرف تلمذ رہا اور آخر میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔

کلاسیکی غزل کی آبیاری کرنے والوں میں نوح ناروی صاحب کا نام بھی شامل ہے، جنھوں نے نہایت ہی عمدہ اور خوبصورت شعر تخلیق کیے۔ نوح ناروی بلاشبہ اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے۔

رگھوپتی سہائے فراق نے بھلے ہی گورکھپور میں جنم لیا ہو مگر ان کو بھی شہرت کے بام عروج پر الہ آباد کی ادبی فضا اور مردم خیز زمین نے پہنچایا۔

الہ آباد کی شاعری کی تاریخ قدیم بھی ہے اور طویل بھی، ہمارے عہد کے شعرا کی فہرست ہی اتنی طویل ہے کہ عہد قدیم کے شعرا کی فہرست بھی ایک مضمون میں رقم کرنا ممکن نہیں چند شعرا و ادبا کا نام لکھتے ہوئے مضمون کو آگے بڑھانا چاہوں گی پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر ماہر اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سہیل زیدی، شبنم نقوی، نصر قریشی، مظہر نسیم، ڈاکٹر طفیل مدنی، حسیب رہبر، عزیز الہ آبادی، احترام اسلام، عتیق الہ آبادی، اقبال دانش، چودھری ابن النصیر، جاوید اختر، افضل جائسی، کاوش الہ آبادی، قمر الحسن صدیقی، نجیب الہ آبادی، اسلم الہ آبادی، فرمود الہ آبادی وغیرہ۔ شہرت اور مقبولیت کے ساتھ خالص ادیب وشاعر کی حیثیت سے فی الحال اسلم الہ آبادی کا نام بھی اہم ہے جن کا تحقیقی مقالہ 'اردو شاعری کا آغاز وارتقا شعرائے الہ آباد کے حوالے سے' ایک جامع تحقیقی وتنقیدی مقالہ ہے جس کے مطالعے سے شعرائے الہ آباد کی تاریخ اور فہرست کے ساتھ ان کی شاعری کے معیار کو بھی جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

صنف تنقید کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو الہ آباد اور شعبۂ اردو یونیورسٹی آف الہ آباد سے منسلک بہت سے اساتذۂ کرام کو میدان انتقادیات میں ممتاز اور انفرادی مقام حاصل ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں " الہ آباد ادبی سطح پر ایک ذو نظریاتی شہر رہا ہے اور آج بھی ہے یہ صورت ہندی ادب میں بھی ہے اور اردو ادب میں بھی۔ اردو میں یہیں سے ترقی پسند ادبی تحریک کا منبع بنا اور جدیدیت کو بھی الہ آباد ہی سے فروغ ملا۔" (اصول تنقید اور ردعمل، ص 15)

الہ آباد کی ادبی تاریخ کا ذکر ہو اور سید اعجاز حسین کی ادبی خدمات کا ذکر نہ ہو۔ پروفیسر اعجاز حسین شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے صدر کے طور پر خدمات انجام دینے کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا شمار اردو ادب کے ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے، مگر ان کو شہرت سوانح نگار، مؤرخ اور خاکہ نگار کے طور پر ملی ہے

الہ آباد کی شاعری کی تاریخ قدیم بھی ہے اور طویل بھی، ہمارے عہد کے شعرا کی فہرست ہی اتنی طویل ہے کہ عہد قدیم کے شعرا کی فہرست بھی ایک مضمون میں رقم کرنا ممکن نہیں چند شعرا و ادبا کا نام لکھتے ہوئے مضمون کو آگے بڑھانا چاہوں گی پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر ماہر اقبال،شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر سہیل زیدی،شبنم نقوی، نصر قریشی، مظہر نسیم، ڈاکٹر طفیل مدنی، حسیب رہبر، عزیز الہ آبادی، احترام اسلام، عتیق الہ آبادی، اقبال دانش،چودھری ابن النصیر، جاوید اختر، افضل جانسی، کاوش الہ آبادی، قمر الحسن صدیقی، نجیب الہ آبادی، اسلم الہ آبادی، فرمود الہ آبادی وغیرہ۔

ان کی شہرت یافتہ کتابوں میں مذہب اور شاعری، ادبی ڈرامے، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، نئے ادبی رجحانات، اردو ادب آزادی کے بعد، ادب اور ادیب، مختصر تاریخ ادب اردو، ملک ادب کے شہزادے، میری دنیا (خودنوشت) قابل ذکر تصنیف ہیں۔ ڈراما نگاری کے علاوہ ان کی صحافتی شخصیت کا بھی ایک روشن پہلو ہے انھوں نے جن رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیے ان میں نیساں، شعاع اردو، کارواں اور شب خون بھی شامل ہیں۔

اردو کے معتبر ناقد سید احتشام حسین کی سائنٹفک تنقید کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے؟ حالانکہ احتشام حسین کی آبائی جڑیں تو اعظم گڑھ کے قصبہ ماہل میں تھیں مگر الہ آباد کی ادبی فضا، الہ آباد یونیورسٹی اور اس کے شعبۂ اردو کا بھی ادبی شخصیت سازی بہت اہم حصہ ہے۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، اردو لسانیات کا خاکہ، تنقیدی جائزے، تنقیدی نظریات: تنقید اور عملی تنقید، راویت اور بغاوت، روشنی کے دریچے، ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، ادب اور سماج، جیسی مایہ ناز تصنیفات سید احتشام حسین کی ادبی شخصیت کے تعارف کے لیے کم تو نہیں۔

یونیورسٹی آف الہ آباد کے شعبۂ اردو کی بھی اپنی سنہری تاریخ ہے جسے ہندوستان کا پہلا اور سب سے بڑا شعبۂ اردو ہونے کا افتخار حاصل ہے جسے پروفیسر ضامن علی، ڈاکٹر اعجاز حسین اور سید احتشام حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر گیان چند جین جیسے اساتذہ اور ادبا و ناقدین کو اس مایہ ناز شعبے کا استاد اور صدر شعبۂ اردو ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ الہ آباد کی ادبی تاریخ یا پس منظر کا ذکر ہو تو ڈاکٹر مسیح الزماں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جن کی معرکۃ الآرا تصانیف میں 'اردو تنقید کی تاریخ'، 'اردو مرثیے کا ارتقا آغاز میر انیس تک'، 'معیار و میزان'، 'اردو مرثیے کی روایت'۔ حرف غزل ہو کلیات مومن کی ترتیب قابل ذکر ہیں۔ ان کی کتابیں تنقید کی تاریخ کو سمجھنے اور پرکھنے میں معاون ہیں تو مرثیے کی روایت، مرثیے کا ارتقا جاننا ہو تب بھی ڈاکٹر مسیح الزماں کی تصنیف مشعل کا کام کرتی ہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف روشنی دکھاتی ہیں بلکہ علم میں اضافہ کرتی ہیں تحقیق کے مشکل مراحل میں معاونت بھی کرتی ہیں۔

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی ادبی خدمات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں، نئی علامت نگاری، تنقید اور اسرار آگہی، سماجی تنقید اور تنقیدی عوامل، جدید ناول کا فن (اردو ناول کے تناظر میں)، ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ (ہندوستان میں)، مرثیہ کی سماجیات، لندن او لندن (سفر نامہ)، نظمیں پڑھتے ہیں، شام دھنک دھنک رنگ، (شعری مجموعہ) گئو دھول (خودنوشت) وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں جو ان کی ہمہ جہت شخصیت کی مثال ہیں۔

سید فضل امام رضوی کی الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک قابل اور ذمے دار پروفیسر کی خدمات انجام دیتے ہوئے صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر سید فضل امام رضوی کا شمار ان ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جن کا تعلق تحقیق و تنقید دونوں ہی میدان سے ہے۔ وہ مغرب و مشرق دونوں انتقادیات سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ مشرقی انتقادیات میں ان کا مطالعہ بہت عمیق اور گہرا تھا۔ خواہ مشرقی تنقید ہو یا مغربی نقاد کا رویہ کیسا ہو اس بارے میں پروفیسر فضل امام رضوی نے لکھا ہے:

''نقاد کے لیے ضروری ہے کہ ادیب کی کاوشوں پر غیر جانبدارانہ اور دیانت دارانہ طریقۂ کار سے غور کرے تب جاکر اس کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرے۔ ادبی تخلیقات کے حسن و قبح کا تجزیہ ذاتی پسند و ناپسند سے بالا تر ہونا لازمی ہے۔''

ان کی تصانیف اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں، ان کی تصانیف میں: افکار و نظریات، اصول و نظریات، انیس شناسی، مشرقی انتقادیات، جدید ہندی شاعری: سمت و رفتار، بھوجپوری ادب تعارف (تاریخ و لسانیات)، امیر اللہ تسلیم: حیات اور شاعری، شاعر آخرالزماں جوش ملیح آبادی، انیس: شخصیت اور فن اہم ہیں۔

جدیدیت کے علم بردار شاعر، ادیب، مدیر، ہمہ جہت خوبیوں کے مالک شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کی تحقیق کی جڑیں بھی بہت گہری ہیں ان کی تنقید معتبر دلائل اور آفاقی وژن سے معمور ہے۔ مگر کئی چاند تھے سر آسماں جیسا طویل اور ضخیم ناول لکھ کر انھوں نے اپنی تخلیقیت کے وہی جوہر دکھائے جو انھوں نے تنقید کے میدان میں شعر شور انگیز تحریر کرکے دکھایا تھا۔ چار جلدوں میں تحریر کردہ شعر شور انگیز ان کی میر شناسی کے ساتھ تنقیدی ہنرمندی کا وہ زندہ جاوید ثبوت ہے جس نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تنقیدی حیثیت مسلم کردی۔ نہ صرف رسالہ شب خون کی ادارت کے ساتھ جدیدیت کی بنیاد رکھی بلکہ جدید ادب لکھنے والوں کو شناخت بھی بخشی۔ کئی چاند تھے سر آسماں جدید اردو ناولوں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کرنے والا ایک شاہکار ناول ہے۔ ہمارے بعض ناقدین نے اس ناول کو تاریخی ناول بھی کہا ہے۔ کیونکہ اس میں ہندوستان کی تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش، اقدار اور انگریزوں کا اس خطے میں اپنی سلطنت قائم کرنے اور اس کی سرگرمیوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی پوری معاشرت، سیاسی معاملات، امرا و عوام الناس، تنظیمی امور، اندرونی و خارجی معاملات، خوف، خطرہ، غصہ، تصنع الغرض وہ تمام معاملات جو ایک خاص عہد یعنی انیسویں صدی کے نصف اول کی تصویر ہو سکتے ہیں پوری جزئیات نگاری، منظر نگاری، واقعات نگاری، پوری سج دھج اور بناؤ سنگھار کے ساتھ اس ناول میں موجود ہیں۔ اسے تاریخی ناول کہا جائے یا ہندوستان کی اسلامی تہذیب و تمدن کا مرقع سمجھا جائے اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی خود لکھتے ہیں:

''یہ تاریخی ناول نہیں ہے اسے اٹھارویں، انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب، اور انسانی اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔''

(کئی چاند تھے سر آسماں)

سید محمد عقیل رضوی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسی قد آور شخصیات نے الہ آباد کی ادبی سرزمین کو نہ صرف اپنی تخلیقات

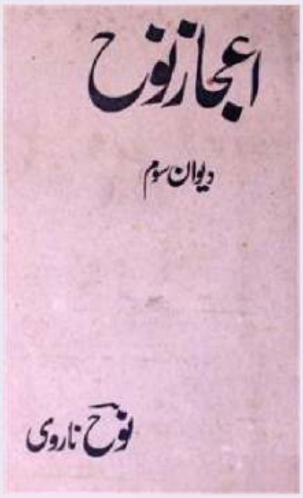

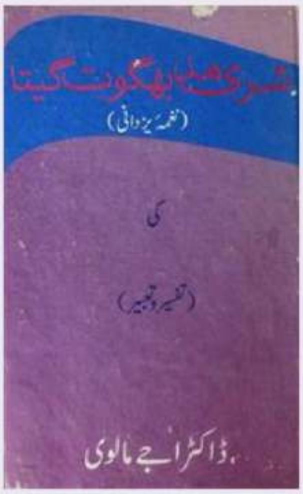

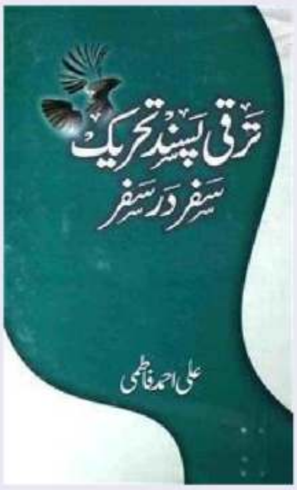

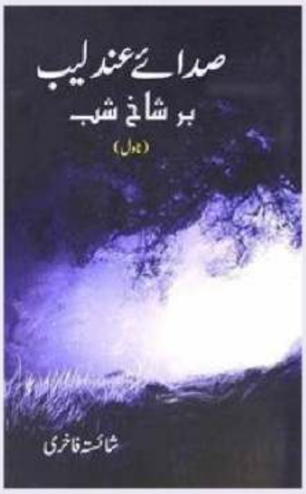

سے سیراب کیا ہے بلکہ دنیائے ادب میں اپنے پیچھے آنے والی نسلیں بھی تیار کی ہیں جوالہ آباد کی ادبی شناخت کو قائم بھی رکھیں گی اور نئی نسلوں میں بھی منتقل کریں گی۔ ڈاکٹر سید حیدر علی یونیورسٹی آف الہ آباد کے وہ محقق طالب علم ہیں جنھوں نے 'سید اعجاز حسین کی حیات اور کارنامے' کے موضوع پر تحقیق کے پر خار مراحل طے کیے۔ ابتدائی قواعد، الہ آباد اور تنقید، اعجاز حسین کا جہان تنقید، مرثیہ شناسی، نقد و نظر، اردو ناول سمت و رفتار کے بعد بھی حیدر علی صاحب کا ادبی سفر جاری و ساری ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی بے حد فعال شخصیت، معتبر ترقی پسند ناقد اور اردو ادب کے کہنہ مشق ادیب اور شفیق استاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند خیالات و افکار کی روشنی میں ادبا و شعرا کی تصنیفات و تخلیقات کو تنقید کی کسوٹی پر جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، احتشام حسین، آل احمد سرور، پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، جیسے اساتذہ اور دانشوروں کے زیر سایہ مارکسزم، اور ترقی پسند تحریک کے اصول و نظریات، افکار و خیالات کے ساتھ ساری زندگی وابستہ رہے اور اب بھی ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کی تصانیف میں تنقیدی کتابیں، خاکے، رپورتاژ اور سفرنامے بھی شامل ہیں۔ سفر ہے شرط، یاترا، سات سمندر پار، جرمنی میں دس روز ان کے سفرنامے ہیں۔ خود بھی فکشن پر تحقیق کی اور زیادہ تر ترقی پسند شعرا اور فکشن پر تحقیق کرائے ان کی تصانیف میں 'فن اور فنکار' شخصی خاکوں پر مشتمل ان کی تصنیف ہے جو بے حد دلچسپ اور اہم ہے، 'ادب تہذیب اور الہ آباد' ایک ایسی تصنیف ہے جو تنقید و تحقیق کے ساتھ الہ آباد کی تاریخ کو جاننے کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، 'اقبال اور الہ آباد' بھی تاریخی اہمیت کو پیش کرتی ہے اور علی احمد فاطمی کے تنقیدی نظریات پر مبنی ایک اہم کتاب 'مرثیے کی جمالیات' بھی ہے۔ اکیسویں صدی کے ادبی منظرنامہ میں ایک محترم و معتبر نام نظام صدیقی صاحب کا بھی ہے جن کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی مشہور و معروف تصنیف 'مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک' ان کے تنقیدی افکار و نظریات کا اظہار ہے اور مابعد جدیدیت کے نئے رجحان کے امکانات کی تلاش بھی۔

اردو زبان و ادب کے محقق ڈاکٹر اجے مالوی کی تحقیقی خدمات کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تحقیقی سرمائے میں بہت سے لعل و گہر ہیں جس کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ، وسیع المطالعہ اہل نظر حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں: ویدک ادب اور اردو، اردو سیکھیں، شری مد بھاگوت گیتا (نغمہ یزدانی) اردو میں ہندو دھرم، ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز، جیسی اہم معنی خیز تحقیقی کتابیں اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ حقانی القاسمی لکھتے ہیں''اجے مالویہ نے قدیم دانش و آگہی کی تمام روشن عبارتوں کو اپنے ذہن میں جذب کر کے اردو کے داخلی آفاق کو روحانی توانائی سے آشنا کیا ہے۔'' (ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز)

معاصر فکشن نگاری میں بھی کئی نام ایسے ہیں جو مسلسل فکشن تخلیق کر رہے ہیں احمد حسنین، اسرار گاندھی، شائستہ فاخری جیسے سینیئر فکشن نگار الہ آباد کی ادبی روایت اور شناخت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، احمد حسنین صاحب کا آبائی وطن اتر پردیش کا ضلع امبیڈکر نگر کا موضع آدی پور ہے۔ مگر مدتوں سے احمد حسنین صاحب کا نشیمن پریاگ راج میں ہے۔ احمد حسنین صاحب عرصۂ دراز تک درس و تدریس کے معزز اور محترم پیشے سے وابستہ الہ آباد کے یادگار حسینی انٹر کالج میں استاد کے رتبے کو افتخار بخشتے ہوئے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور اب مسلسل ادب کی خدمت اور فکشن کی تخلیق میں مصروف و مشغول ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعات میں: روشنی اور سائے، میری چاہت کے گلاب شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انسانی سماج کی کہانیاں لکھتے ہوئے احمد حسنین صاحب نے جانور اور جنگلات کے موضوع پر کہانیاں لکھ کر اردو فکشن کو نئی جہت عطا کی ہے۔ 'شکار اور شکاری' جیسے دلچسپ اور منفرد مجموعے سے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ گھنے جنگلات کے خوفناک سائے، شکاری کی تیز نگاہیں اور آدم خور جانوروں کی آہٹوں اور شیر، چیتا، باگھ جیسے آدم خور، خطرناک درندوں کے شکار کی کہانیاں لکھتے لکھتے احمد حسنین نے اپنے ناول 'اندھیروں کے مسافر' کے لیے ایک خطرناک جگہ کی کہانی کا انتخاب کیا جسے چمبل گھاٹی کہتے ہیں۔ جہاں عام انسانوں کا گزر نہیں، جہاں زندگی دن کے اجالے میں نہیں رات کے اندھیروں سے شروع ہوتی ہے۔ ناول نگار نے ناول کے پلاٹ کو چمبل گھاٹی کی تاریخ جغرافیہ اور اس کے نشیب و فراز کے دامن میں پناہ گزیں وہاں کے ڈاکوؤں کی حرکات و سکنات، رہن سہن، لباس حلیہ، بول چال، لب و لہجہ، خرد و نوش، اور قزاقی نفسیات کو بہت فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

الہ آباد کو افتخار بخشنے والی ایک اور فکشن نگار جسے دنیائے ادب شائستہ فاخری کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی فن کاری بہت پختہ ان کا اسلوب بہت شائستہ اور ان کے کردار زیادہ تر صنف نازک ہی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت ہر روپ میں پائی جاتی ہے۔ کبھی بہادر، بہت خود اعتماد، حالات سے لڑنے والی، ترقی کے خواب دیکھنے والی، اور کبھی والدین کے فیصلوں پر آمنا صدقنا کہنے والی، اپنے رشتوں کے لیے خود کو قربان کرنے والی۔ شائستہ فاخری کے افسانوں میں تنہائی اور اداسی کا گہرا سایہ ہے۔ ان کی کہانیوں میں زندگی کے تمام رنگ ہیں اجلے، سیاہ شوخ، غمگین، کامیاب ناکام، کارپوریٹ لائف، چہار دیواری کی قید، آزادی کی کھلی فضا، ماڈرنزم، تہذیب و ثقافت، دین اور دنیا یہاں تک کہ تصوف جیسے گہرے موضوع پر کامیاب ہی نہیں لاجواب افسانہ نگاری کی ہے

ان کا وژن معاصر تمام فکشن نگاروں سے جداگانہ ہے وہ احتجاج کی بلند آواز بھی ہیں اور تانیثیت کی علم بردار بھی ان کے افسانوں یا افسانہ نگاری کی بات کی جائے تو، افسانوی مجموعہ 'وصف پیغمبر نہ مانگ' جس میں آفندی کا بیٹا، آدمی ہوں وصف پیغمبری نہ مانگ، خوابوں کا نیلا سمندر، شیشے کے آبلے، خشک پتوں کی موسیقی، عالم خاک و باد، صوفی آپا جیسے افسانوں میں فن کی بلندی کی تمام صفات موجود ہیں محبتوں کے ادھورے خواب، عشق کی آگ، ہجر کی تنہائیاں بھی ہیں صدائے انا الحق کی گونج، تصوف اور گنجینۂ اسرار کی روشن وادیاں، وجدان، علم الغیب روح سے نور تک کی پرواز، ہے 'سنو رقیہ باجی'، صوفی آپا' وہ زندہ جاوید کردار ہیں جن کی عظمت کو دنیائے ادب کے قارئین سلام کرتے رہیں گے۔

شائستہ فاخری کے یہاں رقیہ باجی کے خواب ہیں تو رشید جہاں کی بیباک حقیقت نگاری اور عصمت کا نفسیاتی اور جنسی رنگ بھی ہے قرۃ العین حیدر جیسا فلسفیانہ آہنگ بھی ہے اور واجدہ تبسم جیسا تیکھا پن بھی مگر شائستہ فاخری کا اپنا اسلوب ہے جس میں شائستہ کی شائستگی بھی ہے نفاست بھی خاموشی بھی ہے اور احتجاج بھی غم وغصہ بھی ہے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی۔ وہ اپنے ناول 'صدائے عندلیب بر شاخ شب' میں لکھتی ہیں 'ناول عورت کے خوابوں کی ایک گٹھری ہے۔' عورت کی زندگی مرد کی مٹھی میں بند چند کچلے خوابوں کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ سب کچھ ہونے کے اندیشے آتے ہی زندگی کی ایک نئی ابتدا کرتی ہے مکمل جہاں عورت کے اندر بستا ہے۔ بیداری شرط ہے، پھر تو عورت صدائے انقلاب ہے۔ ''شائستہ فاخری کو افتخار حاصل ہے کہ اردو فکشن میں حلالہ جیسے اذیت ناک مذہبی عمل پر سب سے پہلے انھوں نے ناول لکھا۔'' 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' کا مرکزی کردار علیزہ ہے اور دوسرا اہم کردار اس کی دوست ڈاکٹر تانیہ ماتھر دونوں میں تضاد ہے علیزہ ایک کمزور عورت ہے اور تانیہ ایک مضبوط عورت، اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشی آزادی بہت ضروری ہے۔ جب کوئی انسان زیادہ قید اور پابندیوں اور حبس بے جا میں رکھا جاتا ہے تو اس کے اندر آزاد ہونے کی خواہش زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔

معاصر افسانہ نگار اسرار گاندھی کا آبائی وطن اتر پردیش کا شہر سلطان پور ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'پرت پرت زندگی' ہے جو 1997 میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا، دوسرا مجموعہ 'راستہ جو بند ہے' اور تیسرا 'غبار' ہے چوتھا مجموعہ 'ایک جھوٹی کہانی کا سچ' سابقہ کہانیوں کا انتخاب ہے۔ مشہور ناقد جن کا تعلق بھی الہ آباد سے ہے اور جنھیں فکشن ناقدین میں شمار کیا جاتا ہے مہدی جعفر صاحب لکھتے ہیں ''اسرار گاندھی کو جو کیفیت لکھنے پر مجبور کرتی ہے اس میں ان کی داخلی کیفیات کا اتنا عمل دخل نہیں ہے جتنا ان کے مشاہدے کا ہے۔''

ادب کی خدمات کے حوالے سے ایک معتبر نام ڈاکٹر شہناز صبیح صاحبہ کا ہے۔ الہ آباد گرلس کالج میں اردو زبان وادب کی استاد کے فرائض بہت محنت اور مشقت کے ساتھ ایمانداری سے نبھاتی رہیں۔ حال ہی میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئی ہیں مگر ان کی تصنیف وتحریر کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ اردو زبان و ادب کے لیے جتنی محنت اور تگ و دو اور جتنی کر سکتی تھیں بغیر کسی لالچ اور ستائش کے خاموشی سے کرتی رہیں ایسے لوگ جو خاموشی سے زبان اور ادب کی خدمت کرتے ہیں صرف تعظیم ہی نہیں انعام واکرام اور اعزاز کے بھی قابل ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سیکڑوں افسانے، ڈرامے، بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے، رپورتاز، سفر نامے، کالمز بھی شامل ہیں۔ 'اردو ڈرامہ آزادی کے بعد' ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ 'افکار وخیالات' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اردو زبان وادب کے مؤقر رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'آئینہ ادب' ان کا ایک بیحد اہم تحقیقی کام ہے جس میں اردو شعرا کے پانچ ادوار، غزل، مرثیہ، قصیدہ، نظم، مثنوی، کے شعرائے کرام، داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، مضمون، انشائیہ، طنز ومزاح، سوانح نگاران، تنقید کے ناقدین، تحریک کے علم برداروں، اخبارات اور رسائل کے مدیران، غرض ادب کا آئینہ معروضی شکل و صورت میں پیش کیا ہے تاریخ پیدائش سنہ وفات ولدیت، شاگردی واستادی اور تصانیف کی فہرست اور اول تا آخر بہت مختصر، معروضی مگر مکمل جانکاری دینے کی کوشش کی گئی ہے یہ کتاب تو طالب علموں کے لیے بہت کارآمد ہے۔

نئی نسل میں ڈاکٹر جوہی بیگم بھی الہ آباد کو اپنے ادبی کارناموں سے افتخار بخش رہی ہیں، ان کے بے باک بے خوف، سچے اور تیکھے کالمز، ان کے افسانے اور شاعری جس میں درد وکسک بھی ہے طنز کے نشتر بھی، زخم بھی ہیں اور مرہم بھی۔ ساتھ تحقیق وتنقید اور ترجے کا عمل بھی جاری ہے۔ ڈاکٹر جوہی بیگم نے پریم چند اور ان کے پسماندہ کرداروں پر ایک ضخیم تصنیف رقم کی ہے۔ پریم چند کی ستر سے زائد کہانیوں کا تجزیہ کیا ہے جو ایک اہم تحقیقی وتنقیدی کام ہے۔ الہ آباد کے حوالے سے نئی نسل میں ایک اور نام بہت تیزی سے ابھر رہا ہے اس ادیبہ کا نام ڈاکٹر صالحہ صدیقی ہے، ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا آبائی وطن اعظم گڑھ کا ایک گاؤں ہے مگر الہ آباد نے صالحہ صدیقی کو شناخت بخشی ہے صالحہ صدیقی نے انٹر کی تعلیم الہ آباد سے، اعلی تعلیم دہلی سے حاصل کی ہے ان کا ادبی سفر بھی بڑے زور شور سے جاری ہے، ان کی ادبی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو، صالحہ صدیقی کی پہلی شائع شدہ تحریر 'مولانا ابوالکلام آزاد کی انشاپردازی' پہلی کتاب 'اُردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں' ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے اور پذیرائی بھی حاصل کر چکی ہے۔ مطبوعہ مضامین اور کتابوں کی تعداد پر نظر ڈالیں تو سات کتابیں اور 100 سے زائد مضامین شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اختصاصی میدان: ڈراما، تانیثیت، افسانہ اور نظم نگاری ہے۔

نوجوان ادیب، صحافی اور ناول نگار ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے فکشن کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی کا ناول 'تعاقب' 2021 اور ناول 'خدا گنج' تازہ ترین 2022 کی اشاعت ہے یہ دونوں ناول قارئین اور ناقدین کی محبت اور توجہ چاہتے ہیں۔

الہ آباد کا ادبی پس منظر اور پیش منظر دونوں بہت وسیع و عریض ہیں اور اردو ادب کی خدمت میں کم وبیش ان تمام ادیبوں کی شمولیت ادب کے ذخیرے میں اضافہ کرتی جارہی ہیں۔ جعفر مہدی، پروفیسر عبدالحامد، پروفیسر جعفر رضا، زرینہ زریں، پروفیسر صالحہ رشید، ڈاکٹر ناصحہ عثمانی، سابق پروفیسر نوشابہ سردار، پروفیسر عطیہ نشاط، پروفیسر شبنم حمید، ڈاکٹر عزیز بانو، ڈاکٹر نگینہ جبیں، ڈاکٹر صالحہ زریں، ڈاکٹر احمد طارق، ڈاکٹر طاہرہ پروین، ڈاکٹر نغمہ جائسی، ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم کے نام بھی الہ آباد کی ادبی فہرست کا حصہ ہیں۔

مراجع وماخذ

1 اردو شاعری کا آغاز وارتقا: شعرائے الہ آباد کے حوالے سے
2 نئے ادبی رجحانات: ڈاکٹر اعجاز حسین
3 اصول تنقید اور رد عمل: سید محمد عقیل رضوی،
4 تنقیدی معیار: پروفیسر فضل امام رضوی
5 کئی چاند تھے سر آسماں: ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی
6 ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز ڈاکٹر اجے مالویہ
7 روشنائی سجاد ظہیر
8 ناول 'صدائے عندلیب بر شاخ شب' شائستہ فاخری

Dr. Kahkashan Irfan
Near Durga Pooja Ground
Shah Ganj
Prayagraj- 211003 (UP)
Mob.: 7054003555
Email.: dr.kahkashanirfan1980@gmail.com

محمد باقر حسین

اردو کے فروغ میں ریاستِ ٹونک کے غیر مسلم شعرا کی خدمات

آزادی سے قبل ہندوستان میں متعدد خود مختار ریاستیں کارفرما تھیں۔ انھی میں سے ایک چھوٹی لیکن با اثر ریاست ٹونک بھی تھی۔ یہ ایک مسلم ریاست تھی۔ ریاست ٹونک میں ہر مذہب اور ملت کے افراد باہم شیر وشکر تھے۔ ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں سے نواب اسمٰعیل علی خاں تک سبھی فرماں رواؤں نے علم وادب کی ترویج و ترقی کے لیے اہل فن و صاحب کمال ہستیوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ انھیں انعام واکرام سے بھی نوازا۔

راجستھان میں ریاست ٹونک کے حوالے سے اردو شعر و ادب کی نشو ونما میں غیر مسلم شعرا کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ نواب امیر خاں کے دربار سے وابستہ بساون لال شاداں ریاست ٹونک کے پہلے غیر مسلم شاعر تھے جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری پر قدرت رکھتے تھے۔ شاداں سخن گو کے ساتھ ساتھ تاریخ نگار بھی تھے۔ آپ نے ریاست ٹونک کی تاریخ 'امیر نامہ' فارسی زبان میں 1825 میں لکھی۔ 'امیر نامہ' ریاست ٹونک کی ابتدائی تاریخ کی مستند دستاویز ہے۔

نواب امیر خاں کے بعد فرماں روا نواب وزیر الدولہ مسند نشین ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت لال قلعہ دہلی میں ہوئی۔ غالب اور مومن سے آپ کا دوستانہ تعلق تھا۔ آپ کے عہد حکومت میں 1857 کا خوں ریز ہنگامہ برپا ہوا۔ لکھنؤ اور دہلی سے زبان و ادب کے ماہرین نے ہجرت کر کے راجستھان کے جن علاقوں میں پناہ لی ان میں سے ایک ٹونک بھی تھا۔ نواب وزیر الدولہ کے زمانے میں ان حضرات نے تخلیق و تالیف کا کام بخوبی انجام دیا۔ اس دور میں غیر مسلم ادبا میں منشی مصری لال، منشی چنی لال اور منشی تولا رام نے بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

(ریاست ٹونک کے حکمران ذیشان (تہذیب وثقافت) ج- دوم از صاحبزادہ عبدالمعید خاں، مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک، 2010، ص:107)

نواب وزیر الدولہ کے بعد نواب محمد علی خاں صاحب مسند نشیں ہوئے۔ آپ کا دور حکومت بہت مختصر تھا۔ آپ ہی کے عہد میں ریاست ٹونک میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ غیر مسلم ادیب کنج بہاری طرب نے 'تاریخ طرز نو' مرتب کی۔ نواب محمد علی خاں کی جلا وطنی کے بعد نواب ابراہیم علی خاں فرماں روائے ریاست ٹونک بنائے گئے۔ نواب صاحب کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ آپ سخن سنج، سخن فہم اور سخنور تھے اور شاعری میں خلیل تخلص کرتے تھے۔ آپ کے دور حکومت میں ظہیر دہلوی کو ٹونک آنے کی دعوت دی گئی۔ ظہیر کا شمار استاد ذوق کے تلامذہ میں ہوتا تھا لیکن وہ طرز مومن میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ ظہیر کے ٹونک میں اقامت اختیار کرنے سے مقامی شعرا کے کلام میں دہلوی رنگ نظر آنے لگا اور مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی شعرا مستفید ہوئے۔ نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے عہد حکومت میں اردو زبان و ادب اور بزم شعر و سخن کی محفلیں اپنے شباب

پرتھیں۔ان محفلوں میں بلا تفریق مذہب وملت با ذوق حضرات اپنا کلام پیش کرتے تھے۔غیر مسلم شعرا و ادبا کے لیے یہ دور عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکیم سید محمد اصغر علی آبرو نے اردو میں ریاست ٹونک کا پہلا تذکرہ 'بزم خلیل' کے عنوان سے 1896 میں لکھا جس میں مؤلف نے ایک طرحی مشاعرے کی روداد درج کی ہے۔اس مشاعرے کے بزم آرا نواب ابراہیم علی خاں خلیل تھے اور مصرع طرح تھا ؎

''نہیں منظور لب یار کو صحبت میری''

(مضمون شعرائے ٹونک کا ایک قدیم تذکرہ از نادم سیتاپوری مشمولہ اردو ادب (شمارہ نمبر 1) مرتب آل احمد سرور، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، 1962، ص:20)

اس تذکرے میں 85 شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ ہائے کلام درج ہیں ان میں تین غیر مسلم شعرا منشی لچھمی سہائے سوز، لالہ امراؤ لال طیش اور منشی جگن ناتھ پرشاد شاد بھی شامل ہیں۔یہ تذکرہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ریاست ٹونک میں غیر مسلم شعرا نہ صرف شعری نشستوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والیان ٹونک علم و ادب میں کس قدر دلچسپی رکھتے تھے اور غیر مسلم ادیبوں و شاعروں کی سرپرستی یکساں طور پر فرماتے تھے۔

ریاست ٹونک میں غیر مسلم شعرا و ادبا کے حوالے سے تھن لال بہجت اور ان کے فرزند دیبی پرشاد بشاش سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ان دونوں نے اپنی زندگی کا کچھ عرصہ ریاست ٹونک میں بسر کیا تھا۔بشاش شاعر کے علاوہ تذکرہ نگار بھی تھے انھوں نے 1885 میں 'تذکرہ آثار شعرائے ہنود' مرتب کیا۔اس تذکرے میں ریاست ٹونک کے شعرا بساون لال شاداں، لچھمی نارائن آذر، جیون رام شوق اور برج موہن عاشق کے مختصر حالات اور نمونہ ہائے کلام درج ہیں۔اس سے قطع نظر عہد ابراہیم میں برہم چاری پرمانند زاہد، پنڈت رام کرن جوشی اور منشی بالا سہائے متصدی جیسے غیر مسلم شعرا موجود تھے۔'پرچہ درشان محمد مصطفیٰ' اور 'جلسہ مولود شریف' متصدی کی نعتیہ تخلیقات ہیں۔ان شعرا نے غزل، نعت، قصیدہ، حکایت، مثنوی وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کی شاعری کے موضوعات یاد محبوب، کیفیت انتظار، اضطراب ہجر اور عشق کے مختلف پہلو ہیں۔اس طرح عہد ابراہیم میں مسلم شعرا کے شانہ بہ شانہ غیر مسلم شعرا نے بھی ریاست ٹونک میں اردو زبان اور شعر و ادب کی آبیاری میں فعال کردار ادا کیا ہے۔

نواب ابراہیم علی خاں کے بعد نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے۔آپ بھی صاحب قلم رئیس تھے۔ سخن سرائی میں سعید تخلص کرتے تھے۔اس دور میں ہندوستان میں تحریک آزادی اور مارکسی نظریے کی لہر چل رہی تھی۔ ان رجحانوں کا اثر ٹونک کے شعرا پر بھی ہوا۔اس سبب سے شاعروں نے وطن پرستی اور اشتراکیت کے جذبے کو عوام میں متحرک کرنے کے لیے اپنے کلام میں اصلاحی اور قومی مضامین شامل کیے۔اس عہد کے غیر مسلم شعرا میں منوہر سہائے انور اور رام نواس ندیم کا نام پیش پیش ہے۔یہ شعرا آزادی کے بعد بھی شعر و ادب کی نشو و نما میں اپنا فعال کردار ادا کرتے رہے۔

ہندوستان کی آزادی سے کچھ ماہ قبل نواب سعادت علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ان کے بعد نواب فاروق علی خاں ریاست کے حاکم بنے۔آپ ہی کے دور حکومت میں ٹونک ریاست آزاد ہندوستان میں ملحق ہو گئی۔دو ملکوں کی عوام کے درمیان ہجرت کا دور چلا۔ایسے میں شاعر اتم چند چندن نے بھی پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی اور ریاست ٹونک کی پرسکون اور ادبی فضا میں بود و باش اختیار کی۔چندن ٹونک کے غیر مسلم شعرا میں پہلے ایسے شاعر ہیں جن کے تین مجموعہ ہائے کلام ہیں اور تینوں ہی شائع ہوئے۔علاوہ ازیں ٹونک میں شعرا و ادبا کی ایک نسل ایسی بھی ہے جو آزادی سے قبل اردو کے فروغ میں فعال تھی اور آزادی کے بعد بھی فعال رہی۔ان میں شیام بہاری شیام اور گردھر داس بوہرہ قمر کا ذکر نا گزیر ہے۔

ریاست ٹونک میں اردو شعر و ادب کی ترویج و ترقی میں مذکورہ بالا غیر مسلم شعرا کی اہمیت مسلم ہے لیکن سب کا فرداً فرداً جائزہ لینا تفصیل طلب ہے چنانچہ چند منتخب غیر مسلم شعرا کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے:

بساون لال شاداں: نام بساون لال تخلص شاداں۔نواب امیر خاں کے دربار سے وابستہ تھے۔آپ کو ٹونک کے پہلے غیر مسلم شاعر اور تاریخ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ریاست ٹونک کی ابتدائی تاریخ 'امیر نامہ' فارسی زبان میں لکھی۔شاداں کے ہمعصر فقیر محمد خاں گویا نے داستان 'بستان حکمت' کے دیباچے میں اس سوانح کا ذکر کیا ہے۔گویا لکھتے ہیں:

''اس (امیر خاں) کا بیان اپنی زبان اور زبان قلم سے ادا ہو نہیں سکتا لیکن کچھ تھوڑا سا حال بندے کا 'امیر نامہ' سے کہ جو تاریخی حالات میں اس امیر کے کسی ہندو نے تالیف کی ہے، دریافت ہو سکتا ہے۔''

(انتخاب بستان حکمت فقیر محمد خاں گویا، مرتب نیر مسعود، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1988، ص:15)

ریاست ٹونک میں غیر مسلم شعرا و ادبا کے حوالے سے تتھن لال بہجت اور ان کے فرزند دیبی پرشاد بشاش سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، ان دونوں نے اپنی زندگی کا کچھ عرصہ ریاست ٹونک میں بسر کیا تھا،بشاش شاعر کے علاوہ تذکرہ نگار بھی تھے انھوں نے 1885میں 'تذکرہ آثار شعرائے ہنود' مرتب کیا، اس تذکرے میں ریاست ٹونک کے شعرا بساون لال شاداں،لچھمی نارائن آذر، جیون رام شوق اور برج موہن عاشق کے مختصر حالات اور نمونہ ہائے کلام درج ہیں،اس سے قطع نظر عہد ابراہیم میں بر ہم چاری پر مانند زاہد،پنڈت رام کرن جوشی اور منشی بالا سہائے متصدی جیسے غیر مسلم شعرا موجود تھے،'پرچہ درشان محمد مصطفیٰ' اور 'جلسہ مولود شریف' متصدی کی نعتیہ تخلیقات ہیں، ان شعرا نے غزل، نعت، قصیدہ، حکایت، مثنوی وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی،ان کی شاعری کے موضوعات یاد محبوب، کیفیت انتظار، اضطراب ہجر اور عشق کے مختلف پہلو ہیں، اس طرح عہد ابراہیم میں مسلم شعرا کے شانہ بہ شانہ غیر مسلم شعرا نے بھی ریاست ٹونک میں اردو زبان اور شعر و ادب کی آبیاری میں فعال کردار ادا کیا ہے۔

آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فی البدیہہ شعر کہتے تھے، جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔اردو میں مثنوی 'کھٹل نامہ'، ایک رباعی اور چند اشعار ملتے ہیں۔مثنوی 'کھٹل نامہ' نایاب ہے۔'تذکرہ آثار شعرائے ہنود' میں ایک رباعی درج ہے جو اس طرح ہے۔

گل گلاب نے خوبی عجب دکھائی ہے
بہار جامۂ گلگوں پہن کے آئی ہے
جو پوچھو سچ تو یہ ہے برکت قدوم حضور
وگرنہ گل نے یہ خوبی کہاں سے پائی ہے

(تذکرہ آثار الشعرائے ہنود از دیبی پرشاد بشاش، رضوی پریس دہلی، 1885،ص:76)

منشی چھمی نارائن آذر: نام منشی چھمی نارائن تخلص آذر تھا۔ شاعری کا شوق تھا، مولانا حکیم سعید احمد اسد کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے کبھی کبھی دیبی پرشاد بشاش سے بھی اصلاح سخن لیتے تھے۔آپ کی تصانیف میں مثنوی 'گلزار نصیحت'، 'بھگوت گیتا منظوم' اور 'گلدستہ بھجن' اور ایک دیوان شامل ہیں۔آپ ایک باکمال شاعر تھے۔آذر کے کلام میں سلاست، روانی، سادگی اور بندش کی چستی پائی جاتی ہے۔ان کی شاعری میں طرز مومن کی جھلک نظر آتی ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

(مومن)

اسی طرز میں آذر کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔

بھری محفل میں میرے سامنے فتنے اٹھاتے ہیں
وہ ملنے کے بہانے سب کو چھاتی سے لگاتے ہیں

(آذر)

حکیم جگن ناتھ پرشاد شاد: نام جگن ناتھ پرشاد تخلص شاد تھا۔پیشے سے حکیم تھے۔آپ نے شاعری میں محمد ابراہیم خاں رمز ٹونکی کی شاگردی اختیار کی۔ٹونک کے غیر مسلم شعرا اور ادبا میں سب سے زیادہ تخلیقات آپ ہی کی ہیں۔آپ بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔آپ کا دیوان 'مسلک مروارید' نام سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ 'مناظرۂ انسان و دل' ایک تمثیلی نظم لکھی۔شاد نے چکبست کی مشہور نظم 'رامائن' کی طرز پر 'رام چندر جی کو بن باس' کے عنوان سے شاہ کار نظم تخلیق کی۔وہ ریاست ٹونک کی ادبی نشستوں اور طرحی مشاعروں میں بھی کلام پیش کرتے تھے۔شاد کے کلام میں تاثیر و تغزل ہے۔شاعری میں عشق کی واردات کا بڑے سلیقے سے اظہار کیا گیا ہے۔

آنکھوں کی راہ دل میں چلے آیئے حضور
سیدھا تو راستہ ہے تمھارے مکان کا
آپ کرنے لگے غیروں سے شکایت میری
ابھی ایسی تو نہ بہکی تھی طبیعت میری

ڈاکٹر منوہر سہائے انور: نام منوہر سہائے تھا اور تخلص انور۔ ٹونک میں ننیہال تھا یہیں تعلیم و تربیت پائی۔بچپن سے ہی شعر و سخن کا ذوق تھا۔ٹونک میں ہی مبادیات عروض سیکھے۔انور کا زمانہ تبدیلی کا زمانہ تھا۔اس لیے قدیم و جدید دونوں رنگ سخن کی جھلکیاں کلام میں نظر آتی ہیں۔

وہ چہرہ داغ ہے عشق جمال افزا کے دامن پر
جو فرط اشک خون سے لالہ زار غم نہیں ہوتا

ڈاکٹر شیام بہاری شیام: ٹونک کے باشندے تھے، پیشے سے ڈاکٹر تھے۔شاعرانہ طبیعت تھی، شاعری میں جام اور صولت ٹونکی کی شاگردی اختیار کی۔آپ نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، کلام میں صفائی و سلاست، تخیل میں بلندی اور طبیعت میں روانی ہے۔شیام کی شاعری حالات حاضرہ کی آئینہ داری کرتی ہے۔شعر ملاحظہ فرمایئے۔

پہلے منجدھاروں میں طوفان بپا ہوتے تھے
رہ گئے اب تو یہ کمبخت کناروں کے لیے

تصادم بیچ دریا میں ہونے اور اب کناروں پر آجانے سے مفہوم واضح ہے کہ اس شعر میں علامت ہے جو تصادم پہلے عالمی سطح پر ہوتے تھے لیکن عہد حاضر میں شہر شہر اور قصبہ قصبہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

وہیں اب ہے آواز زاغ و زغن کی
جہاں تھا ابھی بلبلوں کا ترانہ

اس شعر میں شیام نے زمانے اور انسانی فطرت کی تبدیلی کو بہت ہی عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔

پنڈت رام نواس ندیم: اہل ادب میں رام نواس ندیم نظم و نثر دونوں کے اعلیٰ فنکار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ کو شاعری کا شغف شروع سے تھا۔آپ نے وادیِ سخن میں صولت ٹونکی سے رہنمائی حاصل کی۔آپ نے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ایک طرف ندیم نے قدیم رنگ تغزل میں غزل کہی وہیں دوسری جانب اخلاقی، قومی اور حب الوطن سے متعلق موضوعات پر منظومات بھی لکھیں۔'یوم جمہوریہ'، 'جشن آزادی'، 'بھارت' اور 'زراعت کی ترغیب' آپ کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ زبان میں صفائی، بیان میں روانی اور تخیل کی بلندی ندیم کے کلام کی خوبیاں ہیں۔نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اس قدر شاداں نہ ہو بلبل
موسم گل خزاں نہ ہو جائے
وصال یار کی یارب کوئی تدبیر ہوجائے
کبھی یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوجائے

سیٹھ اتم چند چندن: آزادی کے بعد پاکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور 1950 میں مستقل طور پر ٹونک میں اقامت اختیار کی۔ذوق شعر و سخن طبیعت میں موجود تھا۔شاعری میں صولت ٹونکی اور ہنر سے اصلاح لیتے تھے۔ٹونک کی علمی و ادبی فضا آپ کو بہت راس آئی۔انھوں نے شعر و ادب کے فروغ کے لیے 'بزم چندن' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔چندن انجمن ترقی اردو ٹونک سے بھی وابستہ رہے اور انجمن کے صدر کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کے فروغ میں گراں قدر ادبی خدمات انجام دیں۔آپ نے چار بیت، نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی۔ان کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا 'بہار چندن' 1962 میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ چندن کی چار بیتوں کا مجموعہ ہے۔دوسرا مجموعہ کلام 'سرچشمہ' 1965 میں شائع ہوا جو 221 غزلوں پر مشتمل ہے۔ان کی تیسری کتاب 'ہمسفر' کے عنوان سے 1968 میں منظر عام پر آئی۔اس میں غزلیات کے علاوہ منظومات بھی شامل ہیں۔

چندن کی شاعری میں قدیم رنگ تغزل کے علاوہ ہجرت، خودی اور وطن سے محبت کے موضوعات پر بھی اشعار ملتے ہیں۔چندن بے ساختہ اور سادہ الفاظ میں اشعار کہتے تھے۔ان کی شاعری ان کے ذاتی اوصاف کی آئینہ دار ہے۔چندن کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

رہ الفت میں میرا ہر قدم خود ایک منزل ہے
جہاں بھی میں ٹھہر جاؤں وہیں منزل سمجھتا ہوں
مجھے موت اچھی ہے اس زندگی سے
سہارے کا جینا کہاں چاہتا ہوں
غم حیات غم عاشقی سے کم تو نہیں
ہزار غم ہیں زمانے میں ایک غم تو نہیں

اس مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ٹونک میں بلاتفریق مذہب و ملت اردو زبان و ادب کا ایک نہایت ادب پرور ماحول تھا جس میں غیر مسلم فنکاروں کی فطری صلاحیتوں نے ارتقا کی منزلیں طے کیں، اور ان کے فروغ میں والیان ٹونک کی دریا دلی اور تہذیب پروری نے مزید چار چاند لگا دیے۔ریاست ٹونک ہمیشہ سے ہی مشترکہ تہذیب اور روایت کی پابند رہی ہے۔یہاں کے فرماں رواؤں نے نہ صرف غیر مسلم اہل ادب و اہل سخن کی سرپرستی کی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا۔

■

Mohammed Baqir Hussain
Assistant Professor
Government College
Tonk - 304001 (Rajasthan)
E mail : baquir97@gmail.com
Mob.:9214000097

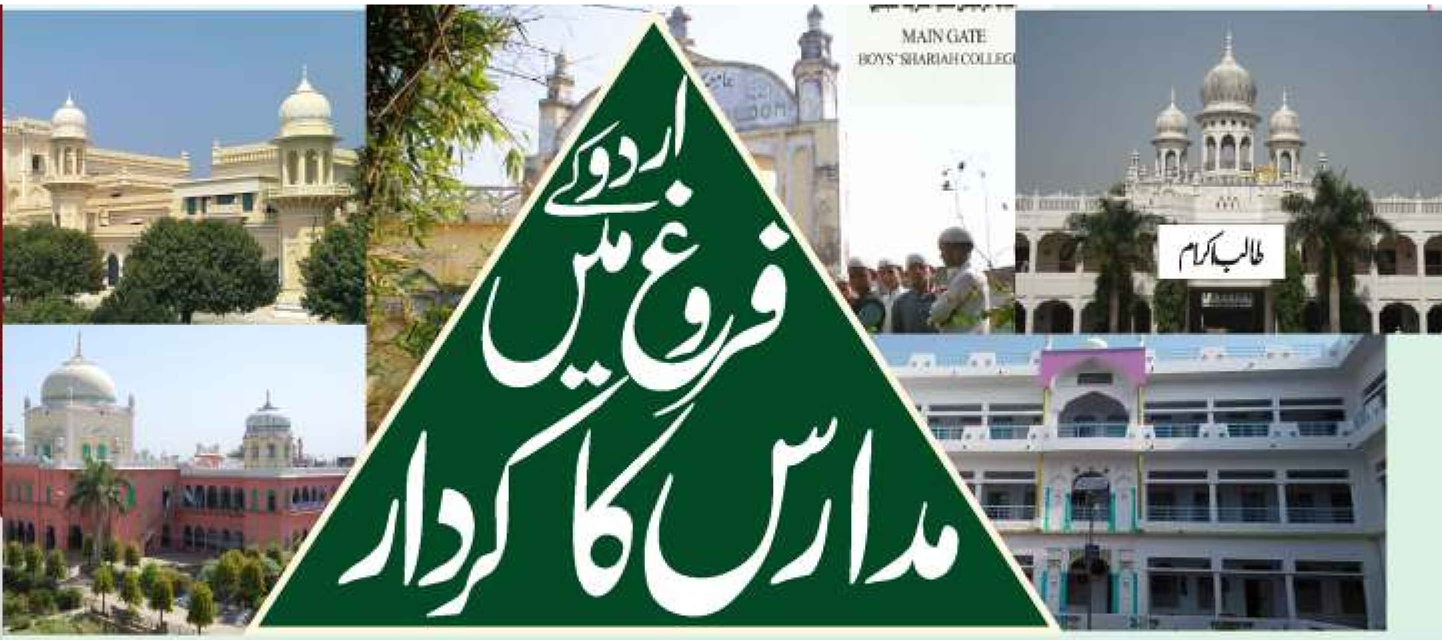

اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار

اردو گنگا جمنی تہذیب کی عکاس ہے جو کئی زبانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی مقدس سرزمین پر یہیں کی زبانوں اور باشندوں کے بطن سے جنمی اور یہاں کے کھیتوں، کھلیانوں، گھروں، بازاروں، اور باغوں میں پلی بڑھی۔ سمندر کی لہروں اور ریگستان کی چمک دمک سے مستفیض ہوئی۔ جنگلوں بیابانوں اور میدانوں میں پروان چڑھی۔ یہ زبان نہایت شیریں اور لطیف ہے، جس کے باعث عوام وخواص اس کے شیدائی اور دلدادہ نظر آتے ہیں۔ اس نے ذات و برادری اور مذہب ومسلک کو بالائے طاق رکھ کر ہر شخص کو اپنا مداح بنا رکھا ہے جو بھی اس کے قریب آیا وہ اسی کا ہولیا۔ یہ دنیا کے گوشے گوشے میں لکھی پڑھی سنی اور بولی جاتی ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ برصغیر کا اردوداں طبقہ بڑی تعداد میں چالیس سے زائد ملکوں میں مقیم ہے۔ برطانیہ، فرانس، امریکا، جرمنی اور عرب جیسے ممالک میں بھی اردو زبان میں درس و تدریس جاری وساری ہے اور کناڈا، لندن، برطانیہ، جرمنی اور نیویارک سے رسالے اور اخبارات بھی باضابطہ طور پر شائع ہورہے ہیں۔ اب یہ صرف قومی زبان نہیں رہی بلکہ عالمی سطح پر اسے مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل انٹی نیوگوٹریس نے جب اپنا پیغام نشر کیا تو انگریزی فرانسیسی ہسپانوی روسی چینی اور عربی کے علاوہ اردو زبان میں بھی پیغام جاری کیا۔ اردو نے ہر جگہ اپنا سکہ جما رکھا ہے۔ اس نے جہاں دیگر شعبہ جات میں اہم فریضہ ادا کیا ہے وہیں مدارس میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اردو اور مدرسہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوگئے ہیں کہ اردو کا اگر تذکرہ ہو تو بات مدرسے تک جا پہنچتی ہے گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور زبان کا نامیاتی ارتقا اور تسلسل بھی مدرسے پر ہی منحصر ہے۔ ارباب مدارس نے اردو کی بقا کے گوناگوں عملی اقدامات کیے ہیں۔ انھوں نے جہاں اردو رسم الخط کی حفاظت، اردو زبان کی تعلیم، اردو کو نئی نسلوں تک پہنچانا، اردو کو بین الاقوامی زبان بنانا اور اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے کی جدو جہد کی وہیں اور دیگر علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنے اور اردو رسائل ومجلات کو شائع کرنے کے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

مدرسہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو لفظ 'درس' کا مشتق ہے جس کے معنی ہیں پڑھانے کی جگہ۔ اسے تعلیم گاہ پاٹھ شالا ودیالیہ پٹھن استھل ٹیچنگ پیلس اور کالج وغیرہ کے اسماسے بھی موسوم کرتے ہیں۔ اس سے مراد ہر وہ اسکول ہے جو مذہبی ہو یا سیکولر۔ عام طور پر مدرسہ کو مکتب، معہد اور جامعہ کے اسم سے موسوم کرتے ہیں۔ جب اردو زبان کی خدمت میں مدارس کے رول کا ذکر آتا ہے تو مکتب، معہد اور جامعہ ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں جو ملک کے دور دراز علاقوں میں اردو کی ترویج و اشاعت میں ہر وقت ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔ اس کے فروغ کے لیے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے خدمات کو ہمیشہ سے سراہا جاتا رہا ہے کیوں کہ فورٹ ولیم کالج، جامعہ عثمانیہ، دہلی کالج اور اورینٹل کالج علی گڑھ (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اردو زبان کے ساتھ اردو ادب کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دیے ہیں، لیکن ان سب کے درمیان ایک حلقہ ایسا بھی ہے جس نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و نصیحت کے ذریعے اردو زبان و ادب کو ترقی کی جانب گامزن کیا ہے۔ دینی مدارس میں طلبا کو اردو زبان میں نہ صرف اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے بلکہ انھیں تذکیر و تانیث، الفاظ کی صحیح ادائیگی اور تقریر کے دوران لہجے میں اتار چڑھاؤ کا فن سکھایا جاتا ہے۔ جمعہ، عید الفطر، عید الاضحیٰ اور دیگر مواقع پر مدارس سے فیض یافتہ اشخاص ہی خطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں جو اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ دیواری میگزین، سالانہ میگزین، اور مدارس سے جاری ہونے والے ماہانہ یا دو ماہی رسائل وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح صحافت کے میدان میں بھی مدارس کا رول قابل ستائش ہوتا ہے۔ متعدد اردو اخبارات کے ایڈیٹرز مدارس سے فیض یافتہ ہیں علاوہ ازیں قرآن مقدس کے تراجم، احادیث رسول، اقوال سلف صالحین وغیرہ کی کتابیں اردو زبان میں ہی مدارس کے طلبا کو پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ دینی مدارس ہی ہیں جنھوں نے اردو کی صرفی و نحوی ساخت کی تشکیل، نئی لفظیات، استعارات، تشبیہات، تلمیحات اور لغت میں اضافے کیے ہیں۔ اس نے اردو زبان کو ان علوم وفنون اور موضوعات سے آشنا کیا جو یقیناً اردو کی فکری ثروت میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور جس سے اردو زبان کو فکری تحریک اور توانائی حاصل ہوئی جس کا اعتراف خود اہل قلم اور ارباب علم ودانش نے بھی کیے ہیں۔ ہمیں اردو میں زبان و بیان، اسلوب اور تکنیک کی سطح پر جو تنوع اور چمک دمک نظر آتی ہے وہ مدارس ہی کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ حالانکہ دینی مدارس میں اردو زبان وادب کی باقاعدہ اور باضابطہ طور پر تعلیم نہیں دی جاتی ہے اور نہ ہی منظم طریقے سے ادب پر کچھ کام ہورہے ہیں البتہ طلبا وطالبات علم قواعد سے ضرور روشناس ہوتے ہیں جس سے علمی دنیا میں مثبت اثرات نمایاں ہورہے ہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

"مدارس میں یوں تو براہ راست اردو زبان یا ادب کی تدریس نہیں ہوتی مگر قواعد اور گرامر کی سطح پر طالب علم کی لسانی بنیادیں جس قدر مستحکم ہوجاتی ہیں، اسی صلاحیت کے باعث اردو کے لسانی پس منظر کے طور پر عربی اور فارسی الفاظ سے مصادر اور مشتقات کا اصولی علم بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ صفت، موصوف، مضاف، مضاف الیہ، اسم، ضمیر، فاعل، مفعول، امر اور نہی، اس طرح کی سبھی قواعدی اصطلاحات دراصل طالب علم کو صرف ونحو سے پوری طرح باخبر کردیتی ہیں۔

یہی باخبری اس کی اردو کی لسانی اور ادبی استعداد میں ہمیشہ معاون ثابت ہوتی ہے۔''

(ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی، شمارہ 5، مئی 2013، ص:20)

دینی مدارس میں لفظی صوتیات پر خصوصی دھیان مبذول کرایا جاتا ہے۔ وہاں طلبا و طالبات کو تجوید کا بالخصوص علم ہوتا ہے۔طلبا کو س اور ش، گ اور غ، ج اور ز؛ ذ اور ظ؛ ت اور ط؛ ع اور ا؛ ق اور ک وغیرہ حروف میں واضح امتیاز کرایا جاتا ہے۔انھیں تمام حروف کی ادائیگی کا اچھی طرح علم ہوتا ہے۔ اترپردیش مدرسہ بورڈ نے جو نصاب تیار کیا ہے اس میں اردو زبان و ادب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں جہاں سائنس حساب تاریخ جغرافیہ منطق فلسفہ معقولات کمپیوٹر ہندی انگلش اور عربی ادب کو شامل رکھا ہے وہیں اردو زبان و ادب کو بھی ترجیح دی گئی ہے۔صوبائی اور مرکزی حکومت نے بہت ساری سہولیات فراہم کی ہیں۔ وقتاً فوقتاً اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اسکیمیں بھی جاری کرتی رہتی ہیں۔طلبا و طالبات کے لیے سالانہ اسکالرشپ کا بھی اہتمام کرتی ہیں۔ یہ مدرسے ہی ہیں جنھوں نے ہمیں خواندہ افراد، قاری اور اردو صحافت کو کاتب فراہم کیے۔

آزادی کے بعد اردو پر جب حملے ہو رہے تھے۔ اردو کی ابتدا سے ارتقا تک کی مکمل تاریخ میں مدارس کی عظیم قربانیاں شامل رہی ہیں۔گیسوے اردو کو سنوارنے میں بیشتر شعرا اور مصنفین نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے جن کا تعلق دینی مدارس سے رہا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، نظیر اکبرآبادی، اکبر الہ آبادی، شبلی نعمانی، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، عبدالحلیم شرر، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، نیاز فتح پوری، رشید حسن خاں، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض، رشید حسن خاں، فضا ابن فیضی، حیات اللہ انصاری، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، امداد امام اثر، راجہ رام موہن رائے وغیرہ بھی مدرسے کے پروردہ تھے۔ جنھوں نے اردو زبان و ادب میں عظیم کارنامے سرانجام دیے۔

ملک میں ایسے بھی مدارس موجود ہیں جہاں گنگا جمنی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔دارالعلوم حسینیہ گورکھ پور، اترپردیش میں اردو اور دیگر زبانوں کے ساتھ سنسکرت کی بھی تعلیم دی جارہی ہے اسی طرح رسول پور ضلع گونڈہ، صوبہ اترپردیش کا مدرسہ گلشن بغداد ہے۔ جہاں ہندو اور مسلم بچے مشترکہ طور پر اردو، عربی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔اس مدرسے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہاں مسلمان بچے سنسکرت پڑھ رہے ہیں اور ہندو بچے اردو اور عربی پڑھ رہے ہیں۔اس مدرسے میں تقریباً پچاس سے زائد مسلم طلبا سنسکرت سیکھ رہے ہیں اسی طرح یوپی کے متعدد مدارس میں غیر مسلم بچے اور بچیاں اردو زبان و ادب سے مستفیض ہو رہے ہیں۔آج اترپردیش کے مدارس میں اردو نمایاں کردار ادا کر رہی ہے کیونکہ ملک کے اعلیٰ وارفع عہدے پر فائز اشخاص یوپی کے مدارس کے ہی پروردہ تھے یا پھر بنیادی اردو تعلیم یوپی کے مدارس کے فیض یافتہ تھے۔ ماضی تا حال کا مشاہدہ کرنے پر خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اترپردیش کے مدارس سے انجینئر، ڈاکٹر اسکالر، مورخ، مصنف، شاعر، سیاست داں اور ملک کے عظیم رہنما پیدا ہوئے ہیں۔جیسا کہ یوپی کے ایک مدرسے سے فارغ اردو داں وسیم الرحمٰن آئی اے ایس اور عبید قریشی ایم بی بی ایس ڈاکٹر بن کر قومی یکجہتی کی مثال قائم کیے ہوئے ہیں۔اس سلسلے میں مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''اردو کی جسے ہم جنم بھومی یا اردو کا خاص علاقہ کہتے ہیں۔میری مراد اترپردیش ہے، اگر مدارس نے اترپردیش میں اردو کو سہارا نہ دیا ہوتا تو غالباً وہاں سے بالکل ہی اردو کا جنازہ اٹھ گیا ہوتا، جو کچھ بھی اردو باقی رہ گئی ہے بالخصوص اترپردیش میں وہ مدارس کی وجہ سے ہے۔''

(ماہنامہ جام نور دہلی، مارچ 2004، ص 27)

آزادی کے بعد اس ملک کا پہلا وزیر تعلیم آکسفورڈ اور کیمبرج تو دور کی بات ہے، دہلی، کلکتہ، رامپور، لکھنؤ، علی گڑھ اور الہ آباد وغیرہ کی یونیورسٹیوں کا بھی فارغ نہیں تھا بلکہ اسی مدرسے کے نصاب کی پیداوار تھا۔جس نے ہمیں آئی آئی ٹی کھڑگپور، آئی سی سی آر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی اور سی ایس آئی آر جیسے ادارے فراہم کیے۔

یہ وہی اردو زبان ہے جس نے ہندوستان کو آزادی دلانے میں پیش پیش رہی۔انگریزوں کے خلاف ہر وقت ہمارے شانہ بہ شانہ کھڑی رہی۔اس نے جہاں ہمیں 'سارے جہاں سے اچھا' جیسا ترانہ دیا ہے، جیسے قومی ترانے دیے ہیں، وہیں 'انقلاب زندہ باد' اور 'جھنڈا اونچا رہے ہمارا' کے جوشیلے نعرے بھی دیے ہیں اور یہ گنگناتے ہوئے کہ ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سیکڑوں نوجوان کالا پانی گئے اور

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کہتے ہوئے سیکڑوں نوجوان ہنستے مسکراتے پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔ جوش ملیح آبادی کی نظم 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے' گاتا ہوا طالب علموں کا ایک جلوس 1942 میں الہ آباد (پریاگ راج) میں انگریزی حکومت کی لاٹھی اور گولی کا شکار ہوا۔الہ آباد کمپنی باغ (اعظم پور؛ رسول پور اور صمدآباد) کے باشندوں نے جب انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف علم بلند کیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمرانوں نے کمپنی باغ کے بچوں اور خواتین پر ظلم و جبر کے پہاڑ ڈھائے۔ بالآخر ایک ایک کو چن کر چوک الہ آباد میں واقع پانچوں نیم کے درختوں پر پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیے گئے اور شاہی جامعہ مسجد کو شہید کرکے تمام گھروں کو اجاڑ دیا گیا، سبھی محلوں اور بستیوں کو ویران کر ان پر قابض ہو گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مناسبت سے اس علاقے کا نام 'کمپنی راج' رکھا اور اپنا راج الہ آباد کی سرزمین پر چلانا چاہا۔ (جب انگریزوں کے جنرل گورنر کی آمد ہوئی تو اس کے استقبال میں ان محلوں کو پھولوں اور پودوں سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا جس سے یہ علاقہ 'کمپنی باغ' کے اسم سے موسوم کیا جانے لگا۔ سنہ 1870 میں برٹش حکومت نے اس کا نام بدل کر 'الفریڈ پارک' رکھ دیا جس کے میں بھارت سرکار نے چندر شیکھر آزاد کی طرف منسوب کرکے اس کا نام 'آزاد پارک' مختص کر دیا۔) چنانچہ مولوی لیاقت علی کی سرپرستی میں انگریزوں سے مقابلہ آرائی کی مہم تیز ہوئی اور نوجوانوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر انگریزوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ملحوظ خاطر رہے کہ مولوی لیاقت حسین مدرسے کے فیض یافتہ تھے جو اردو زبان و ادب کے پاسدار تھے۔اپنی ولولہ انگیز تقریر اردو زبان میں کرتے تھے جس سے نوجوانوں میں بیداری پیدا ہوتی تھی۔آج بھی ہمارے ملک کے مدارس خوب سے خوب تر ہیں اور اردو زبان و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں جس سے اردو زبان و ادب تابندہ ہے۔ دارالمصنفین سے ماہنامہ 'معارف' ندوہ سے نکلنے والا رسالہ 'الندوہ' مدرسۃ الاصلاح کا ترجمان 'الاصلاح' اور رسالہ 'نظام القرآن' جامعۃ الفلاح کا ترجمان 'حیات نو' جامعہ اشرفیہ کا 'اشرفیہ' اور جامعہ سلفیہ کا 'محدث' اردو میں نکلنے والا ماہنامہ رسالہ ہے۔ بہرحال ان مدارس سے نکلے والے رسالے اردو زبان میں ہوتے ہیں جس کی مدد سے یہ مدارس اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔اردو زبان کے لسانی اور فکری سرمائے میں ارباب مدارس نے جو کردار ادا کیے ہیں اسے رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

■

Dr. Talib Ikram Mohammad
S/O Master Ikramul Haque Abbasi
Vill.: Chhitay Mau
Post- Mahraunda, Via- Mau Aima,
Dist-Prayagraj- 212507 (UP)
Mob.: 7800812595

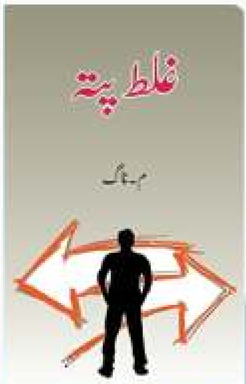

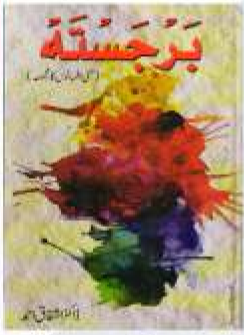

ودربھ کے تین اہم افسانہ نگار

اظہر ابرار

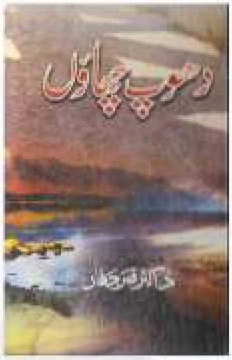

علاقہ ودربھ کی سرزمین عہدِ قدیم سے اردو ادب کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ یہاں سے زبان وادب کے بڑے بڑے دانش ور، شعرا، مصنفین، ادیب وافسانہ نگاروں کا تعلق ہے۔ زمانہ ماضی میں عادل ناگپوری، امبا پرشادطرب جیسے جید علما نے اپنے فکر وفن سے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کیا اسی طرح مختلف جگہوں پر مشاعروں کا انعقاد، چھوٹی بڑی ادبی محفلوں میں شعرا و ادیبوں کی شرکت، اور نئے نئے موضوعات پر کتابوں کی اشاعت نے سرزمین ودربھ میں علم وادب کی نئی روشنی کا آغاز کیا۔ ودربھ کے ان علاقوں میں کامٹی، ناگپور، اچلپور، بالا پور، امراوتی، اکولہ، وروڈ اور کچھ دیگر مقامات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ بلکہ ان علاقوں سے متصل جو دیہات موجود ہیں ان میں بھی اردو زبان سے محبت کرنے والوں نے شمع ادب کو روشن کیا ہے۔

جب ہم ماضی تا حال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں افسانہ نگاروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے جن میں قادر نیازی، زہرہ جبیں، شریف اورنگ، زرینہ ثانی، قیصر واحدی، تبسم شفائی، واجدہ تبسم، نیر جہاں، شیفتہ فرحت، شیام سوشل، قیصر بدنیروی، ق۔ حسرت، ڈاکٹر نگہت ریحانہ، ثریا صولت حسین، بانو سرتاج، میم ناگ، طارق کھولاپوری، کلثوم ممتا، وکیل نجیب، ڈاکٹر اشفاق احمد، نواب رونق جمال، شیخ رحمٰن اکولوی، عظیم راہی، ایم آئی ساجد، غنی غازی، مظہر سلیم، طفیل سیماب، صبغت اللہ، حبیب رتھپوری، سعید احمد خاں، خواجہ غلام السیدین ربانی، شکیل شاہجہاں، غلام رسول اشرف، عمر حنیف، بلقیس شبیہ، ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی، صفیہ سلطانہ، زہرہ جمال، عاجز ہنگن گھاٹی، عبدالقدیر صدیقی، نیلوفر ناہید، کلیم ضیاء، رضیہ مبین نقوی، یحیٰ جمیل، محمد رفیع الدین مجاہد، اکبر عابد، فیروز خاں یاس، سلمٰی نسرین، سکندر عرفان، بابر شریف، ڈاکٹر محمد ابوالکلام، مظہر حیات، عبدالوحید، نیر شبنم، فرزانہ اسد، قیصر انجم، محمد اسد اللہ اور شگفتہ عارف اور اظہر ابرار وغیرہ ہیں ان میں یقیناً خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد کم ضرور ہے۔ لیکن ان کے افسانوں میں چھپا پیغام کچھ کم نہیں ہے۔

یوں تو علاقہ ودربھ میں نثر نگاروں کی فہرست طویل ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں ودربھ کی اس کہکشاں سے اردو ادب کے تین تابناک ستاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جن میں م۔ ناگ، قمر جہاں، اور اشفاق احمد کے نام شامل ہیں۔ اگر ان تین ادیبوں کے فن پاروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ افسانہ نگاری کی دنیا میں سبھی نے معاصر ادب کے سلگتے ہوئے مسائل کو اپنے فن پاروں میں جگہ دی ہے۔ بلکہ ان موضوعات کو بھی چھوا جن کا پڑھنا اور سننا ایک زمانے تک ممنوع قرار دیا گیا۔ اگر قاری ان شہ پاروں کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ م۔ ناگ نے اپنے افسانوں اور افسانچوں میں ناگپور، ممبئی اور مہاراشٹر کے دیگر علاقوں میں بسنے والے عام لوگوں کے مسائل کو پیش کیا تو قمر جہاں نے اپنے افسانوں میں عورتوں اور لڑکیوں کی تکالیف کو اجاگر کیا۔ جبکہ اشفاق احمد نے اپنے منی افسانوں میں قریبی رشتوں میں آئی ہوئی دوری، اپنوں کے کھونے کا دکھ، اپنوں سے ملنے والا دکھ، خوف کے بڑھتے ہوئے سائے اور تنہائی کا کرب بلکہ ان مسائل کو بھی جگہ دی ہے جب کسی کو اپنے ہی قریبی سے دکھ پہنچتا ہے پھر وہ انسان تلملا کر رہ جاتا ہے۔

ودربھ کی اس کہکشاں سے پہلی اہم شخصیت م۔ ناگ ہے۔ آپ کی پیدائش تو چھتیس گڑھ کے ضلع بستر میں ہوئی۔ 1957 میں والد کے تبادلے کے ساتھ آپ ناگپور تشریف لائے اور پھر بہت جلد اس شہر کے ماحول میں رچ بس گئے۔ جب کچھ لکھنا چاہا تو پہلے مختار ناگپوری کے نام سے لکھا پھر محسوس کیا کہ یہ نام کچھ بڑا ہے تو اسے مختصر کرتے ہوئے م۔ ناگپوری کیا اور پھر م۔ ناگ انھیں پسند آگیا۔ اسی نام سے ان کے افسانے اور افسانچے ہندوستان کے معروف اور غیر معروف رسائل وجرائد میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔ یوں تو وہ کہانیاں ہائی اسکول کے زمانے سے لکھتے تھے، ان کی پہلی کہانی

'بابا کی چھبیسویں' کامٹی سے شائع ہونے والے 'ہفت روزہ تاج' میں 1969 میں شائع ہوئی۔ 70,80 کی دہائی میں ابھرنے والے جن قلم کاروں نے اپنی الگ پہچان بنائی ان میں م۔ ناگ بھی شامل تھے۔

م۔ ناگ کسی تحریک یا رجحان سے ہرگز متاثر نہیں ہوئے انھوں نے اپنے ڈھب کی کہانیاں لکھیں۔ اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ نقادان ادب ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ پہلی قرات میں م۔ ناگ کے افسانے سپاٹ معلوم ہوتے ہیں لیکن معنی کی تہوں میں اتر کر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ بات اتنی آسان بھی نہیں، واقعے کا تاثر قاری پر تادیر قائم رہتا ہے۔ م۔ ناگ کے تین افسانوی مجموعے ہیں جن میں 'ڈاکو طے کریں گے'، 'غلط پتہ' اور 'چوتھی سیٹ کا مسافر' شامل ہیں، اسی کے ساتھ ان کا ایک ناول 'دکھی من میرے' ممبئی سے شائع ہونے والے معروف ادبی جریدہ 'نیا ورق' میں بھی قسط وار شائع ہوتا رہا۔ وہ زمانہ اردو قارئین کو اچھی طرح یاد ہوگا جب م۔ ناگ اردو ٹائمز میں ایک مستقل کالم 'ممبئی ڈائری' کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جسے خوب سراہا گیا تھا۔

م۔ ناگ اپنی زندگی میں ایک ایسے ناگ ثابت ہوئے جس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ان کی من موجی طبیعت سے ہر کسی کو فیض ہی پہنچا۔ وہ کبھی کسی ادبی گروپ کا حصہ نہیں بنے ان کی دنیا بالکل مختلف تھی۔ جب ہم م۔ ناگ کی زندگی کے گراف پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے ان کی زندگی ایک جہد مسلسل ہی رہی۔ انھوں نے کبھی کوئی مستقل کام نہیں کیا کبھی کپڑا مل تو کبھی پانی کے ٹینکرا ور ڈیم جیسی جگہوں پر ملازمت کی۔ جب ممبئی آئے تو مختلف کمپنیوں میں کام کرتے رہے پھر بہت سے اخبارات میں اپنی خدمات انجام دیں اور کالم بھی لکھتے رہے۔ معاشی حالات نے انھیں پریشان بھی کیا لیکن کبھی قلم سے اپنا رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ گو کہ انھوں نے کم لکھا لیکن جتنا بھی لکھا اس میں کیفیت بہت زیادہ ہے۔

ناگپور سے انھیں اس قدر محبت و انسیت تھی کہ ناگپور کی مناسبت سے اپنے نام میں ناگپور کا ناگ رکھ لیا۔ وہ شہر ناگپور کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں "میں ناگپور سے پیار کرتا تھا۔ ناگپور نے مجھے وہ سارا مواد فراہم کیا جو بچپن اور لڑکپن کی بنیاد بنتا ہے۔ ایک تنومند ماحول دیا جہاں میں پتنگ کی صورت اڑتا مگر تیز مانجھے سے کٹ جاتا تھا، جہاں میں لٹو کی طرح گھومتا تھا مگر جالی ساتھ چھوڑ جاتی تھی، جہاں میں بیڈمنٹن کی چڑیا، کبھی اس کی لان میں کبھی اس کے پالے میں! میں ناگپور کی گلیوں، سڑکوں کا دیوانہ تھا اس کے شب و روز کا سیلانی تھا۔ ناگپور نے مجھے اپنے اندرون میں جھانکنا سکھایا۔"

(غلط پتہ۔ اقتباس۔ 'تو بھیا کیا کریں')

ممبئی کی سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے م۔ ناگ کو ایک عرصہ بیت چکا تھا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے تینوں مجموعوں میں ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے اور ان کی تخلیقات میں انکشاف ذات کا برملا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے جو کہ قارئین کو خاصا متاثر کرتا ہے۔ کہانیوں میں عام آدمی سے وہی رشتہ، مزاج میں سادگی اس قدر کہ ہر عمر کا انسان انھیں اپنا دوست سمجھے۔ افسانوں میں عام انسانی زندگی کی تصویریں جابجا ہیں جس میں عورت ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے پھر چاہے وہ مزدور ہو، لوکل ٹرین میں دھکے کھاتی ہوئی عورت ہو یا کارخانے میں جاتے ہوئے مزدور بچے اور ممبئی کی چالیوں میں رہنے والے مفلس و خستہ حال لوگ۔ ان تمام انسانوں کی عکاسی من و عن پیش کی گئی ہے۔ یہ بات بھی اتنی ہی صحیح ہے کہ ایک انسان کہانی اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ دوسروں کے کرب کو اس شدت سے محسوس کرے کہ وہ اس کا کرب بن جائے۔ وہ خود کہتے تھے کہ "زندگی میری استاد رہی ہے اور افسانہ میری ڈھال بنا ہے"۔ م۔ ناگ نے بہت حد تک اس بات کو اپنی کہانیوں میں ثابت بھی کیا۔ جس کی مثال آپ 'ڈاکو طے کریں گے' میں، کٹی ہوئی ناک، گھوڑ سوار، دروازہ اور 'غلط پتہ' میں لکڑ بگھا، ایک خوبصورت موڑ، چوتھی سیٹ کا مسافر، کھر نڈ، محفوظ سیکس، لٹکی ہوئی عورت ہیں۔ م۔ ناگ کی تحریریں سادگی کی مثال ہیں لیکن اس سادگی کے پیچھے طنز کے گہرے نشتر بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے جملوں میں بلا کی برجستگی ہے۔ انداز ایسا کہ پڑھتے پڑھتے کہانی کا خاتمہ اس موڑ پر ہوتا ہے جہاں قاری کے ذہن میں بنا ہوا سارا نقشہ الٹ پلٹ جاتا ہے گویا وہ اس دور کی بے رحم سچائی کو اس طرح سے واشگاف کرتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے ہم سن پڑ جاتے ہیں۔ م۔ ناگ نے اپنی کہانیوں میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال بہت زیادہ گنجلک انداز میں نہیں کیا۔

م۔ ناگ کے معترضین نے ان پر جو سب سے زیادہ اعتراض کیا وہ ان کی تخلیقات میں جنس کا وفور ہے۔ عورت کے مختلف روپ ان کے یہاں نظر آتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ افسانوں میں کچھ ایسے الفاظ بھی استعمال کیے گئے جو غیر شائستہ ہیں۔ اگر ان الفاظ کو الگ کر بھی لیا جائے تو افسانے کے تاثر میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ لیکن جو اہم بات م۔ ناگ کی شخصیت کے تعلق سے کہی جاتی رہی ہے وہ یہ کہ "اس آدمی کا خلوص اور محبت اس کے افسانوں سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتا چلا گیا۔"

جس بات پر م۔ ناگ متنازع رہے اسے ساجد رشید نے کچھ یوں سمجھایا "اگر م۔ ناگ عورت کو آدرش وادی پیکر میں نہیں دیکھتے ہیں اور وہ اس کی نفسیات کی پیچیدہ گتھیوں کو بھی نہیں پیش کرتے ہیں تو پھر وہ اپنے افسانے کی عورت کی پیشکش میں کس طرح مختلف ہیں؟ دراصل م۔ ناگ بڑی حد تک سفاک لاتعلقی کے ساتھ اپنے کرداروں خاص طور پر نسوانی کرداروں کی نبض اس ڈاکٹر کی طرح دیکھتے ہیں جو مریض کے مرض کو سمجھنے اور اس کی تشخیص سے تو دلچسپی رکھتا ہے، لیکن اسے مریض اور مرض دونوں ہی سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہوتا ہے۔"

اگر اس معاملے کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ م۔ ناگ ایک ایسا تخلیق کار ہے جو سماج میں جیسا دیکھتا ہے ویسا ہی من و عن لکھ بھی دیتا ہے اور جملوں کو بڑی سادگی و معصومیت سے پرو دیتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ان باتوں کو اشاروں اور کنایوں میں بھی کہا جاسکتا تھا، بالکل کہا جاسکتا تھا اور کہنے والوں نے کہا بھی جس سے کئی بار قارئین نے اس نسوانی کردار کو ہمدردی کی عینک لگا کر دیکھا یا اسے مجبوری میں اٹھایا گیا قدم قرار دے دیا گیا۔ لیکن م۔ ناگ کا معاملہ کچھ اس طرح مختلف ہے کہ وہ سماج کی سچائی سیدھے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ جب بھی اردو میں افسانہ نگاروں کی بات کی جائے گی م۔ ناگ کے فکر و فن، اسلوب، انداز تخاطب پر ضرور بات ہوگی۔

ودربھ کی دوسری اہم خاتون افسانہ نگار ہیں ڈاکٹر قمر جہاں، آپ نے خانگی زندگی کے مختلف گوشوں سے اپنے افسانوں کے تانے بانے کو بنا ہے۔ گھر کی حدود کو اپنا کینوس بنایا ہے جس میں موجود کرداروں کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ افسانے زندگی کی حقیقت سے بھرپور ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ نہایت مربوط ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'دھوپ چھاؤں' اور 'زندگی تیرے لیے' کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے لیے مواد اپنے آس پاس سے ہی اکٹھا کرتی تھیں ان کے افسانوں کا ہر کردار اس فن کاری سے پیش کیا گیا ہے کہ نہ ہی افسانہ پڑھتے وقت جھول محسوس ہوتا ہے اور اس بات کا احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ قاری کسی نئی دنیا کی مخلوق کے بارے میں پڑھ رہا ہے۔

قمر جہاں ایک خاتون ہونے کے ناطے صنف

نازک کے مسائل کو خوب جانتی بھی تھیں اور انھوں نے اپنے افسانوں میں بیشتر نسائی کرداروں کے مثبت اور منفی رخ پیش کیے ہیں جو اس بات کی واضح دلالت ہیں کہ انسان میں خیر وشر کا مادہ پایا جاتا ہے اور وہ اپنی فطرت کے آگے مجبور ہے جس کا اظہار کسی نہ کسی صورت ہوتا رہتا ہے۔ پھر جب خیر کی قوت غالب آجاتی ہے تو یہ عورتیں دوسروں کے لیے قربانی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں اور بڑے حوصلے کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں لیکن شر کا پہلو مزاج میں ابھرنے کے بعد یہی عورتیں اپنے جیسے ہم جنسوں کی دشمنی میں ملوث ہوکر انھیں تباہ و برباد کردیتی ہیں۔

'دھوپ چھاؤں' کے عرض حال میں قمر جہاں لکھتی ہیں "افسانہ لکھتے وقت میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں نے زندگی کو جس انداز سے دیکھا ہے، اس کی کڑوی سچائیوں نے مجھے جس طرح متاثر کیا ہے انھیں اس طرح پیش کردوں کہ وہ میری سوچوں کی ترجمان بھی ہوں۔ میں نے زندگی کی ناہمواریوں، ناآسودگیوں، تلخیوں اور ناکامیوں کو اپنے افسانوں میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ زندگی کے اس رخ کو دنیا کے سامنے پیش کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں اور یہی میری افسانہ نگاری کی تحریک بھی ہے۔"

غصہ اور شک انسان کے دو بڑے دشمن ہیں ان جذبات نے اب تک نہ جانے کتنی ہنستی کھیلتی زندگیوں کو تباہ کیا ہے۔ اگر آدمی ایک مرتبہ شک کے مرض میں مبتلا ہوجائے تو کوئی دوا اس مرض سے چھٹکارا نہیں دلاسکتی۔ پھر یہ شک رشتوں کو کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ افسانہ 'شک' میں ڈاکٹر قمر جہاں نے ایک باصلاحیت بامروت۔ نیک دل اور شریف النفس عورت عندلیب کی ہنستی کھیلتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے جس پر اس کا شوہر بے جا شک کرتا ہے وہ اپنے کسی ہم پیشہ ساتھی سے بات کرتی ہے تو اس پر بد کرداری کے الزامات لگائے جاتے ہیں نتیجتاً وہ ان طعنوں اور بے جا الزام تراشیوں سے پریشان ہوکر ذہنی مریض بن جاتی ہے اور پھر ایک دن موت کے دامن میں پہنچ کر سکون کی نیند سو جاتی ہے۔

عورت کے خمیر میں وفاداری، ایمانداری، شرافت، دردمندی اور رشتوں کو نبھانے کا ہنر بھی موجود رہتا ہے اور جب وہ کسی گھر میں بہو بن کر جاتی ہے تو اپنی ہستی کو مٹا کر رکھ دیتی ہے تاکہ اس کے سسرال والے حرف شکایت زبان پر نہ لاسکیں۔ افسانہ 'میں خوش ہوں' کی پروین اپنے سسرال میں ہر کسی کے لیے ایک روبوٹ بن کر صرف حکم ہی نہیں بجالاتی بلکہ اس بات کا بھی اسے خوب خیال ہے کہ کوئی ناراض نہ ہوجائے اس کردار میں احساس بدرجہ اتم موجود ہے وہ مسلسل تکلیف سہتی رہتی ہے۔ کسی سے گلہ کرنا جیسے اس کی فطرت ہی نہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ایسی عورتوں کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے شوہر کے گھر والوں سے اس قدر اپنائیت کا مظاہرہ کرتی ہیں کہ پھر اپنی خواہشات، تمناؤں کا گلا بار بار گھونٹ کر بھی خوش رہتی ہیں اور ہر کام کے لیے لبیک کہتی ہیں افسوس کا مقام ہے کہ ان کے شریک زندگی ان کو کسی مشینی پرزے کی طرح استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔

معروف نقاد ڈاکٹر شرف الدین ساحل اس مجموعے کے متعلق رقم طراز ہیں "ڈاکٹر قمر جہاں کے افسانے سماجی حقائق کے تناظر میں ہیں، ان کا تانا بانا آئے دن رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے تیار ہوا ہے۔ انھوں نے حسد، انتقام، عیاشی، ریاکاری، غرور اور مفاد پرستی کے قبیح نتائج کو حسن وخوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانوں میں زیادہ تر عورت کی اچھی اور بری نفسیات نظر آتی ہے جو ان کی زندگی کو مسرت وشادمانی یا رنج وغم کے حوالے کرتی ہے۔"

ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھیں، صلح اور صبر سے کام لیں۔ اس میں دونوں کے والدین بھی بہت اہم کردار نبھاتے ہیں تاکہ کسی سے خطا ہوتو اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ لیکن تصویر اس کے برعکس ہے۔ والدین اپنے بچوں کو کسی قیمت پر بھی نہ جھکنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ خصوصاً بیٹیوں کی مائیں انھیں مردوں کے شانہ بہ شانہ ثابت کرنے کی ہوڑ میں اپنی بیٹیوں کو غلط تعلیم وتربیت دے کر خود اپنے ہی ہاتھوں ان کی زندگی برباد کررہی ہیں جس کی وجہ سے شرح طلاق میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس نازک مسئلے کو قمر جہاں نے افسانہ 'وہ نہیں میں' میں بیان کیا ہے۔ جہاں بے جا لاڈ وپیار میں پلی بیٹی شادی کے بعد اپنے شوہر کی فرمانبرداری اور اس کے والدین کا احترام نہیں کرتی اور اپنی والدہ کی شہ پر فہیم جیسے محبت کرنے والے شوہر سے محض اپنے غرور وتکبر کی وجہ سے طلاق لے لیتی ہے۔ فہیم کو دوسری بیوی اور بچے کی ساتھ خوش دیکھ کر افسوس کرتے ہوئے کہتی ہے "میں نے طلاق لیتے وقت یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ مردوں کی زندگی کے باغ جس قدر جلد اجڑ جاتے ہیں دوبارہ اتنے ہی جلد سنور بھی جاتے ہیں اس کے برعکس عورتوں کی زندگی سے بہاریں جتنی جلدی رخصت ہوتی ہیں دوبارہ بہت آہستگی سے وہاں آکر اپنا خیمہ تانتی ہیں۔"

حسن ایک جادو ہے جو سب سے پہلے خود اس شخص پر ہوجاتا ہے جسے یہ یقین ہوجائے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ حسین ہے پھر وہ اپنی خوبصورتی کی قیمت لینا چاہتا ہے اور شہرت کی اس بلندی پر جا بیٹھنے کی خواہش میں سرگرم عمل رہتا ہے جہاں صرف اور صرف وہ لوگ موجود ہوں جو اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہوجائیں۔ افسانہ 'شہرت' میں خوشبو گاؤں کی خوبصورت لڑکی ہے جس کا ناک نقشہ ذرا لٹکا ہوا ہے اسے ہیروئن بننے کی تمنا ممبئی جیسے شہر میں پہنچادیتی ہے جہاں وہ دھوکے بازوں کا شکار بنتی چلی جاتی ہے۔ دردر کی ٹھوکریں کھانا اس کا مقدر بن جاتا ہے لیکن اسے اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں مل پاتی۔ گاؤں میں سونو کی محبت کو ٹھکرا کر وہ اپنے ارمانوں کی سیج سجانے نکل پڑتی ہے لیکن آخر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بار ڈانسر بن جاتی ہے پھر شدید بیمار رہنے سے گم نامی کی موت مرجاتی ہے۔ گلیمر کی چکاچوند کردینے والی روشنی، کے پیچھے ایسی لڑکیاں گہرے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہیں اور پھر اپنے گھر والوں کو صورت بتانے کے لائق بھی نہیں رہتیں کیونکہ ان روشنیوں کے راستے اکثر تنہائی، بے بسی، بے چارگی اور گمنامی کی گلیوں میں جاکر ختم ہوتے ہیں۔ قمر جہاں کے دونوں افسانوی مجموعے نسوانی زندگی اور ان کے مسائل کو فنکارانہ طور پر پراثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بہار کے افسانہ نگاروں میں قمر جہاں ایک اہم نام ہے لیکن یہاں پر مہاراشٹر کی افسانہ نگار کا ذکر کیا گیا جو ان کی ہم نام تھیں اور جو اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ودربھ کی افسانوی دنیا سے منفرد افسانہ نگار ڈاکٹر قمر جہاں نے اپنے مضامین وافسانوں سے اردو ادب میں اضافہ ہی کیا ہے۔ قمر جہاں شہر ناگپور کے ایل۔اے۔ڈی کالج میں شعبہ فارسی اور اردو کی صدر تھیں۔ اس کالج میں گریجوئٹ لیول تک لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ آپ ان لڑکیوں کی فکر میں رہتیں جو کالج میں داخلہ نہیں لے پاتیں اور ان کی ہر حال میں مدد کرتیں تاکہ وہ اردو زبان پڑھیں سمجھیں۔ کالج میں جب بھی مختلف ادبی پروگرام منعقد کرنے کا موقع آتا لڑکیوں کو ان میں حصہ لینے کے لیے ترغیب دیتیں پھر چاہے وہ غزل سرائی کے مقابلے ہوں تقاریر یا تمثیلی مشاعرے لڑکیوں کو ان سب کے لیے تیار کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا انھیں خوب پسند تھا۔ آپ کے شریک حیات ڈاکٹر عباس علی ناگپور کے وسنت راؤ نائک آرٹس اینڈ کامرس کالج میں شعبہ عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور ریسرچ گائیڈ بھی۔ قمر جہاں نے مختلف سمناروں میں

شرکت کی انھوں نے ایران کا سفر بھی کیا وہاں اپنے تحقیقی مضامین بھی پڑھے۔

ودربھ کا ایک اہم نام اشفاق احمد ہے۔ آپ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کی بیس سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں ادب اطفال، بچوں کے لیے کہانیاں، افسانے، دینی کتابیں افسانچے، منی افسانے ودربھ میں ادب اطفال اور دیگر کتب شامل ہیں۔ آپ کا قلم بہت زیادہ متحرک ہے۔ آپ نے نئے نئے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جب قاری اشفاق احمد کی تحریر کو پڑھتا ہے تو پوری کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ آپ نے اردو زبان کی اہم شخصیات کی کتابوں پر بھی تبصرے لکھے جن میں ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن کی کتاب 'برار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' ڈاکٹر شرف الدین ساحل کی کتاب 'ناگپور میں اردو' اور ڈاکٹر مہتاب عالم کی کتاب 'وسط ہند میں اردو' مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 'اردو آٹو گراف' وغیرہ شامل ہیں۔

اشفاق احمد کی کتابیں جن میں افسانے اور منی افسانے شامل ہیں ان میں 'یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے' 'ایک زخم اور سہی' اور 'برجستہ' شامل ہیں۔ مجموعہ 'ایک زخم اور سہی' میں اشفاق احمد افسانوں کے بارے میں کہتے ہیں، ''ایک زخم اور سہی' میری کہانیوں کا دوسرا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے قبل 1993 میں میرا پہلا مجموعہ 'یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے' شائع ہوا جس کی کہانیوں کو قارئین نے خوب سراہا۔ انسانی زندگی میں بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات مسائل اور حادثات رونما ہوتے ہیں انھیں بلاوجہ کھینچ تان کر طویل کرنے کی بجائے منی کہانی کے پیکر میں ڈھالنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ 1980 کے آس پاس قلم سنبھالا تھا آج تک اسی راہ پر گامزن ہوں۔''

آپ کے افسانوں میں معاشرے کی عکاسی واضح طور پر نظر آتی ہے اور ان وجوہات کا بھی ذکر ملتا ہے جن سے ہماری قوم میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ آج کے مشینی دور نے انسانوں کو بہت محدود کر کے رکھ دیا ہے موجودہ دور کی اہم ضرورت منی افسانے بن گئے ہیں۔ اشفاق احمد کے دو مجموعے 'ایک زخم اور سہی ہے اور برجستہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آپ کا رجحان منی افسانوں اور افسانچوں کی جانب بہت زیادہ ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان مجموعوں کا مطالعہ گہرائی سے کرنے کے بعد قاری کو ایک سے بڑھ کر ایک منی افسانے پڑھنے کے لیے ملتے ہیں۔ جن میں زندگی کی سچائی، حالات کا کرب، آپسی رنجش رشتوں میں آئی ہوئی دراڑ انسانوں کے درمیان خونی کھیل اور تعصب کی وہ آگ نظر آتی ہے کہ جس نے قارئین کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ منی افسانے اپنے آپ میں فکر و تحقیق کا وہ خزانہ چھپائے ہوئے ہیں کہ ان منی افسانوں میں چھپے ہوئے پیغام میں حالات کا آئینہ صاف نظر آتا ہے۔ یہ شہ پارے صرف سوچنے پر ہی مجبور نہیں کرتے بلکہ فکر و عمل کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ ان میں سیاست داں، پولیس، بھکاری، حسن و محبت کی فریب کاریاں، غریب شاعر، گاوں کا ماحول، شہر کی گندگی، نمایاں چہروں کے پیچھے بسنے والا سچ، تہذیب کے نام پر استحصال ان تمام باتوں کا علم ہوتا ہے۔

اشفاق احمد کے منی افسانوں میں ان کا فن خوب ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ یہ ہیں جن میں تبدیلی، سچ، ناخلف بیٹے، پس پردہ، نیا دکھ، وقت کی کروٹ، بہت دیر کردی، ایک ہی کشتی کے سوار، نابینا مسافر، خوش حال گھرانے، پھلوں کا دکھ، اور حصے کا رزق، جہیز کی آگ، مہلت، انا کی موت اور قول و فعل ہیں۔

یہاں پر اشفاق احمد کا ایک منی افسانہ پیش کیا جا رہا ہے۔ 'خواہش' جس میں ایک لڑکی کا ڈر صاف صاف نظر آتا ہے لیکن بھائی کا لفظ آنے سے وہ اپنے آپ کو حفاظت میں محسوس کرتی ہے۔

سنیے...!

جی...!

میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں

کہیے...

لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

ڈر... کس بات کا ڈر۔ مجھ جیسے انسان سے ڈر...

ارے میں تو تمہارے بڑے بھائی کی طرح ہوں۔ کہو نا...

نہیں اب میں وہ بات کبھی نہیں کہوں گی۔

اشفاق احمد کا ایک افسانہ 'فرق' ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کیسے ایک ہی آفس میں دو بھائی کلرک ہونے کے باوجود معاشی طور پر ان میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں اور منی افسانوں کے تعلق سے ملک کے بڑے بڑے دانشور، نقاد اور افسانہ نگاروں نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے جس میں انھوں نے افسانہ نگار کے فن کو ہر طرح سے جانچا پرکھا اور اس بات کا اشارہ دیا کہ آپ کے افسانے معاصر ادب کے لیے نہایت موضوع ہیں۔ آپ کے تخلیق پاروں میں زندگی کو دیکھنے کا ایک منفرد زاویہ نگاہ موجود ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں ''مختصر افسانوں پر مشتمل آپ کی کتاب 'ایک زخم اور سہی' ملی بہت بہت شکریہ۔ میں نے منی افسانوں کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ تمام افسانوں میں کوئی نہ کوئی سماجی پہلو ہے یا معاصر زندگی کی کسی تلخ حقیقت پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ مجموعہ بہت کامیاب ہوگا۔''

سلام بن رزاق کہتے ہیں ''ایک زخم اور سہی کے سارے افسانچے میں نے ایک نشست میں پڑھ لیے بعض افسانے بے حد خوبصورت بلکہ غزل کے شعر کی طرح مکمل اور پر تاثر ہیں۔ ویسے ایک زخم اور سہی کے منی افسانوں میں تمہارے قلم کی انفرادیت پوری شان سے موجود ہے۔''

اشفاق احمد کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا گیا جن میں مہاراشٹر، اتر پردیش اردو اکیڈمیز کے انعامات شامل ہیں، ساتھ ہی آپ کو پریم چند لیکھک پرسکار سے بھی نوازا گیا اور مہاراشٹر دلت ساہتیہ اکادمی نے ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر آدرش شکشک ایوارڈ بھی تفویض کیا۔ اس کے علاوہ آپ کو اور بھی بہت سارے انعامات ملک بھر کی سوسائٹیوں اور اکادمیوں نے پیش کیے۔ ساتھ ہی آپ مختلف ادبی محفلوں کے مدیر بھی رہے ہیں۔ جن میں نقوش قدوائی، کہکشاں، شاہین، الفلاح، انجمن فلاح المسلمین وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اشفاق احمد نے مختلف سمیناروں اور ادبی اجلاس میں مقالات، کہانیاں پڑھیں۔ نصابی کتب کی تیاری میں بال بھارتی پونے میں اردو کتابوں کی نظر ثانی کے اردو ورکشاپ میں شریک ہوئے۔

آج اردو ادب کی یہ تین بڑی ہستیاں م۔ ناگ، قمر جہاں اور اشفاق احمد ہمارے درمیان نہیں رہیں، لیکن ان اہل قلم کی تخلیقات ہمارے ادب میں ہمیشہ باقی رہیں گی۔

حوالہ جات

1 غلط پتہ: م ناگ
2 چوتھی سیٹ کا مسافر: م ناگ
3 سبز شاخ: ڈاکٹر اشفاق احمد
4 یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے: ڈاکٹر اشفاق احمد
5 برجستہ: ڈاکٹر اشفاق احمد
6 زندگی تیرے لیے: ڈاکٹر قمر جہاں
7 دھوپ چھاؤں: ڈاکٹر قمر جہاں
8 انشائیے کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں: محمد اسد اللہ
9 کار جہاں بینی: شریف احمد شریف

■

Dr. Azhar Abrar Ahmad
Assistant Professor & Head
Department of Urdu,
Seth Kesarimal Porwal College
Kamptee, Nagpur - 441 002 (MS)

محمد عامر

ناول 'آگ کا دریا'
اور قدیم ہندوستان کی معنویت

اردو ادب کی ممتاز فکشن نگار 'قرۃ العین حیدر' کا مشہور زمانہ ناول 'آگ کا دریا' جو اپنے پلاٹ اور پھیلاؤ کی بدولت ہمیشہ بحث کا موضوع رہا ہے۔ اس ناول کی عظمت کا اعتراف ہر ادیب اور ناقد نے کیا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں ہندوستان کی ہزاروں برس کی تاریخ اور تہذیب کو پیش کیا ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے جہاں ہمیں قدیم ہندوستان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، وہیں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستان کی سائیکی کی جڑیں اسی قدیم ہندوستان میں پیوست ہیں۔ اگر ہم ناول 'آگ کا دریا' کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ناول نگار 'قرۃ العین حیدر' نے کس محنت اور جانفشانی سے قدیم ہندوستان اور اس کے فلسفے کو سمجھا اور پیش کیا ہے۔ ناول کے مطالعے سے ناول نگار کے اس والہانہ عشق کا پتہ چلتا ہے جو انھیں ہندوستانی درشن/ فلاسفی سے ہے۔

ایک سو ایک ابواب پر مشتمل اس ناول کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو تین مختلف قسم کی تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ تین مختلف تہذیبیں جب باہم ملتی ہیں تو موجودہ ہندوستان کی تشکیل ہوتی ہے۔ موجودہ ہندوستانی سائیکی میں جس فلسفے کی کارفرمائی ہے اس کا بیان ناول نگار نے شروع کے ابواب ایک سے سولہ تک میں مفصل طور پر کیا ہے اور انھیں ابواب کے سہارے ناول 'آگ کا دریا' اپنی آگے کی منزلیں طے کرتا ہے۔ یہ حصے ناول کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

ناول کے اس پہلے حصے کا تعلق 'شراوستی' اور 'پاٹلی پتر' سے ہے۔ شراوستی ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کا سب سے شمالی ضلع ہے جبکہ پاٹلی پتر کا نام تبدیل کر کے پٹنہ کر دیا گیا ہے جو کہ ہندوستان کے صوبہ بہار کی موجودہ راجدھانی ہے۔ یہ دونوں شہر اپنی قدامت اور روحانیت کے لیے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہیں۔ شراوستی جہاں 'گوتم بدھ' کو عظیم ریاضت کے بعد گیان ملا، اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ شراوستی سے امن، پیار، محبت کی ایسی روشنی پھیلی کہ اشوک جیسا عظیم حکمراں جب کلنگ کی جنگ اور اس کی ہولناکیوں سے گھبرا گیا تو اسے صرف بدھ کی پیروی میں ہی سکون نصیب ہوا۔ بدھ کے امن کے فلسفے نے جنگوں سے تباہ حال انسانوں کو پھر سے جینے کے قرینے سکھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعلیمات تمام براعظم ایشیا میں پھیل گئیں۔ بدھ کی تعلیمات کا ایسا اثر ہوا کہ ایک لمبے عرصے تک عوام الناس جنگ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رہی۔

گوتم نیلمبر جو ناول کا پہلا کردار ہے اور قدیم ہندوستان کی نمائندگی کرتا ہے وہ شراوستی کے ایک پنڈت گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ شرواستی کے ہی ایک آشرم میں اس کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ آشرم میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے گاؤں گاؤں جا کر دال چاول بھی مانگ کر لانا پڑتا ہے۔ ایک دن جب وہ بھیک مانگنے کے سلسلے میں شراوستی سے دور ایودھیا نکل جاتا ہے۔ گوتم نیلمبر ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ تھا لیکن آشرم کی تعلیم کا یہی اصول تھا کہ کھانے کے لیے بھیک مانگ کر لایا جائے تا کہ انسان کے اندر جو عظیم المرتبت ہونے کا غرور ہے اس کا خاتمہ ہو سکے۔ ایودھیا سے لوٹتے وقت رات ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سریو ندی کے کنارے ایک مندر کی دیوار کے سائے میں سونے کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ لیٹے لیٹے اسے پتہ چلتا ہے کہ پاس میں کوئی اور شخص بھی لیٹا ہوا ہے۔ دوسرے لیٹے ہوئے شخص کا نام ہری شنکر ہے۔

ہری شنکر ناول کے پہلے حصے کا بہت ہی اہم کردار ہے۔ یہی وہ کردار ہے جو گوتم نیلمبر کو دنیا جہان کی باتیں بتاتا ہے۔ ہری شنکر نے تکشِلا سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اس نے ادب، فلسفہ، ریاضی، قانون اور طبیعیات کی تعلیم حاصل کی لیکن ریاضی، قانون اور طبیعیات میں اسے مہارت حاصل تھی۔ ہری شنکر اور گوتم نیلمبر کے مابین ہونے والی گفتگو ہی دراصل قدیم ہندوستان ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، مذہب اور ادب ہے۔ غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول نگار نے ان مکالموں میں اتنی معنویت، گیرائی اور گہرائی رکھی ہے کہ جس میں قدیم ہندوستان کے ہر روپ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ گوتم کے پوچھنے پر کہ کیا وہ کشن واسو دیو کا بھکت ہے تو ہری شنکر اسے بتاتا ہے کہ وہ اس جگہ سے آ رہا ہے جہاں شیو کی عبادت کی جاتی ہے۔ ہری شنکر گوتم کو بتاتا ہے کہ اس نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بہت ساری جگہوں کی سیر کی۔ وہ بتاتا ہے کہ اس نے اپار سمندر کے کنارے دوارکا کے درشن کیے۔ وہ متھرا گیا۔ برہم دت میں ہستنا پور کے کھنڈر دیکھے۔ ہری شنکر کی باتوں سے گوتم بہت مرعوب ہوتا ہے۔ ہری شنکر بودھ مذہب کا ماننے والا تھا جب کہ گوتم نیلمبر ایک پنڈت تھا لیکن پنڈت ہونے کے باوجود وہ اپنے سماج کی تنقید کیا کرتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب ہری شنکر اس سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ کاشی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے تو گوتم بتاتا ہے کہ نہیں وہ شراوستی میں ہی تعلیم حاصل کر رہا ہے کیونکہ کاشی کی پاٹھ شالہ تو صرف مہا پنڈت تیار کرتی ہے۔ گوتم کے اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پنڈت نہیں بننا چاہتا تھا۔ گوتم ہری شنکر سے پوچھتا ہے کہ کیا اسے ناٹک میں دلچسپی ہے؟ ہری شنکر اسے بتاتا ہے کہ اسے پہلے ناٹک میں دلچسپی تھی لیکن اب نہیں ہے۔ گوتم اسے بتاتا ہے کہ تین سو سال پہلے تمہارے تکشلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پانِنی تھا۔ اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی۔ دونوں کے مابین لفظوں کے رموز واوقاف کو لے کر کافی باتیں ہوتی ہیں۔ ہری شنکر کا ماننا تھا کہ اب ہمیں الفاظ اور آوازوں کا رمز چھوڑ دینا چاہیے جبکہ گوتم کا کہنا تھا کہ اوم کے تین حرفوں اور ساپاسا کے تین سُروں کے درمیان تو

کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے۔ آواز آکاش کا ایک گن ہے۔ گوتم ہری شنکر سے کہتا ہے کہ وہ کیسا فلسفی ہے جو الفاظ میں یقین نہیں رکھتا۔ پانِنی، تمھارے تکششِلا کے استاد نے کہا تھا اپنے یا دوسروں کے خیالات کے مظاہر صرف خیالات ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے۔ الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کیسے پہنچ پاؤ گے؟ آواز الفاظ کا پراکرتک گُن ہے۔ اور مادہ ابدی ہے۔ وید زبان کی شکل میں برہما ہے۔ اور مادہ برہما ہے۔ ہری شنکر گوتم کے لفظ کی ابدیت کے خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کا ماننا ہے کہ لفظ اور آواز وقتی چیزیں ہیں جب کہ سُر ہمیشہ باقی رہیں گے۔

گوتم نیلمبر اور ہری شنکر کے درمیان ہونے والی گفتگو دراصل ایک ایسا بیانیہ ہے جس کے توسط سے ناول نگار نے اس زمانے کے حالات، سائیکی، تہذیب وتمدن کو پیش کیا ہے۔ اور ساتھ ہی منظر نگاری میں بھی اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور جملوں کا تسلسل اتنا سحر انگیز ہے کہ جن کے پڑھنے سے ہم قدیم ہندوستان کی جادوئی دنیا میں کھوتے چلے جاتے ہیں۔ شہروں کی منظر نگاری اس طرح سے کی گئی ہے کہ اس میں تاریخی اور مذہبی رنگ بھی سما گیا ہے۔ جیسے ہری شنکر جب ایودھیا شہر کا ذکر کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے پوری ایک جیتی جاگتی تہذیب ہماری نظروں کے سامنے رقصاں ہوگئی ہو۔ ملاحظہ ہو:

''مقدس سرجُو—رِگ وید میں بہنے والی ندی—میری ماں—جانے کب تک اسی طرح بہتی رہے گی—سامنے میرا شہر ہے۔ خوبصورت۔ شاندار ایودھیا۔ کتنے زمانے سے اسی جگہ پر یوں ہی راتوں کو جگمگاتا رہا ہے۔ کتنے جُگ بیت گئے جب منو کا بیٹا اس کا پہلا بادشاہ بنا تھا اور شیو بھگت بھاگیرت اور ڈِگ وجے (فاتح عالم) رام چندر۔ ایودھیا۔ اج کا۔ برہما کا شہر۔ جسے کوئی جیت نہیں سکا۔ تم نے کبھی اس نگری کے رقاصوں اور سنگیت کاروں کو دیکھا ہے؟ یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو؟ راج محل میں بسنت کا تہوار منایا ہے؟ یہیں پر چمپک رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھر والے اور میری بہن میرے منتظر ہیں—جس طرح سری کرشن کو اپنی بہن سبھدرا پیاری تھی ویسے ہی میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا۔ مگر میں نے اس کی محبت کو دوسری محبتوں اور وفاداریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر اودھ لوٹ آیا—رام نے چودہ برس کے بن باس کے بعد لوٹنے کا وچن دیا تھا۔ میں بھی واپس آیا ہوں مگر سدھارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے بھی آزاد کر دیا ہے—میری بہن—رام چندر کی بہن شانتا کی ایسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے تھے کہ اسی ایودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی ایسے ہی نرملا اور چمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں۔''

(آگ کا دریا: قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012، ص52)

ناول نگار قرۃ العین حیدر کو منظر نگاری کے فن میں ملکہ حاصل ہے۔ وہ جس شے کی منظر کشی کرتی ہیں ہو بہو مجسم تصویر بنا دیتی ہیں۔ یہاں انھوں نے ایودھیا شہر کا منظر کھینچا ہے۔ ان کا انداز اور لفظوں کا انتخاب اتنا مکمل ہوتا ہے کہ ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اردو ہندی کی ساجھی وراثت اگر کسی ناول نگار کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے تو وہ قرۃ العین حیدر کی ذات ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں جہاں ناول نگار نے ایودھیا شہر کی منظر کشی کی ہے وہیں اس کے تاریخی پس منظر کو بھی بہ حسن وخوبی بیان کیا ہے۔ ان تاریخی واقعات کے سہارے مصنفہ نے قدیم ہندوستان کی عظیم الشان حکومت، رسم و رواج اور طور طریقوں کو بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔

ایودھیا شہر کی اتنی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ایک پورا جیتا جاگتا شہر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ایودھیا شہر کی عکاسی صرف منظر نگاری تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہیں تہذیب و ثقافت کو بھی سمو دیا گیا ہے۔ اسی طرح جب شراوستی شہر کا بیان کرتی ہیں تو ان کے تخیل کی بلندی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ایک ایک کونہ اور ایک ایک سِرے کی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے:

''شراوستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا، دور دور کے دیشوں سے آئے ہوئے لوگ یہاں رہتے تھے۔ الگ الگ محلوں میں کاریگر، سُنار بزاز، آڑھتی اور دوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں۔ ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے اپنے قوانین۔ چوروں تک کی منڈلی مع ایک باضابطہ شاستر کے موجود تھی۔ بارہ مہینے چہل پہل رہتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگار خانوں میں مصروف رہتیں۔ ناٹک منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا۔ ناٹک اور ناٹکائیں زرق برق کپڑے پہنے، چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں۔ چوراہوں پر مداری اپنے کرتب دکھلاتے، بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں، اچکوں اور ٹھگوں کا مجمع رہتا۔ تہواروں کے موقعے پر بنجارے تاڑی پی کر زور زور سے گاتے پھرتے۔ ڈوم نقلیں کرتے۔ دیش ناریاں چھن چھن کرتی اپنی انگلیوں میں ٹہلتیں۔ امیر زادیاں سولہ سنگار کیے تھالیوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں۔ عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی۔'' (ایضاً، ص92)

شراوستی شہر جو مذہبی اور ثقافتی رواداری کی وجہ سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے اور اسی رواداری کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ومعروف بھی ہے۔ یہ شہر زمانۂ قدیم سے موجودہ دور تک قائم وآباد ہے۔ اس شہر سے ہندوستانیوں کو آج بھی والہانہ لگاؤ ہے۔ ناول نگار نے شراوستی میں ہندوستانی سماج کے ہر طبقے کو لاجمع کیا ہے۔ یہاں ناول نگار نے کاریگر، سنار، بزاز، آڑھتی، مصور، سنگ تراش، نوٹنکی، مداری، ٹھگ، بنجارہ، ڈوم، امیر وغریب وغیرہ غرض کہ ہر طبقے کی نمائندگی کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ کوشلوں کے دور حکومت میں یہ شہر ان کی راجدھانی تھا جس کی وجہ سے اس کو بننے اور سنورنے کا خاص موقع ملا۔ مہاتما بدھ نے بھی اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ اسی شہر میں بسر کیا۔ جس کی وجہ سے اس کی مذہبی اہمیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ کیسے ناول نگار نے ایک تسلسل کے ساتھ ان واقعات اور خیالات کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے جن سے مل کر موجودہ ہندوستان کی سائیکی کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان واقعات، اصولوں اور فلسفیانہ جملوں کو یکے بعد دیگرے قلم بند کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو اس قدیم ہندوستان کی عظمت کا احساس ہو سکے۔ وہ ہندوستانی عظمت جس کو ناول نگار پیش کرنا چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اب شاکیہ منی بھی خالص اسی کوشل دیش کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی شراوستی آکر برسوں رہے۔ انھیں پری نروان حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی مگر سارا ملک ایک نئے نارنجی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔'' (ایضاً، ص42)

''لیکن..... گوتم نیلمبر ہری شنکر کی بات کاٹی۔ لیکن اوم کے تین حرفوں اور ساپاسا کے تین سُروں کے درمیان... تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے۔ آواز آکاش کا ایک گن ہے۔'' (ایضاً، ص62)

''تم کیسے فلسفی ہو جو الفاظ میں یقین نہیں رکھتے۔''

(ایضاً، ص72)

''علّیت کا قانون بجائے خود مکمل ہے۔'' (ایضاً، ص33)

''میں... میں تو پچھتاؤں کے دیس میں رہا ہوں

جہاں اتر کے نیلی آنکھوں والا سفید فام ولایتی شیو کی عبادت کرتے ہیں۔ میں نے اراوتی اور چندر بھاگ کی وادیوں کی سیر کی ہے۔ میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں۔ پورب میں دنگا تک گیا ہوں۔ میں نے برہم پتر اور سدر بن اور چندرادیپ کی دلدلوں میں جنگلی دھان اگتے دیکھے ہیں جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال کندھوں پر جھٹکائے مرگ نینی لڑکیاں ہرے بانس کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور پریوں کی طرح گاتی رہتی ہیں۔(ایضاً،ص 43)

''اپنشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزادی میں پیدا ہوئی، آزادی میں موجود رہتی ہے اور آزادی میں سمو جاتی ہے۔''(ایضاً،ص 63)

''برہمچاریہ کی زندگی بسر کرکے لڑکیاں پھر اکثر اعلی تعلیم حاصل کرتیں۔رگ وید کی کئی نظمیں اور راہبات کے نغمے لڑکیوں نے لکھے تھے۔شاعرہ اپالا کی نظمیں گوتم نے پڑھی تھیں۔''(ایضاً،ص 83)

''سبھی طالب علم اسی طرح گرو کے طابع تھے۔ بعض بعض مرتبہ گرو کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے۔ بھیک مانگ کر سب سے پہلے گرو کو لاکر دیتے اور اکثر خود بھوکے رہ جاتے۔طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات اور نسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور رہے۔''(ایضاً،ص 93)

ناول نگار قرۃ العین حیدر کو ہندوستانی اساطیر کے بیان میں کافی مہارت حاصل ہے۔ساتھ میں ہی وہ اردو ناول نگاری کی روایت میں ایک ایسا مقام رکھتی ہیں جن کو ہندوستانی سائیکی کی جڑیں ماضی بعید کے کھنڈروں میں پیوست نظر آتی ہیں۔ یہ درست بھی ہے کہ آج بھی ہندوستانی سماج،اس میں بسنے والے لوگ،ان کے سوچنے کا انداز اور ان کے روزمرہ کے عادات واطوار بھی اُسی ماضی میں پیوست ہیں جن کو ناول نگار نے اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں بڑی محنت اور جاں فشانی سے صفحۂ قرطاس پر ناول کے روپ میں بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔مندرجہ ذیل اقوال سے ہمیں جہاں قدیم ہندوستان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے؛ وہیں ناول نگار کی ریاضت، وسیع مطالعہ اور تاریخ وجغرافیہ پر دسترس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ملاحظہ ہو:

''مہابھارت اور منو دونوں کے نزدیک حکومت کا سخت گیر ہونا لازمی تھا کیونکہ انسان فطرتاً بد تھا۔عوام کا فرض تھا کہ وہ اپنے ورن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں۔''(ایضاً،ص 64)

''مگدھ میں ان دنوں میں نندوں کی حکومت تھی جو خدائے دولت کبیر سے بھی زیادہ امیر تھے۔''(ایضاً،ص 15)

''زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسواں مہاویر جو ویشالی کے کنڈ گرام میں پیدا ہوا اہنسا کی تلقین کرتا سارے دیش میں گھما___اور پھر دوروناگا کے گھنے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔کپلا وستی کے لمبنی گرام میں پیدا ہونے والا سدھارتھ جو گریوج کی سبز پہاڑیوں پر چلا۔نرنجن ندی میں نہایا۔پیپل کے درخت کے سائے میں جسے گیان حاصل ہوا۔شراوستی اور کاشی کے باغوں میں، جہاں ہرن کلیلیں بھرتے تھے،اس نے وعظ کہے اور جو کوسی نگر میں مرا۔''(ایضاً،ص 25)

''جنگ عظیم آج سے سیکڑوں برس قبل کورو کشیتر میں لڑی گئی تھی اور ہستنا پور کے ان بہادروں کے قصے، جنہوں نے دروپدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندر پرستھ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا، گانے والے وینا اور مردنگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے۔''

(ایضاً،ص 95)

قرۃ العین حیدر کو اپنے ماضی سے بہت لگاؤ تھا اور انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی تہذیب کو عمدہ طریقے سے پیش بھی کیا ہے۔ان کے ناولوں کے اسالیب اور لفظوں کا انتخاب بھی اس بات کے شاہد ہیں۔ وہ خود لکھتی ہیں کہ:

I am intensly intrested in my past.

''میرا ذاتی ماضی نہیں یا صرف میرے خاندان کا ماضی نہیں بلکہ مجھے پورے ماضی سے دلچسپی ہے۔ میں تاریخ میں، ماضی میں Involve ہوں بہت زیادہ اگر مجھے موقع ملے تو میں موہن جوداڑو کے بارے میں لکھوں۔''

I wouldlike to go back and back and back.

ناول 'آگ کا دریا' میں بہت ساری جنگوں کا باقاعدہ ذکر ہوا۔ یہ جنگیں سرسری انداز میں بیان نہیں ہوئی ہیں بلکہ ایک مکمل تاریخ کے طور پر بیان ہوئی ہیں لیکن ان سے قطع نظر ہمیں یہاں صرف ایسے واقعات سے غرض ہے جو موجودہ ہندوستانی سائیکی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

بقول شمیم حنفی:

''قرۃ العین حیدر نے کم وبیش ان تمام تہذیبوں کو ایک نئی استعاراتی جہت دی ہے جو تاریخ کے مختلف زمانوں میں ابھریں اور ڈوبیں،مگر ڈوبنے کے بعد بھی وقت کی بساط پر ان کی آمدورفت کے نشانات دکھائی دیتے ہیں۔برصغیر ہندوپاک کی تاریخ کے حساب سے دیکھا جائے تو تقسیم کے پہلے کے پانچ ہزار برسوں سے لے کر بنگلہ دیش کے قیام تک اور ایک خاندان کے قصے سے لے کر ایک وسیع اور کثیر الجہات اجتماعی کلچر کے بناؤ اور بگاڑ تک قرۃ العین حیدر نے شخصی اور اجتماعی تاریخ کے تقریباً تمام اہم واقعات کو رجسٹر کیا ہے۔''

(ماہنامہ آجکل نئی دہلی،اگست 1990،جلد 49،شمارہ 1،ص 10)

اگر سیاسی طور پر دیکھا جائے تو قدیم ہندوستان میں بھی حکومتوں اور شہنشاہوں کے جاہ وجلال کے عکس دیکھنے کو ملتے ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ان کی جاہ وحشمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ناول آگ کا دریا میں ان حکومتوں کے آغاز اور انجام سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ناول کے شروعاتی دور میں ان بادشاہوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جن کے دست شفقت میں مختلف مکتب ہائے فکر کو اپنے خیالات کی ترویج واشاعت میں مدد ملتی ہے۔ناول کا پہلا حصہ جس کا تعلق قدیم ہندوستان سے ہے سیاسی طور پر اس کا آغاز ویدک تہذیب سے ہوتا ہے اور اختتام چندر گپت موریہ کے عہد میں ہوتا ہے۔اس دور کو شراوستی سے لے کر ایودھیا تک کے وسیع وعریض علاقے تک پھیلایا گیا ہے۔ناول نگار چونکہ قدیم ہندوستان کے ان پہلوؤں کو دکھانا چاہتی تھی جن کا تعلق مثبت پہلوؤں سے تھا۔ اس لیے اس نے تمام ان واقعات سے تہی دامنی اختیار کی جو کسی بھی قسم کے منفی اثرات کا باعث بن سکتے تھے۔

ناول 'آگ کا دریا' کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں لکھا گیا ایک ایسا ناول ہے جس کے پلاٹ کا پھیلاؤ صدیوں پر محیط ہے اور اردو کا کوئی دوسرا ناول اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔اس کے علاوہ جو بات نکل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ناول میں جہاں مختلف قسم کے سماج اور اس سماج میں رہنے والوں کی نمائندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس میں ایک بات ضرور ہے کہ ناول نگار نے کسانوں کے حالات وکوائف کی نمائندگی کرنے والا کوئی کردار نہیں خلق کیا جس کا احساس بار بار ہوتا ہے۔ چونکہ قدیم ہندوستان میں کھیتی کرنا اور جانور پالنا عوام کا اہم ترین پیشہ تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس کا عکس ناول میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا،لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔اس کے باوجود ناول 'آگ کا دریا' اردو ادب کا ایک ایسا شاہکار ناول ہے جس کی مثال اردو ادب کے علاوہ دنیا کی دوسری عظیم زبانوں میں بھی مشکل سے دیکھنے کو ملتی ہے۔

■

Mohd Amir
Research Scholar, Dept of Urdu
BHU,
Varanasi- 221005 (UP)
Mob.:9208147549

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 534، قیمت: 240 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر امیر حمزہ، مدرسہ محلّہ، نوادہ، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

اردو ادب کی بے مثال اور فاروقی صاحب کی یہ لازوال کتاب کی اشاعت اب تک کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب 1973 میں شائع ہوئی تھی، پھر پس نوشت کے ساتھ 1998 میں، اس کے بعد تیسری بار دیباچہ طبع سوم کے ساتھ 2005 میں کونسل سے شائع ہوئی اور اب کونسل سے یہ تیسری اور کل پانچویں اشاعت ہے۔ پہلی اشاعت سے لے کر پانچویں تک مضامین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ فاروقی صاحب جب پچیس برس کے بعد اس کتاب پر پس نوشت لکھتے ہیں تو اس میں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اس درمیان مزید مطالعہ اور جدید وقدیم نظریات سے واقفیت کے باوجود ''اس کتاب میں درج کردہ باتوں کو جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم واستقلال اور کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے بامعنی سمجھتا ہوں۔'' آج جب مزید پچیس برس بعد میرے مطالعے میں یہ کتاب آئی تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جو تنقیدی ونظریاتی معنویت اس کی پچاس برس پہلے تھی وہ آج بھی ہے۔ تو چلیں اس کے محتویات پر نظر ڈالتے ہیں۔

اس کتاب میں کل 23 مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'غبار کارواں' ہے جسے کتاب کا مقدمہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے بچپن سے لے کر تادمِ تحریر مضمون اپنے علمی ونظریاتی سفر کا عکس پیش کیا ہے جس میں انھوں نے برملا اقرار کیا ہے کہ ان کی تحریر میں توضیحی وتشریحی پن کا آنا بچپن میں ایک مشہور عالم دین کی کتب سے متاثر ہونا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا وہ مضمون ہے جس کے نام سے کتاب بھی موسوم ہے یعنی 'شعر، غیر شعر اور نثر' یہ اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے جو تقریباً 95 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ شعر ونثر کی شناخت پر کئی سوالات فرض کرتے ہیں اور ان پر تفصیل در تفصیل بحث کرتے چلے جاتے ہیں اور کئی صفحات کے بعد لکھتے ہیں'' میں وزن کو ہر قسم کے شعر کے لیے ضروری سمجھتا ہوں، چاہے اس میں شاعری ہو یا نہ ہو، لیکن شاعری کی پہلی پہچان یہ ہے کہ اس میں اجمال ہوتا ہے۔'' لفظ اجمال سے فاروقی صاحب نثری نظم کو بھی شاعری کے دائرے میں لے آتے ہیں اور نثر کی شناخت کی جانب بھی آگے بڑھتے ہیں۔ شاعری میں اول وزن آتا ہے پھر اجمال کو پیش کرتے ہیں، اس کے بعد جدلیاتی لفظ پھر شاعری کی تیسری اور آخری معروضی پہچان ابہام پر گفتگو کرتے ہیں اور ان سب کے مجموعے کو شاعری کی پہچان کے طور پر سامنے لاتے ہیں، اچھی اور خراب شاعری کے درمیان بھی یہی عناصر سامنے آتے ہیں اور نثر کی بھی شناخت انہی عناصر سے ہوتی ہے۔ الغرض فاروقی صاحب کا یہ مضمون تخلیقیت کی بنیادی تفہیم میں بہت ہی معاون ومددگار ثابت ہوتا ہے۔

دوسرا مضمون 'ادب کے غیر ادبی معیار' ہے۔ اس مضمون میں یہ بات کھل کر کہی گئی ہے کہ ادیب کے نظریہ زندگی، اخلاق، عادات واطوار سے اس کی تخلیقات کے معیار کو کبھی بھی جانچا اور پرکھا نہیں جا سکتا۔ اگلا مضمون 'علامت کی پہچان' ہے۔ اس میں فاروقی صاحب علامت کی جامع و مانع تعریف متعین کرنے نکل جاتے ہیں لیکن تعریف نامکمل ہی رہتی ہے اور علامت تشخیص وتمثیل کے درمیان کی چیز کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ مضمون مکمل طور پر بحث طلب ہے کیونکہ فاروقی صاحب لکھتے ہیں ''لیکن ادبی علامت نہ صرف فی نفسہٖ بامعنی اور خوبصورت ہوتی ہے بلکہ اس میں ایک انوکھی شدت اور قوت ہوتی ہے جو عام الفاظ میں مفقود ہوتی ہے۔'' جس کی تلاش ہر ادیب کو کرنی ہے کہ حقیقی علامت کیا ہوتی ہے اور کون سے الفاظ تمثیل کی سطح پر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ اگلا مضمون ہے ''صاحب ذوق قاری اور شعر کی سمجھ''۔ اس مضمون کے پہلے ہی جملہ ''کیا کوئی قاری صحیح معنی میں صاحب ذوق ہو سکتا ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔'' میں فاروقی صاحب نے جو دعویٰ کیا ہے اتفاق سے وہ آخر تک قائم رہتا ہے اور کئی زاویوں سے گفتگو کرنے کے بعد آخر میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صاحب ذوق کی کوئی معیار بندی ممکن نہیں۔ اب بڑھتے ہیں 'نظم اور غزل کا امتیاز' کی جانب۔ اس مضمون کو بھی فاروقی صاحب نے اسی انداز میں لکھا ہے کہ پہلے دونوں اصناف کے مابین 12 امتیازات قائم کرتے ہیں پھر ان امتیازات کو مثال سے باطل بھی کر دیتے ہیں۔ جب معاملہ حل ہونے

کا ہوتا ہے تب پھر سے امتیازی معروضات پر گفتگو کرتے ہیں۔ جب تمام زاویوں سے بات ہو جاتی ہے اور کوئی واضح فرق سامنے نہیں آتا تب جا کر فرماتے ہیں کہ'' ان سوالوں کا ایک جواب ہے: غزل بنیادی طور پر بالواسطہ اظہار کی شاعری ہے، غیر واقعیت کی شاعری ہے......غزل کی پہلی اور آخری پہچان اس کی داخلیت، غیر واقعیت اور بالواسطگی ہے۔'' اور نظم میں بھی ساری چیزیں ہوتی ہیں لیکن غزل کے مقابلے میں اس میں واقعیت کا دخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد 'مطالعہ اسلوب کا ایک سبق' ہے۔ اس عنوان میں ایک لفظ 'سبق' قاری کو چونکا دیتا ہے کہ اتنے بھاری بھر کم مضامین کے بیچ سبق جیسا مضمون فاروقی صاحب نے کیوں شامل کیا۔ اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں پتہ البتہ سودا اور میر کی ایک ایک غزل اور غالب کی دو غزلوں کے حوالے سے انھوں نے اسلوبیات کے وہ سبق سکھائے ہیں جو عموماً اسلوبیات کی کتابوں میں پڑھنے کو نہیں ملتا ہے۔ واقعی انھوں نے جن جزئیات کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے ان سے شعری اسالیب کے خطوط طے ہوتے ہیں اور قارئین کے لیے یہ مضمون سبق ہی ثابت ہوتا ہے۔

افسانے کی حمایت میں دو مضامین ہیں۔ پہلے مضمون میں وہ یہ مشاہدہ پیش کرتے ہیں کہ'' ناول کے مقابلے میں افسانے کی وہی حیثیت ہے جو ہمارے یہاں غزل کے مقابلے میں رباعی کی ہے'' اسی مشاہدے پر پورے مضمون کی بنیاد ہے۔ دوسرا مضمون انٹرویو کے انداز میں ہے جس میں افسانہ کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ 'آج کا مغربی ناول' (تصورات و نظریات) اگرچہ مغربی ناولوں کے حوالے سے لکھا گیا مضمون ہے لیکن اس میں فن ناول پر تعمیری گفتگو ملتی ہے۔ تبصرہ نگاری کے فن پر عموماً مضامین پڑھنے کو نہیں ملتے ایسے میں فاروقی صاحب کے اس مضمون کو بنیادی حیثیت حاصل ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ اس مضمون میں کئی نکات پر بحث کرتے ہوئے دو بنیادی پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اول اخلاقی پہلو، دوم تخلیقی پہلو، یعنی کتاب کے ماسوا سے مبصر کو کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہیے خواہ مصنف کی ذات ہو یا پھر مصنف کی ماقبل کی تصنیفات ہوں۔ اب تک کے مضامین اصناف پر تھے بعد کے مضامین جزئیات پر ہیں۔ ان مضامین کے عنوان جدید ادب کا تنہا آدمی، نئے معاشرے کے ویرانے میں، پانچ ہم عصر شاعر، ن م راشد صوت و معنی کی کشاکش، غالب اور جدید ذہن، اردو شاعری پر غالب کا اثر، غالب کی مشکل پسندی، غالب کی ایک غزل کا تجزیہ، برف اور سنگ مرمر، میر انیس کے مرثیے میں استعارہ کا نظام، ییٹس اور اقبال اور الیٹ یہ تمام مضامین شعری تنقید پر مشتمل ہیں، جنھیں شعریات کی بنیادی تنقید میں شمار کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ کتاب اردو تنقید کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

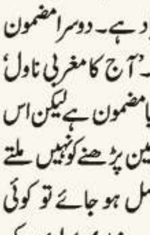

حالی کی نظمیں

مرتب: سید تقی عابدی

صفحات 262، قیمت: 160 روپے

ناشر: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: سہیل انجم، 370/6A، ذاکر نگر نئی دہلی۔ 110025

سید تقی عابدی عالمی شہرت یافتہ ادیب ہیں۔ متعدد کتب کے مصنف ہیں اور عہد حاضر کے ادیبوں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ مولانا حالی پر لوگوں نے لکھا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن 'حالی کی نظمیں' کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ ان پر ابھی اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جانا چاہیے۔ عام طور پر مولانا حالی کی حیات و خدمات پر گفتگو میں زیادہ تر سرسید اور مرزا غالب کی سوانح علی الترتیب حیات جاوید اور یادگار غالب یا پھر حیات سعدی پر اور پھر ان کی نظموں پر خاص طور پر مسدس مدو جزر اسلام پر گفتگو ہوتی ہے۔ لیکن حالی کا کام اس کے علاوہ بھی ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی انھوں نے کافی کام کیا ہے۔ یہ کتاب یوں تو مولانا حالی کی نظموں پر مشتمل ہے لیکن اس میں جو چند مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ قابل مطالعہ ہیں۔ ان میں دیباچہ مجموعۂ نظم حالی، دیباچہ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی اور 'حالی کی کہانی حالی کی زبانی' خود حالی کے تحریر کردہ ہیں۔ آخر الذکر مضمون انتہائی دلچسپ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے شب و روز کو اختصار کے ساتھ لکھا ہے لیکن اس مختصر مضمون میں بھی بہت سی ایسی باتیں آگئی ہیں جن سے ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور اس کے ساتھ ہی ان کی فکر میں آنے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی انتہائی کسمپرسی میں گزری تھی۔ لیکن چونکہ ان کو تعلیم کے حصول کا شوق تھا اس لیے وہ پانی پت سے پیدل دہلی چلے آئے۔ حالانکہ اس وقت ان کی شادی ہو گئی تھی لیکن انھوں نے اہلیہ کی پروا کیے بغیر یہ قدم اٹھایا تھا۔ سید تقی عابدی کا خیال ہے کہ چونکہ انھوں نے اس قدم سے ایک طرح سے اہلیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تا زندگی اپنی اہلیہ کی تعریف کرتے رہے۔ سید تقی عابدی نے مولانا حالی کی حیات و خدمات پر ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے اس بارے میں خاصی محنت کی ہے اور صالحہ عابد حسین اور دیگر مصنفوں کی کتب سے استفادہ کر کے اسے مکمل کیا ہے۔ کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حالی کا شجرۂ نسب دادھیال کی طرف سے بیالیسویں پشت میں صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری سے اور ننھیال کی طرف سے چھتیسویں پشت میں حضور اکرمؐ سے جا ملتا ہے۔ حالی حنفی المسلک سنی جبکہ ان کی اہلیہ شیعہ تھیں۔ لیکن دونوں کے درمیان کبھی کوئی مسلکی تنازع پیدا نہیں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حالی بہت ہی شریف اور نیک نفس انسان تھے اور اہل بیت سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ اس مضمون میں ان کی زندگی کے بارے میں بڑی اہم معلومات شامل کی گئی ہیں۔

مولانا حالی غالب کے بڑے عقیدت مند تھے جس کا ثبوت 'یادگار غالب' ہے۔ جب پہلی بار غالب سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنی ایک غزل غالب کو دکھائی تو غالب نے کہا کہ وہ فکر شعر کے لیے کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے لیکن اگر تم نے شاعری نہیں کی تو اپنے اوپر ظلم کرو گے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے زیادہ مشق سخن نہیں کی۔ البتہ کبھی کبھار کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ اس وقت تک غزلیں ہی زیادہ کہی جاتی تھیں۔ لیکن جب سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی اور سرسید نے ان کی توجہ موضوعاتی شاعری کی طرف مبذول کرائی اور یہ بھی کہا کہ اس وقت ملت کا جو حال ہے اس کو نظم کرنے اور اسے اپنے حالات سدھارنے کے لیے زور دینے کی ضرورت ہے تو حالی نے موضوعاتی شاعری شروع کر دی۔ مسدس حالی اسی جذبے کی دین ہے جس کے بارے میں سرسید نے کہا تھا کہ میں قیامت میں اللہ تعالیٰ سے کہوں گا کہ میں حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔ حالی کی شاعری پر نواب مصطفیٰ علی خاں شیفتہ (جہانگیر آباد) کی فکر کا بھی اثر ہے۔ ان کے ساتھ وہ کئی سال رہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری میں وہ غالب سے کم شیفتہ سے زیادہ متاثر رہے۔ زیر نظر کتاب سے یہی تاثر ملتا ہے۔

مولانا حالی کی نظموں کو پانچ ابواب میں تقسیم کر کے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ہیں: اخلاقی درسی و مناظراتی نظمیں، حقوق زناں اور ہمدردی نسواں کی نظمیں، تعلیمی اور اصلاحی نظمیں، بچوں کی نظمیں اور تراجم۔ کتاب میں مولانا حالی کی اخلاقی درسی و مناظراتی نظموں پر ایک مضمون اور ایک مضمون بچوں کی نظموں پر ہے۔ اس کے علاوہ تراجم کے ضمن میں نظم 'زمزمۂ قیصری' کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہر باب

کے شروع میں ایک مضمون شامل کر دیا جاتا، لیکن اس کمی کے باوجود کتاب کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں مولانا کی وہ تمام نظمیں تو شامل ہیں ہی جو مشہور ہیں، جو مشہور نہیں ہیں وہ بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے مولانا حالی کی نظموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہت اہم مواد اکٹھا ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب انتہائی شاندار ہے اور جہاں سید تقی عابدی اس کو ترتیب دینے کے لیے قابل مبارکباد ہیں وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس کی اشاعت کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔

تاریخ ابن خلدون (جلد سوم)

مرتب: محمد صہیب

صفحات: 435، قیمت: 215 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مطبع: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: اطہر حسین، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

504/122 شباب مارکیٹ ندوہ روڈ ڈالی گنج لکھنؤ 226020

عبدالرحمٰن ابن خلدون کا شمار دنیا کے چند عظیم مورخوں، سیاسی مفکروں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ پہلے تاریخ داں ہیں جنھوں نے تاریخ کو سائنس کے طور پر دیکھا پرکھا اور نتائج کو اخذ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خدمات کو مغربی مفکرین نے بھی سراہا ہے۔ ان کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں۔ وہ صرف تاریخ، معاشیات، سیاست، فلسفہ اور عمرانیات کے ماہر ہی نہیں بلکہ تاریخ اور عمرانیات کے موجد، امام و پیشرو بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے سیاست، معیشت، عمرانیات اور اقتصادیات کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے وہ آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

ابن خلدون کا تعلق تونس سے تھا۔ انھوں نے کم عمری میں ہی قرآن حفظ کیا اور نصابی کتب کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ جس کے بعد فقہ و فلسفہ اور دیگر کئی علوم کی تعلیم ماہر اساتذہ سے حاصل کی۔ جب وہ محض 17 سال کے تھے طاعون کی بیماری پھیلنے کی وجہ سے ان کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد انھوں نے والی تونس کے یہاں کاتب کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی، البتہ ملازمت پسند نہ آنے کی وجہ سے بہت جلد کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مراکش جا کر امیر اسرار کے عہدے پر فائز ہوئے، جہاں انھیں سازش کا شکار بنا کر 22 ماہ تک محبوس رکھا گیا۔ مراکش میں ابو سالم کی حکومت کے قیام کے بعد انھیں وزارت کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ مراکش سے نکل کر وہ اندلس پہنچے جہاں ان کی خوب قدردانی ہوئی۔ ابن خلدون نے متعدد ممالک کا سفر کیا اور مختلف ملازمتوں کے بعد جامعہ ازہر مصر میں بحیثیت معلم خدمات انجام دیں۔ فقہ مالکی کے قاضی بھی ایک مدت تک رہے۔ ان کی زندگی مشکلات سے بھری تھی۔ انھیں اس قدر اتھل پتھل کا زمانہ ملا تھا کہ سکون و دلجمعی کے ساتھ اتنا بڑا کام انجام دینا ناممکن تھا۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان کی زندگی اس قدر پریشانیوں سے گزری نہ ہوتی تو ایک وقت ایسا ضرور آتا جب وہ کسی ملک کے حاکم ہوتے۔

ابن خلدون کو مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے متعدد کتابیں تحریر کیں۔ تاریخ اسلام پر کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر فی أیام العرب والعجم' کے نام سے ایک مستند کتاب لکھی ہے۔ جس میں پوری اسلامی تاریخ کو صداقت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ اسلامی تاریخی کی بہت مستند کتاب تصور کی جاتی ہے۔ جس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں صرف اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ مختلف علوم کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ فلسفہ، تاریخ، سیاست، اقتصادیات، قانون جیسے اہم مباحث پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ کی ابتدا میں ایک ضخیم مقدمہ ہے جو دو جلدوں اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اسی مقدمہ کو اردو میں مقدمہ ابن خلدون کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تاریخ سے زیادہ اس مقدمہ کو شہرت ملی۔ مقدمہ میں نہ صرف یہ کہ کتاب کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے بلکہ ان اصول و ضوابط کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کے مطابق تاریخی حقائق کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مقدمہ میں معاشیات، سیاست، عمرانیات اور کئی دیگر علوم پر دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔

ابن خلدون کی مذکورہ تاریخ کا متعدد زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی نے اس کتاب کا اردو میں 'تاریخ ابن خلدون' کے نام سے چودہ جلدوں میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کے حوالے سے یہ ایک اہم کام ہے۔ حکیم صاحب نے نہ صرف اس کا ترجمہ کیا ہے بلکہ بعض واقعات کے ترجمے میں اصل متن سے زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے۔ واضح رہے کہ انھوں نے ابن قیم، ابن ہشام اور ابن اثیر وغیرہ کی کتابوں سے خوب مدد لی ہے۔

تاریخ ابن خلدون کی ترتیب و تزئین کا کام محمد صہیب نے کیا ہے۔ واضح رہے کہ تاریخ ابن خلدون کی پہلی اور دوسری جلد محمد صہیب کے مفید حواشی کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ ابتدائی دو جلدوں میں انھوں نے نہ صرف تاریخ کی ترتیب و تصحیح کا کام کیا ہے بلکہ عبدالرحمٰن ابن خلدون کے سوانحی حالات اور علمی کمالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مترجم حکیم احمد حسین عثمانی الہ آباد کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے طریقہ تدوین و ترتیب کی بھی وضاحت کی ہے۔ واضح رہے کہ محمد صہیب نے مطبوعہ متن کی ترتیب کے ساتھ ساتھ نقائص و اغلاط کی تصحیح، متعدد عبارتوں کا ترجمہ و حسب ضرورت تحشیہ اور بعض اعلام و سنین اور اعداد کی عربی نسخوں سے تصحیح کا بھی کام کیا ہے۔ متعدد جگہوں پر مدون کی وضاحتی تحریر واقعات کو سمجھنے میں کافی مدد کرتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'تاریخ ابن خلدون' (جلد سوم) زمانہ جاہلیت سے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلام سے قبل عرب کے حالات، خاتم النبیین محمدؐ کی ولادت، نبوت، ہجرت، غزوات، فتوحات اور وفات کو مستند حوالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ جلد تیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'حالات عرب قبل از اسلام' کے عنوان سے ہے۔ جس میں واقعہ ذی قار، حلف الفضول، ادیان عرب قبل از اسلام اور نبی کریمؐ کے ظہور کی پیشین گوئی کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ دوسرے باب میں اللہ کے رسولؐ کی ولادت، والد، والدہ، دادا کا انتقال، رضاعت، چچا کی کفالت، بچپن کے حالات، شق صدر، حضرت خدیجہؓ سے عقد، تعمیر کعبہ اور امین کا لقب جیسے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب میں نماز کی فرضیت اور واقعہ معراج کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھا اور پانچواں باب قریش اور مدینہ منورہ میں اسلام کے عنوان سے ہے جبکہ چھٹے باب میں مدینہ کی طرف ہجرت اور اس دوران پیش آنے والی مشکلات اور دیگر کئی واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ابواب میں غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق، غزوہ خیبر، غزوہ موتہ، غزوہ حنین، غزوہ تبوک، اور فتح مکہ کے واقعات کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے۔ حجۃ الوداع، وفات رسول اللہؐ اور ان کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں آپؐ کے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات، فتوحات اور سیرت کو بڑی تفصیل و توضیح سے بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ اس میں اسلام کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے بلکہ تاریخ اور تحقیق کا لازوال کارنامہ بھی ہے۔ عالمی اور علاقائی زبانوں کے علمی و ادبی متون کے تراجم کی اشاعت پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خصوصی توجہ رہی ہے تاریخ ابن خلدون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے ابن خلدون کی تاریخ کی طرح اس کے تراجم و تدوین کی بھی علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔

تراجم

منبع فیض وکرم (حمدیہ کلام در مدحِ شوِشنکر)

سنسکرت زبان سے اُردو ترجمہ
مصنف: زاہد ابرول
صفحات: 112، قیمت: 290 روپے، سنہ اشاعت 2022
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: بلوندر سنگھ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو بنارس، ہندو یونیورسٹی، وارانسی

ادبیاتِ عالم میں ترجمہ تاریخی ادوار اور لسانی تمدن کی شناخت و بازیافت کا واحد ذریعہ رہا ہے۔ ادبی دُنیا میں 'ترجمہ' اور 'طبع زاد' دو اصطلاحیں رائج ہیں اور دونوں کو ایک دوسری کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ ترجمہ چونکہ دوسری زبان سے ماخوذ یا مستعار ہے اِس لیے اِس میں بڑی حد تک غیریت کا احساس ہوتا ہے۔ اِسی غیریت کے سبب 'طبع زاد' کو 'ترجمہ' پر فوقیت حاصل ہے۔ دوسرے فنون کی طرح ترجمہ نگاری بھی ایک فن ہے اور ادب میں اِس کی حیثیت مسلم ہے۔ ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس سے ہمیں دوسری زبانوں کے علم و فنون کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اِس کے بغیر کوئی بھی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی نیز ترجمے کی وساطت سے ہی ایک قوم کے ذخیرۂ علم و ادب، تہذیب و ثقافت سے روشناسی ہوتی رہی ہے۔

اُردو زبان کی بڑی خوش نصیبی یہ رہی ہے کہ ہر مذہب و ملت نے اپنی جگر کاوی سے اِس کی آبیاری کی ہے۔ آج بھی نامور شخصیات ادبیاتِ عالم میں اپنی تخلیقات کے ذریعے اُردو زبان کو نہ صرف سر سبز و شاداب کر رہی ہیں بلکہ اس کی ترقی اور فروغ میں مسلسل اپنی جاں فشانی کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ ایسی نامور ہستیوں میں زاہد ابرول کا شمار ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر کے مقبول شاعر اور ریاست ہماچل پردیش سے تعلق رکھنے والے زاہد ابرول نے اپنی تخلیقات سے ادبی دُنیا میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ زاہد ابرول صاحب کا تعلیمی تعلق شعبۂ سائنس سے تھا۔ فزکس (Physics) میں M.Sc.(Hons) ہیں اور پنجاب نیشنل بینک سے سینئر منیجر کے عہدے سے سبک دوش ہو کر اُردو ادب کی خدمت کو انجام دے رہے ہیں اور ہماچل پردیش سے ایک معتبر سرکاری ادبی رسالہ 'جدید فکر و فن' کے مدیر بھی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'منبعِ فیض وکرم' کا منظوم ترجمہ براہِ راست سنسکرت سے اُردو زبان میں کیا گیا ہے۔ کتاب میں رگ وید، یجور وید، لنکا پتی راون، مہارشی وششٹ، مہارشی مارکنڈے، آدی شنکر اچاریہ، گوسوامی تلسی داس جیسے موضوعات قلم بند کیے ہیں۔ نثر کا نثر میں ترجمہ کرنا دوسرے تراجم کی بہ نسبت آسان ہوتا ہے۔ مشکل ترین کام شاعری کا شاعری میں ترجمہ کرنا، یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب ہم سنسکرت جیسی ثقیل زبان کے اشلوکوں کو اُردو زبان کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ زاہد ابرول خود بھی شاعر ہیں اور شعری اظہار کی نزاکتوں اور باریک بینی سے بخوبی واقف ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 'منبعِ فیض وکرم' سے پہلے موصوف نے بابا فرید کے پنجابی اشلوکوں کو اُردو قلب میں ڈھالا ہے۔

ترجمے کا آغاز 'ناسدیہ سُوکت' نامی عنوان سے ہوتا ہے۔ ناسدیہ سُوکت رگ وید کے 10 ویں منڈل کا 129 واں سُوکت ہے جس میں کائنات کے تخلیق کار ایشور یعنی خداوند تعالیٰ، جو کُل کائنات کا مالک ہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مُترجم نے بڑی عرق ریزی اور قادر الکلامی سے ترجمے کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر پہلا منتر ملاحظہ کیجیے:

ہوا، فلک، نور، کچھ نہیں تھا، فقط اندھیرا تھا، اِک خلا تھا
نہ کوئی عالم، نہ کوئی پردہ، نہ کچھ تھا ظاہر، نہ کچھ ڈھکا تھا
بنی ہے یہ کائنات کیسے، یہ کب ہوا تھا، یہ کون جانے؟
کہ سب تو بننے کے بعد آئے ہیں پہلے کیا تھا یہ کون جانے؟ (منبعِ فیض وکرم، ص 29)

اِس ترجمے کی ایک خوبی یہ ہے کہ مترجم نے شروع میں ہر مضمون کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے جس سے قاری کو مضمون تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے دوسری خوبی اِس میں دونوں زبانیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ پہلے سنسکرت میں اشلوک درج ہیں اور بعد میں اُن کا اُردو میں ترجمہ۔

زاہد ابرول نے اِس مجموعے میں ہرنیہ گربھ سُوکت، شِوَ سنکلپ سُوکت، مہا امرتیو نجے منتر اور قدیم زمانے کے رِشیوں کے علاوہ عہدِ وسطیٰ کے آدی شنکر اچاریہ اور تلسی داس کے حمدیہ کلام کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ترجمہ بے حد پُر اثر اور بے مثال ہے۔ فطری بے ساختگی زاہد ابرول کے تراجم کی جان ہے۔ مثال کے طور پر 'ہرنیہ گربھ سُوکت' رِگ وید میں پہلی بار اِس لفظ کا ذکر ہوا تھا اور اِس کی نسبت برہما اور اُس کی تخلیق (کل کائنات) سے بتائی ہے۔ اشلوک نمبر 7 اور 8 ملاحظہ کیجیے:

اشلوک 5: جب آب ہی آب تھا جہاں میں کیے حیات اور آگ پیدا
طلائی بیضہ سے جس کی نسبت کریں ہون سے ہم اس کی پوجا
اشلوک 8: جو برہما اور یگیہ کا ہے خالق کیا قیامت کا آب پیدا
جو دیوتاؤں کا بھی خدا ہے کریں ہون سے ہم اس کی پوجا

اِس کتاب میں جتنے اشلوک ہیں، قریب قریب سب میں مختلف کیفیاتِ قلب کے ساتھ نوعِ انسان اور ذاتِ باری کے باہمی تعلقات کا اظہار ہے۔ بعض جگہ ایسے لطیف استعارات و بلیغ کنایات سے کام لیا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔

زاہد ابرول اُردو زبان کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور انگریزی میں بھی اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اِس لیے بھی زیادہ ہے کہ اِس مادّی دور میں ایسے روحانی، علمی اور تحقیقی کام بہت کم ہو رہے ہیں۔ ایسے کاموں سے ایک طرف اُردو ادب سے جڑے لوگوں کو ہندو دیو مالائی فکر و فلسفہ سے واقفیت ہوگی اور دوسری طرف سیکولر کردار مضبوط ہوگا، ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ منبعِ فیض وکرم زاہد ابرول کی ادبی فتوحات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی اس ادبی کاوش کو اُردو حلقوں میں سراہا جائے گا۔

صادق کے ہندی مضامین

ترجمہ نگار: ابراہیم افسر
صفحات: 160 قیمت: 300 سنہ اشاعت: 2022
رابطہ: وارڈ نمبر 1 مہپا چوراہا، نگر پنچایت سِوال خاص، میرٹھ یوپی
مبصر: حبیب سیفی، فرسٹ فلور E1251B حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی 17

ترجمہ نگاری کبھی بھی سہل اور آسان عمل نہیں رہی۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو یہ ایک دشوار گزار عمل ہے، جس کے لیے مترجم کو متعدد اور مختلف النوع لیاقتوں اور مہارتوں سے متصف ہونا پڑتا ہے۔ جو لوگ ترجمہ نگاری کو علمی مقاصد میں شمار نہیں کرتے وہ ترجمے کی اہمیت اور اس کی حقیقت دونوں سے ناواقف ہیں۔ سچ یہ ہے کہ بے کار قسم کی کتابیں لکھنے کے مقابلے میں کارآمد کتابوں کے ترجمے کرنا علمیت کی دلیل اور زبان و ادب کی زیادہ بڑی خدمت ہے۔

میں سمجھتا ہوں ترجمہ کے عمل سے عہدہ برآ کے لیے ضروری ہے کہ مترجم منقول منہ یعنی اصل زبان اور منقول الیہ یعنی مقصود زبان دونوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس کے پاس دونوں زبانوں کے الفاظ کے ذخیرے ہوں۔ وہ دونوں زبانوں کی اصطلاحات، تعبیرات، محاورات، اور تراکیب سے اچھی طرح واقف ہو۔ دونوں زبانوں کے نحوی، صرفی، قاعدوں پر خاطر خواہ دسترس رکھتا ہو۔ جن علوم سے متعلق نصوص کا ترجمہ کر رہا ہے، ان کے پس منظر، مسائل، اور اصطلاحات سے واقفیت بھی مترجم کے لیے ناگزیر ہے۔

مضامین کی فہرست کے مطابق 1 ہندی اور اردو کے رشتے، 2 چراغ دیر 3 اردو میں پریم چند کی روایت، 4 قرۃ العین حیدر کی کہانیاں، 5 اختر الایمان کے تخلیقی سروکار، 6 چاند کا منھ ٹیڑھا ہے: کچھ باتیں، 7 سردار کہاں ہے محفل میں، 8 جُگ جُگ جیوے میرا مرشد سونا، 9 نریندر موہن کی طویل نظمیں، 10 چندر کانت پاٹل کی ادبی خدمات، 11 بال سوروپ راہی کی غزلیں، 12 باتیں اس کی یاد آتی ہیں، 13 میں اور میرا ہم زاد، 14 منٹو کی کتاب: جنازے، 15 نئی اردو شاعری کا پس منظر: ایک تجزیہ، 16 گُل دیپ سلیل کی غزلیں، 17 انٹرویو (دیوندر کمار بہل) 18 انٹرویو آ(ششی کانت) شامل ہے۔ یہ وہ مضامین ہیں جن کا ترجمہ ہندی سے اردو میں ابراہیم افسر نے کیا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصل تخلیق ہے ترجمہ نہیں۔

یاد رکھیے کسی بھی زبان کا ادب زندگی کا نہیں ایک مکمل تہذیب کا ترجمان کہلاتا ہے۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ ترجمہ کا کام آسان نہیں۔ آسان اور سلیس زبان میں کسی بھی صنف کا ترجمہ کرنا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ مشکل مرحلے سے گزرنے کا عمل ترجمہ نگاری کے زمرے میں اس لیے بھی آتا ہے کہ معاشرت کے بطن سے تہذیبی قدریں جنم لیتی ہیں، مترجم مصنف سے کس قدر قریب اور اس ماحول کو کتنا سمجھتا ہے، کس قدر قبول کرتا ہے، اور کس قدر تہذیبی قدروں کا محافظ بن پاتا ہے یہ اس کی ذہانت پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی بھی صنفی تخلیق کے کامیاب ترجمے کے لیے مترجم کا اصل متن اور ترجمہ کے طور پر اختیار کی جانے والی زبان، دونوں پر دسترس کا ہونا ضروری ہے۔

زبیر شاداب ایسوسی ایٹ پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بیک کور پر دی گئی رائے تعارفی تبصرے میں اس نیت کے ساتھ شامل کرتا ہوں کہ قارئین ابراہیم افسر اور صادق کے ہندی مضامین کتاب کے مطالعہ کے لیے راضی ہوں۔ زبیر شاداب کی زبانی 'ڈاکٹر ابراہم افسر اپنے عہد کے نمائندہ محقق ومصنف کی حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ سردست انھوں نے پروفیسر صادق کے ہندی مضامین کا اردو میں سلیس اور رواں ترجمہ کیا ہے۔ بہ یک وقت اردو، ہندی میں لکھنا نہ صرف یہ کہ وقت کی ضرورت ہے بلکہ دو قریب ترین زبانوں کی قدرے مختلف تہذیبی و تخلیقی رویوں کو سمجھنے کا سیلہ بھی ہے۔ اقتباس مکمل۔

زبانوں کے ابتدائی دَور سے عصر حاضر تک دنیا میں علوم وفنون کی ترقی کا ذریعۂ واحد ترجمہ نگاری ہے۔ ترجمہ کی ترویج واشاعت کے عمل نے ہی غیر اردو زبانوں کے ادب سے ہمیں واقف کرایا ہے۔ اردو زبان کے ادب کو غیر اردو زبانوں میں منتقل کرنے سے دنیا میں آج اردو کا بول بالا ہے، اس کام میں سائنس وٹیکنالوجی نے بھی غیر معمولی کردار ادا کیا ہے، ابراہیم افسر چونکہ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والے ادیب ہیں، ان میں علمی حرص بہت زیادہ ہے، اسی لیے اردو زبان کی داخلی اور خارجی سطح کا جائزہ لے کر معاشرہ میں رائج اردو لفظیات اور مروج گفتگو کا لہجہ نیز اسلوب کے ساتھ زبان صاف ستھری، فقروں جملوں سے جو ترجمہ میں روانی وسلاست پیدا کی ہے اس کی بات ہی الگ ہے۔ اس قدر شاندار ترجمہ کیا ہے کہ کہیں سے لگتا ہی نہیں کہ یہ ترجمہ ہے، بلکہ اصل تخلیق کا شائبہ ہوتا ہے'۔

فکشن

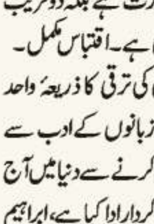

تعاقب زرد موسم کا

مصنف: راجیو پرکاش ساحر

صفحات: 375، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: میٹرلنک پبلشرز لکھنؤ

مبصر: ڈاکٹر جاں نثار عالم، شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

آج کا افسانہ نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ افسانے کی اس نئی دنیا میں نئے مناظر، نئے فلسفے، نئے تجربات اور نئے حقائق پوری آب و تاب سے نمایاں ہیں۔ جہاں اس دور میں اردو افسانہ نگاروں کے لیے نئے نئے موضوعات کی بہتات ہے وہیں دوسری جانب انھوں نے ترقی یافتہ دنیا میں بھوک، افلاس، آلودگی، دہشت گردی، پرانی قدروں کا بحران، نئی تہذیب اور مصنوعی کلچر کی رنگارنگی، مذہبی اور مسلکی تعصب، بے روزگاری، ذہنی تصادم، سماجی اور سیاسی استحصال کو بھی اپنے افسانوں میں بخوبی جگہ دی ہے۔ اسی سلسلے میں دور جدید کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار راجیو پرکاش گرگ ساحر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ 'تعاقب زرد موسم کا' راجیو پرکاش ساحر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے اس مجموعے میں کل 43 افسانے شامل ہیں جس میں خلائی موسیقی، تشنہ لبی، منیا، سرسوتی، مہابھارت، تم اپنی کرنی کر گزرو، عطر فروش اور گونگے سر قابل ذکر ہیں۔

لکھنؤ کی ادبی دنیا میں بحیثیت شاعر راجیو پرکاش ساحر اپنے پہلے شعری مجموعہ 'تعارف' (2014) کے ذریعہ متعارف ہوئے لیکن جلد ہی انھیں اپنے ذہنی میلان اور رجحان کا احساس ہوگیا کہ ان کا ذہن کہانی اور افسانہ کے لیے زیادہ موزوں ہے اور اب انھوں نے شاعری سے کہانی کی طرف مراجعت کی۔ 2015 میں 'ایک بھیگے لمحے کی لمبی سڑک' (افسانوی مجموعہ) سے لے کر 2023 میں 'تعاقب زرد موسم کا' تک آتے آتے راجیو پرکاش ساحر نے افسانوی دنیا میں کئی مدارج طے کیے۔

راجیو پرکاش ساحر کا مطالعہ کافی وسیع ہے جس کا اندازہ ان کے افسانوں کی موضوعاتی رنگارنگی اور تنوع سے کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں معاشرے کے دکھ درد کی ترجمانی کے ساتھ ہی فرد کے کرب کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ راجیو پرکاش ساحر نے زندگی کے مختلف حقائق کو داخلی کشاکش سے مزین کر کے خوشگوار انداز میں قارئین کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے تخلیقی شعور، ذہنی کشادگی اور قلمی دانائی سے قارئین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کرۂ ارض ہی نہیں بلکہ خلاؤں اور کہکشاؤں کی ایک دنیا آباد ہے۔ جس کی بہترین مثال مجموعے میں شامل افسانہ ''خلائی موسیقی'' ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک منفرد موضوع ہے جسے انھوں نے صفحہ قرطاس پر اتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس میں ایلینس کی تلاش وجستجو کے ساتھ ایک خلاباز کی نفسیات کو موزوں الفاظ واسلوب اور پرکشش انداز کے ذریعہ تجسس (Suspense) کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف پیرائے میں سامنے رکھا ہے۔ اس افسانے میں جہاں ہمیں بیک وقت جمالیاتی، رومانوی اور نفسیاتی پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں عشق ومحبت کی حرارت اور مقناطیسی جذبات کے ساتھ ساتھ جاگتی آنکھوں کے خوابوں کی تعبیر بھی نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں ہمیں دو تہذیبوں کا ملن اور پھر ان کا علاحدہ ہونا انتہائی جذباتی انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں دو تہذیبوں کی نمائندگی کرنے والے دونوں کرداروں کے سامنے اپنی محبت سے بالاتر کچھ عظیم ترین مقاصد بھی تھے جیسا کہ افسانے میں راجیو پرکاش ساحر رقم طراز ہیں:

''تمھیں آسمان کی توقع ہوسکتی ہے مجھے تو اپنی زمین کا قرض ادا کرنا ہے مجھے واپس جانا ہی ہوگا۔'' (تعاقب زرد موسم کا، مشمولہ 'خلائی موسیقی' میٹرلنک پبلشرز لکھنؤ 2023، ص 16-15)

خلاباز کی محبوبہ کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ جہاں اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی رہنمائی کرتے ہیں وہیں جدائی کے کرب کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں کہکشاں کی عظیم الشان نزہت گاہ میں ابھرتی ہوئی موسیقی اور اس موسیقی سے خلاباز کی انسیت اور اس سے بغاوت نہ کرنے کا جذبہ بھی پوری آب وتاب کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے جو شاید اس دیوانے خلاباز کے ساتھ ساتھ آسمان میں کہکشاں کے درمیان رقص کرتا ہوا، چاندنی سے کھیلتا ہوا، موسیقی کا تعاقب کرتا ہوا اپنی محبوبہ کے تصور میں غرق جنت کے تحفظ کے لیے شہید ہوکر کہیں تحلیل ہوگیا۔

راجیو پرکاش ساحر کا یہ کمال فن ہے کہ انھوں نے اس افسانے کے ذریعہ ہمیں

زمین سے اوپر آسمانوں میں آباد ایک نادیدہ جہان کی سیر کرائی ہے اور وہاں کے رہائشی ایلینس کے وجود سے بھی متعارف کروایا اور ان کی صدایا ان کے پیغام کو ایک موسیقی سے تعبیر کر کے اسے خلائی موسیقی کا نام دیا۔

راجیو پرکاش ساحر کے افسانے زندگی کی تلخ حقیقتوں اور انسانوں کی جدوجہد کو بھی سامنے لاتے ہیں جو اس دور میں ہر انسان کا مقدر بن گئی ہے۔ اس کی عمدہ مثال راجیو پرکاش ساحر کے پیش کردہ افسانہ 'تشنہ لبی' میں ملتی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ایک واٹر پیوری فائر کمپنی کے Representative کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا ہے جو گاؤں کے ایک کسان کا تعلیم یافتہ بیٹا ہے اور گاؤں سے دور شہر میں اپنی زندگی کو آسان بنانے کے لیے تگ ودو میں مصروف ہے اور اسی کردار کو بنیاد بنا کر راجیو پرکاش نے پانی کی آلودگی کے ساتھ ساتھ ذہنی آلودگی کو نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے ایک شہر کی آلودہ ندیوں اور گاؤں کے اجڑے اور سوکھے ہوئے تالابوں اور ندی نالوں کے حالات اجاگر کر کے ایک تاثر پیش کیا ہے:

''گاؤں کی یاد آتی ہے۔ گاؤں میں بھی تو ندی نالے، کنویں، پوکھرے، یا تو سوکھ گئے ہیں یا گندلا گئے ہیں گاؤں میں بھی تو پینے کے صاف پانی کی دشواری ہے گاؤں میں پانی کون صاف کرے گا؟ میں تو یہاں شہر میں پانی صاف کرنے کے دھندھے میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔'' (تعاقب زرد موسم کا، ص48)

راجیو پرکاش ساحر نے شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں کی آبی آلودگی کی تشویش ناک تصویر پیش کی اور واٹر پیوری فائر کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا معاشرہ اور ماحول مکدر ہو چکا ہے۔ انھوں نے ذہنی آلودگی کے طنزیہ وار سے آبی آلودگی کو ختم کرنے کے دوار کھولے ہیں۔

اسی طرح راجیو پرکاش ساحر کا ایک اور افسانہ 'منیا' بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں متاثر کن سماں، پرکشش الفاظ اور خوبصورت انداز سے اس افسانے کا آغاز کرتے ہوئے دنیا کی بے رحم حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ غربت میں غرق ماں باپ کی معمولی شکل وصورت اور دبی رنگت والی 'رمیا' کی زندگی کو اپنے افسانے کا محور بنایا ہے کہ کولہو کے بیل کی مانند کام میں مصروف شرابی شوہر کے استحصال کو برداشت کرنے والی رمیا کی زندگی کتنی مشکل تھی، بے رحم انسانیت کس طرح اس کی معصوم بچی منیا کو بھی کھا گئی جس کے سبب رمیا اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور مفت میں کھانا دینے سے بچنے کے لیے گھر والوں نے اسے پاگل قرار دے کر گھر سے نکال دیا اور وہ قسمت کی ستائی ہوئی گاؤں کے درمیان واقع ایک مندر میں ایک کتے اور اس کے بچوں کے ساتھ پناہ گزیں ہو گئی اور پیٹ بھرنے کے لیے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے لگی۔ راجیو پرکاش ساحر نے اس افسانے کے کلائمکس کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماجی جبر اور استحصال کی بنا پر رمیا کس طرح جنون کے عالم میں ایک تندوے کے بچے کو اپنی بچی منیا تصور کر کے اس کی پرورش کرنے لگی اور اس کی یہ مجنونانہ خوشی بھی بے رحم معاشرے کو ہضم نہیں ہو پاتی ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے اس بچے کے ساتھ ندی میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ یہ افسانہ اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس میں ہمیں مقامی بولی کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم مندرجہ ذیل اقتباس سے لگا سکتے ہیں:

''اوی دادا رے، پران مندر ما اوپگلی رمیا ایک ٹھورے سنہرا کالی چتوں والا تندووے کا بچہ پالے ہے'' (ایضاً، ص55)

اس سے ان کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اردو انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ ان کے اس افسانے میں دیہی معاشرے میں جبر و استبداد کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ افسانے کے اختتام پر راجیو پرکاش ساحر کا یہ فقرہ ''بہر حال جو بھی ہوا ہو، بستیوں کے اجگر تو جنگلوں کو بدستور نگلتے ہی رہے ہیں'' ذہن پر دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

راجیو پرکاش ساحر نے دیگر موضوعات و مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں بخوبی جگہ دی ہے جہاں تک ان کے افسانے کے اسلوب اور زبان کی بات ہے تو زبان مواد اور موضوع کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ ان کے اس مجموعے میں شامل زیادہ تر افسانے جہاں وحدت تاثر کی خصوصی اہمیت سے مالا مال ہیں وہیں اپنے آپ میں جاذبیت اور محویت رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اردو افسانے کو وسعت اور کشادگی بخشنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ لہٰذا جب قاری مجموعے میں موجود افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا تجسس اسے مسلسل پڑھتے رہنے اور افسانوں کی افسانویت کی تہوں تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح یہ افسانوی مجموعہ اردو ادب کے خزینے میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

کھول دو (افسانچوں کا مجموعہ)

مصنف: تنویر اختر رومانی

صفحات: 128، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: خورشید حیات، K,205، گولف گرین، غازی آباد

تنویر اختر رومانی کے افسانے ہوں یا افسانچے، بہت تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں، تہذیب کی سوکھتی ہوئی جڑوں، ریت کی طرح پھسلتی ہوئی، داستان رنگ زندگیوں، تیز دھوپ میں برف کی طرح پگھلتی ہوئی سُنہری روایتوں کی داستان 'کھول دو' افسانچوں کے مجموعے کی صورت لیے مشینی دور کے ادھورے آدمی کو سُناتی ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے افسانچوں یا مختصر مختصر سی کہانیوں کی یہ مقناطیسی کشش ہی ہے کہ اکیسویں صدی کا ڈیجیٹل قاری بھی اپنی انگلیوں کے پوروں کو تھوڑا نم کر کے ورق ورق افسانچوں کے کردار سے مکالمہ قائم کرتا ہے۔

جمشید پور سے افسانچوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ جو زندگی کے سفر میں 'قصر صورت' لیے منظر عام پر آیا ہے۔

تنویر اختر رومانی، زمانۂ طفولت سے ہی ذاکر، شاکر، صابر اور انسان دوست رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر افسانچہ، گم ہوتے ہوئے انسان اور ادھورے آدمی کے دل پر گزرنے والی کیفیت، احساسات اور باطنی کیفیات کا بیان ہے۔ ایک ایسا بیان جو دل کو چھو کر روح کی گہرائیوں میں مچلنے اور تھرکنے لگتا ہے اور سوئے ہوئے شہر کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر شہر ہے کہ جاگتا ہی نہیں۔ جاگنا تو بہت آسان ہے، مگر سونے والے جاگ نہیں رہے ہیں۔

افسانچے کے سنجیدہ قارئین کے لیے تنویر اختر رومانی کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے کئی افسانچوں سے گزرتے ہوئے ایسے کردار سے ملاقات ہوتی ہے جو بہتی ہوئی زہریلی فضا میں 'مداری' کے ذریعے 'اداکاری' پر متعین کر دیے گئے ہیں۔

جمشید پور ایک ایسا شہر ہے، جہاں ادب قبیلہ کا 'قبلہ' ہمیں درست دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر کی اپنی سنہری/تہذیبی/ ثقافتی اور ادبی روایت رہی ہے۔ آج بھی بہتی ہوئی ہوائیں ان سب معتبر چہروں کے کمال کے قصے سناتی ہیں۔ شمیم چھاروی، ہربنس سنگھ دوست، اصلاحی کہانیاں لکھنے والے مولانا ارشد القادری، زکی انور، منظر کاظمی، گربچن سنگھ، انور امام، اختر آزاد، رشید جہاں انور، پرویز شہریار، ابرار مجیب، نیاز اختر سے لے کر مہتاب عالم پرویز تک ناموں کے ایک طویل سلسلے ہیں، جو 'کالی ماٹی' سے جڑے چہروں کی تخلیقی صلاحیتوں کے روشن نقوش مرتب کرتے ہیں۔

تنویر اختر رومانی اردو ادب کی تختی پر، افسانے اور افسانچے کا ایک اہم دستخط ہیں۔

ان کے یہاں اردو زبان وادب کا جنوں ایک عبادت کی طرح ہے۔ افسانچے کے تعلق سے تنویر اختر رومانی کا خیال ہے کہ جس طرح شبنم کے ایک قطرے میں پورا آسمان نظر آتا ہے۔اسی طرح ایک افسانچہ پوری معاشرت انسانی کا آئینہ ہوتا ہے۔

خورشید کی ادھوری سی حیات کا ماننا ہے کہ افسانچہ دوڑتی بھاگتی زندگی میں ٹچ اسکرین پر پھسلتی/ سرکتی ہوئی تہذیب کی ایک صورت ہے۔ افسانچہ مختصر سے کینوس پر لامحدود کائنات کے موجود ہونے اور ارتقا کی نئی نئی صورتوں کا استعارہ ہے۔طبعی کائنات کی وسعتوں کے اندر مزید طوالت کی گنجائش شاید جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔افسانچہ، کہانی کائنات کے منہدم ہونے سے پہلے کا عمل ہے۔ ایک ایسی دنیا کا ظہور ہو چکا ہے۔ جہاں تمدن کے نام پر مشین اور تہذیب کے نام پر حیوان بستے ہیں۔روایت کہانی کی ہو یا پھر گاؤں میں بہنے والی ندیوں کی اس کی چوڑی چھاتی سکڑتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف ہماری پانچوں قوتیں غیر محدود ہوتی جائے ہے۔

’کھول دو‘ میں، اردو کے مشہور افسانوں کے ری میک 12 افسانچے اور 69 طبع زاد افسانچے شامل ہیں۔ان میں سسکتی انسانیت، تلخ حقیقت، چراغ، خوشی کی بات، تیسری راہ کا متلاشی اور بھی کئی افسانچے، موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ مجھے ان کے کئی افسانچوں، (اختلاف، مہمان رسول، برکت والی ہولی، سیندور، بھوکی، انجمن) میں یہ محسوس ہوا کہ تنویر، لفظوں کے ذریعے مقفل اذہان کے تالے توڑ کر ’اجتہاد‘ کو آواز دیتے ہیں۔

مجھے تنویر اختر رومانی، زندگی کے حروف رنگ چہروں کے ایک کامیاب مصور دکھائی دیتے ہیں۔

حادثے ہیں تو کہانیاں ہیں اور کہانیاں ہیں تو فکری حادثات۔

قلب پر حروف کے نزول سے ہی، کہانی کی زندگی اور معراج فکر وفن ممکن ہے

عصری منظرنامے میں، تنویر کے افسانچوں کو روحانی نظام کی تلاش ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تنویر اختر رومانی، اردو افسانے/ افسانچے کے ’کوکب‘ ہیں۔

ان کے افسانچوں کے مجموعہ ’کھول دو‘ کے زیادہ تر افسانچے، اپنے عصر کی نمائندگی کرنے کے ساتھ، اپنے زمانے سے آگے کا سفر جاری رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔تنویر اختر رومانی ایک ایسے تخلیقی فنکار ہیں، جن کی آنکھوں میں کئی موسم جاگتے ہیں۔

بارہ ری میک افسانچوں پر میں بات نہیں کرونگا کہ تنویر نے ’کھول دو، بابا لوگ، عیدگاہ، گورکن، رئیس خانہ، آنندی، بو، کفن، انوکھی مسکراہٹ، لاجونتی، پنچایت اور لحاف کو وہی ’لحاف‘ اوڑھایا ہے یا آگے سرکایا ہے جسے حقیقت پسندانہ تصور کی روکشائی کرنے والے افسانہ نگاروں نے برتا تھا۔

ریمیک افسانچوں سے الگ ہٹ کر بات کریں تو میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ تنویر اختر رومانی کے افسانچے اپنے اندر طویل کہانیوں کی صفات رکھتے ہیں۔مثلاً تین سطری کہانی کا یہ اقتباس دیکھیے:

بے انتہا خوش آئند لمحات حاصل کرنے کی خواہش میں مجھے اپنی پس انداز کی ہوئی مختصر خوشیاں بھی تیاگ دینا پڑیں۔

اور تب

حاصل ہوئے چند دکھ بھرے لمحات‘

یہ کتاب، اپنے عہد کا آئینہ ہے۔عہد جدید کے تمام حوادث کے گواہ، ہمہ رنگ یہ حروف ہی ہوتے ہیں جو قلم سے آزاد ہو کر، پرندوں کی اڑان بنتے ہیں۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کا مجموعہ ’ببول‘ منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

افسانچہ پسند قارئین کو یہ کتاب پسند آئے گی، اس بات کا یقین ہے۔

تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ

مصنف: نورین علی حق

صفحات: 164، قیمت: 350، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی

مبصر: محمد شاداب شمیم

ڈی-35، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

’تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ‘ نورین علی حق کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں تیرہ افسانے ہیں، ہر افسانے کا عنوان نیا، اچھوتا اور انوکھا ہے، عنوان کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں کچھ نیا ہے، افسانے کے عناوین اس طرح ہیں: قسطوں میں مرنے والے کا نوحہ، خالی بوتل میں ابال، بوسیدہ حویلی میں رقص، پنجرے میں قید نیند اور شکارگاہ سے دو قدم آگے وغیرہ۔نورین علی حق تقریباً دس برسوں سے افسانہ لکھ رہے ہیں، مختلف رسائل وجرائد میں ان کے افسانے شائع ہو چکے ہیں، کتاب کا نام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید تنقید یا پھر کسی اور فن کی کتاب ہے، اس لیے کہ عام طور پر افسانوں کی کتابوں کے نام ایسے نہیں رکھے جاتے، کتاب کے فلیپ پر مشہور فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید کی تحریر سند کا درجہ رکھتی ہے، وہ افسانہ نگار کے بارے میں لکھتے ہیں ”نورین علی حق کے افسانوں میں وجودیت کی تمام اہم جہات حیرت انگیز طور پر سمٹ کر ایک تخلیقی اکائی بن گئی ہیں، وجودی کرب، دہشت اور ازلی تنہائی تو دوسرے کئی افسانہ نگاروں مثلاً انور سجاد اور احمد ہمیش وغیرہ کے یہاں بھی موجود ہیں مگر نورین علی حق کے یہاں ایک قسم کی وجودی جھنجھلاہٹ کا عنصر بھی نمایاں ہے جو میں نے راست بیانیے میں پہلے کہیں نہیں دیکھا“۔اس کتاب کو پڑھ کر واقعی اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر خالد جاوید کی بات لفظ بہ لفظ صحیح ہے، انھوں نے مصنف کے تعلق سے مبالغہ آمیز باتیں نہیں بلکہ حقیقی اور سچی باتیں تحریر کی ہیں۔ان کے علاوہ سید محمد اشرف اور شافع قدوائی نے بھی مصنف اور ان کی تخلیق کے متعلق حوصلہ افزا باتیں لکھی ہیں۔مصنف سے متعلق مشہور ومعروف شخصیات کی آرا کا میں دل سے احترام کرتا ہوں لیکن میرا ماننا ہے کہ اس طرح کی تحریریں زیادہ تر قاری کو مرعوب کرنے کے لیے تحریر کی جاتی ہیں، تخلیق کو قاری کے حوالے کر دینا چاہیے، مطالعے کے بعد قاری خود فیصلہ کرے کہ اس میں کیا ہے، کیا نہیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ’قسطوں میں مرنے والے کا نوحہ‘ ہے، اس میں مصنف نے واحد متکلم کا صیغہ اختیار کرتے ہوئے مختلف طرح کی پریشانی، مصائب و آلام اور جھنجھلاہٹ کو بڑی خوش اسلوبی اور اچھوتے پیرائے میں بیان کیا ہے، موت کی تمنا اور آرزو کا اس میں جس طرح بیان ہے وہ واقعی قابل رشک ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عاشق معشوق کے لیے بے چین اور مضطرب ہے، ”پیدائش سے اب تک اپنی سفاک، خوں خوار اور تڑپا تڑپا کر کتے کی موت مار دینے والی اپنی بالکل اپنی، ذاتی اور نجی اجل موعود کا میں سراپا منتظر اور چشم براہ ہوں، میرے پاس جینے کی امیدیں بہت ہیں، مگر میں مرنا چاہتا ہوں، بس ایک بار پورے شوق کے ساتھ خود کو مرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، موت کو گلے لگانا چاہتا ہوں، تیز بہت تیز اسے بھینچنا چاہتا ہوں، اس سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہتا ہوں اور مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کو روٹھے محبوب کے ہاتھ کی طرح تیز دبا دینا چاہتا ہوں تا کہ میرے ہاتھ کی تپش محبت اور حرارت انتظار کی رسائی اس کے وجود تک ہو سکے“۔اس اقتباس کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنف نے بڑی عرق ریزی سے ایک ایک لفظ کو بنا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے اسے ترتیب دیا ہے، اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہی قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ قسطوں میں مرنے والے کا نوحہ پچیس صفحات پر مشتمل ہے جسے ایک طویل افسانہ بھی کہا جا سکتا

ہے،اس کی خوبی یہ ہے کہ قاری مصنف کے سحر انگیز اسلوب میں گرفتار رہتا ہے،اس کے ہر پیراگراف میں مصنف نے ایک نئی پریشانی، الجھن اور جھنجھلاہٹ کو بیان کیا ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا افسانہ 'سرو کی سائیکی' ہے،اس میں بھی متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے،تصورات و تخیلات کا بہت دلچسپ استعمال اس افسانے میں ملتا ہے،سرو کے درخت کو مرکز بنا کر یہ افسانہ تخلیق کیا گیا ہے،سرو کا درخت کافی لمبا ہوتا ہے،اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بالکل بے فیض درخت ہے،اس سے نہ تو سایہ حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کا پھل یا بیج کسی کام آتا ہے،مطلب یہ کہ اس سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا، یہ افسانہ عام افسانوں سے بالکل الگ ہے،پہلی نظر میں یہ بالکل بھی سمجھ نہیں آتا کہ مصنف کیا کہنا چاہ رہا ہے،لیکن اگر بغور پڑھا جائے تو اس افسانے کی پرتیں دھیرے دھیرے کھلنے لگتی ہیں۔

خالی بوتل میں ابال اس مجموعے کا تیسرا افسانہ ہے،اس افسانے میں تشبیہ و استعارے کا بخوبی استعمال ملتا ہے،ایک دھوکہ کھائی ہوئی لڑکی کے ساتھ گذارے ہوئے لمحات کو جس خوش اسلوبی اور بے باکی سے بیان کیا گیا ہے وہ اس افسانے کی خوبصورتی اور نئے پن میں چار چاند لگا دیتا ہے،اس افسانہ کو پڑھتے ہوئے منٹو کے ٹھنڈا گوشت کی یاد آتی ہے،خود مصنف کے الفاظ میں ''میں جذباتی ہو رہا ہوں، میں نے بالآخر اسے سینے سے لگالیا، وہ بے حس و حرکت میرے سینے سے لگی رہی،اس کا دایاں ہاتھ اٹھایا،اس پر اپنے گرم ہونٹ رکھ دیے، کچھ دیر بعد اس کا تاثر جاننے کے لیے میں نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں ڈال دیں، وہ بے حسی کے عالم میں مجھے کھوئی کھوئی سی تکتی رہی، ٹھنڈا گوشت کا ایشر سنگھ پتے پھینکنے کو تیار ہے،کلونت زمانے کے سرد و گرم سے پتھر میں تبدیل ہوگئی''۔اس کہانی کا تانا بانا بڑی خوبصورتی سے بنا گیا ہے،اس کے علاوہ دیگر افسانے بھی بڑے دلچسپ ہیں، روایتی ڈگر سے ہٹ کر یہ افسانے تحریر کیے گئے ہیں، افسانے کا اسلوب، سادہ و سہل الفاظ کی مینا کاری اور تشبیہ و استعارے کا برمحل استعال اس مجموعے کی خصوصیت ہے، اس طرح کے مجموعے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانے کا مستقبل محفوظ ہے،ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب علمی و ادبی حلقے میں ضرور پسند کی جائے گی۔

سوانح/شخصیت

عکسِ منتشر (خان نوید الحق-شخص سے شخصیت تک)

مرتب: سید خالد

صفحات: 328، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: الفاظ پبلی کیشن، کامٹی

مبصر: محمد علیم اسماعیل

وارڈ نمبر 15، پولس اسٹیشن کے پیچھے، نندورہ 443404 (مہاراشٹر)

زیر تبصرہ کتاب عکسِ منتشر، ریاست مہاراشٹر میں درسی کتابوں کے ادارہ 'بال بھارتی' پونہ کے شعبۂ اُردو کے اسپیشل افسر رہے خان نوید الحق کی شخصیت اور اعترافِ خدمات پر تحریر کیے گئے مضامین، منظومات اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب خان نوید الحق کی خدمات اور ان کی شخصیت کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔جس میں 63 مضامین، 11 منظومات، چند تہنیتی پیغامات اور آخر میں رنگین تصاویر دی گئی ہیں۔

کتاب کا مقدمہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی نے لکھا ہے۔ مضامین کی اگر بات کی جائے تو ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، سلیم شہزاد، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، سلام بن رزاق، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، ڈاکٹر ناصر الدین انصار، فاروق سید، ڈاکٹر قمر صدیقی، وجاہت عبدالستار، عامر اصغر قریشی، محسن ساحل، رونق جمال، مشیر احمد انصاری، دیوان محمد شکیل کے ساتھ ساتھ کُل 63 قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔

خان نوید الحق سنہ 1991 میں ادارہ بال بھارتی پونہ سے منسلک ہوئے تھے اور سنہ 2022 میں اپنی تیس/اکتیس سالہ خدمات سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اردو میڈیم کی درسی کتابوں کی ترتیب و تالیف کے سلسلے میں خان نوید الحق ہماری مسلم تہذیب و ثقافت کو مرکز مان کر ہی کام کیا کرتے تھے۔ ان کا مزاج بظاہر تو بڑا سخت نظر آتا ہے لیکن ان کی طبیعت میں نرمی بھی اتنی ہی ہے۔ موصوف کی بیباکی کے قصے بھی بڑے مشہور ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت کی نرمی ان کی سخت مزاجی پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط اپنے مضمون 'نرم دم گفتگو گرم دم جستجو' میں لکھتے ہیں: ''اسباق و منظومات کے انتخاب میں وہ اراکین کمیٹی کے درمیان مخل نہیں ہوتے البتہ ہماری مسلم تہذیب و ثقافت مرکوز تخلیقات پر زور دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی حساسیت کا یہ عالم ہے کہ نصابی کتابوں کی تصاویر میں بھی ہماری تہذیب و معاشرت کی جھلکیوں کا وہ پورا پورا خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ لباس، چہرے کے تاثرات اور نشست و برخاست بھی جو تصویر کشی کے فن کی اہم جزئیات میں شمار کی جاتی ہیں، ان پر بھی ان کی ناقدانہ نظر رہتی ہے۔''

اس کتاب میں شامل مضامین، خان نوید الحق کا اردو زبان کے تئیں لگاؤ، بال بھارتی میں اُردو کے تئیں ان کی خدمات اور ان کی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ زیادہ تر مضامین میں خان نوید الحق سے تعلق رکھتا ہوا کوئی نہ کوئی قصہ بیان ہوا ہے۔ جس کا مرکزی کردار خان نوید الحق ہیں۔ اس طرح ان مضامین میں کہانی پن پیدا ہو گیا ہے جو دلچسپ ہے اور معلوماتی بھی۔ مضامین میں بیان کیے گئے قصے اور واقعات سے خان نوید الحق کی شخصیت کے نئے نئے گوشے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مضامین خان نوید الحق کی 30-31 سالہ خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔

سلیم شہزاد اپنے مضمون 'قلم کا مزدور' میں لکھتے ہیں: ''اپنی آفیسری کے پورے عرصے میں نوید نے قلم کے مزدور کا کردار ادا کیا ہے۔ ہر وقت ایک نا ایک مسودہ سامنے ہے اور اس پر نوید کا قلم چل رہا ہے۔ ایسا بھی اکثر ہوا ہے کہ رات گئے ان کا فون آیا تو پوچھ رہے ہیں کہ فلاں لفظ کے واقعی کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ لغت میں تو یہ اور یہ معنی ملتے ہیں مگر میرے سامنے جس جملے کی مثال ہے اس میں اس لفظ کے معنی کچھ اور ہی ہیں۔ اُردو زبان سے محبت نوید الحق صاحب کی پہلی پسند ہے۔ انھوں نے زبان دانی کے مضمون کے علاوہ ایسے ایسے تدریسی موضوعات پر قلم چلایا ہے کہ ان کا ذخیرہ الفاظ بلا مبالغہ ایک قاموسی ذخیرہ بن گیا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ زبان و ادب کے ماہر ہیں، وہ ادیب ہیں نا شاعر مگر درسیات کی ترتیب و تہذیب کے سلسلے میں انھوں نے اتنا ادب پڑھ لیا ہے جو ایک ماہر کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔''

کتاب میں شامل زیادہ تر مضمون نگاروں نے اپنے خیالات کو مربوط اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ سر سید احمد خان کے مطابق کسی بھی مضمون میں صرف الفاظ اور اندازِ بیاں کا دلکش ہونا کافی نہیں بلکہ ایک مضمون میں جو خیالات اور جو باتیں پیش کی جائیں ان کا دلکش ہونا بھی ضروری ہے اور یہ خوبی زیر تبصرہ کتاب میں شامل مضامین میں پائی جاتی ہے۔

منظومات والے حصے میں، ظہیر قدسی، سید بشیر احمد بشیر، عرفان شاہ نوری، شیخ علیم اسرار، میر افضل، خان حسنین عاقب، متین اچل پوری، ندیم ابنِ نعیم، ڈاکٹر شہروز خاور، خان انعام الرحمٰن، شبیر احمد جگر، یوسف دیوان کے منظوم تاثرات شامل ہیں۔

اس کتاب کو سید خالد نے ترتیب دیا ہے۔ سید خالد کا تعلق مہاراشٹر کے مالیگاؤں شہر سے ہے، لیکن فی الحال موصوف ممبئی میونسپل کارپوریشن میں شعبہ دُرس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ سید خالد ایک اچھے ناظم اور مقرر ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سلجھا ہوا ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔

شاعری

دھوپ چھاؤں کا رقص

شاعرہ: شبانہ عشرت
صفحات: 136، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: جی این کے پبلی کیشنز، بڈگام، جموں کشمیر
مبصرہ: گل آفرین، چندوارہ، مظفرپور (بہار)

اچھے ادب اور اچھی شاعری کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ زندگی اور زمانے کا عکس ہی نہیں دکھاتی بلکہ اس میں نکھار بھی لا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی اور زمانے میں نشیب وفراز کے تجربے اور مشاہدے سے کسی کے لیے مفر نہیں، لیکن فنکار کا وظیفہ خاص یہ ہے کہ وہ اس سرد وگرم یا دھوپ چھاؤں جیسی بنتی اور بدلتی کیفیت کو رقص پیہم کے نظاروں میں ڈھال دیتا ہے اور اس طرح مسرت وبصیرت دونوں ہی کے حصول کا امکان قوی ہو جاتا ہے، خصوصاً یہ عمل جب کسی حساس خاتون فنکار کے قلم سے صفحہ قرطاس پر مرتسم ہو رہا ہو تو اس کی کیفیات کا دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ بن جانا یقینی ہے۔ یہاں یہ باتیں پیش نظر شعری مجموعہ 'دھوپ چھاؤں کا رقص' کے تعلق سے لکھی جا رہی ہیں۔ یہ محترمہ شبانہ عشرت کا دوسرا خوبصورت مجموعہ ہے جو ان کے پہلے مجموعہ 'دھند میں لپٹا چاند' کی اشاعت کے محض ایک سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔

حمد ونعت کے ساتھ 36 غزلوں اور 24 نظموں پر مشتمل اس مجموعہ کے آخری 14 صفحات شاعرہ نے اپنی پہلی کتاب پر تاثرات وتبصرے کے حوالے کر دیے ہیں جن کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اپنی تانیثی شاعری سے انھوں نے ناقدین کو پر امید بنائے رکھا اور اب اس مجموعہ کی صورت میں انھوں نے اُن کی امیدوں کو یقین میں بدلنے کے بیشتر اسباب بھی مہیا کر دیے ہیں۔ وہ اپنی اس کتاب پر کسی کی تاثراتی تحریر کی شمولیت کے بغیر بزمِ قارئین میں آئی ہیں جو اُن کی خود اعتمادی کا روشن ثبوت ہے۔ انھوں نے کتاب کا 'انتساب' اپنے ہم سفر فیضان احمد کے نام کیا ہے۔

شبانہ عشرت صاحبہ کے زیر نظر مجموعے میں غزلوں کا سلسلہ صفحہ 27 سے صفحہ 76 تک پھیلا ہوا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ آخری دو حرف کے لحاظ سے یہ غزلیں ابجدی ترتیب میں رکھی گئی ہیں، جن سے اس حصے میں غزلیہ دیوان جیسی خاموش کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ 'دھوپ چھاؤں کا رقص' کی شاعرہ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ راہِ سخنوری آسان نہیں، یہاں بہرحال کچھ فنکاری سیکھنے اور لفظوں میں کچھ رنگ بھرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

عشرت جی یہ سخنوری ہے اتنی بھی آسان نہیں
لفظوں میں کچھ رنگ بھرو اور سیکھو کچھ فنکاری بھی

ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی احساس ہے کہ اس نے رسمی شاعری نہیں کی ہے بلکہ اپنے زخموں کو الفاظ کی صورت دے کر گویا اپنے اشکوں کو حسین شعر میں ڈھال دیا ہے۔

اپنے زخموں کو بھی الفاظ کی صورت دے کر
میں نے اشکوں کو حسیں شعر میں ڈھالا اکثر

یہ گویا زندگی اور زمانے کے عکس میں نکھار لانے کے شعور اور اس کی خاطر کامیاب محنتوں کا اشارہ ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں معاملہ صرف شاعرہ کے بلند بانگ دعوے تک محدود نہیں بلکہ اس مجموعے کا وافر حصہ مختلف صورتوں میں اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

تانیثی شاعری محض اظہار احتجاج سے عبارت نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی تاثیر کے لیے وجہ احتجاج کا سامنے آنا بھی ضروری ہے، ہمدردی کا مکاری میں بدلنا گویا 'دھوپ چھاؤں کا رقص' ہے جو بے بسی کا جبر یہ ماحول بناتا ہے، ایسا ماحول جہاں شاعرہ سچی خوشی کے لیے ترستی رہ جاتی ہے، اس کی آنکھوں میں جدائی کی لکیریں ناچنے لگتی ہیں، اُس پر اُداسی کے سبھی رنگ جچنے لگتے ہیں، وہ مدتوں سے خود کو تابوت میں قید محسوس کرتی ہے اور عمر بھر اسے ایک ایک سانس کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔

ہر سانس کا ادا کیا تاوان عمر بھر　　کہنے کو یوں تو ہم نے گزاری ہے زندگی
میری آنکھوں میں جو رقصاں ہے جدائی کی لکیر　　مجھ پہ جچتے ہیں سبھی رنگ اُداسی والے
جب بھی میں چاہتی ہوں رنگ سنہرا عشرت　　پھیر دیتا ہے کوئی رنگ سیاہی والے
تمام عمر پھری مثل برگ آوارہ　　مرا نصیب کہ منزل قریب آ نہ سکی
میں کہ تابوت میں ہوں قید بڑی مدت سے　　مجھ کو اس قید سے آزادی دلائی جائے
سبھی نشتر لگاتے ہیں کوئی مرہم نہیں دیتا　　یہ دنیا زخم دے کر بھی تڑپتا چھوڑ جاتی ہے

زیر نظر مجموعے کی غزلیں مزید بتاتی ہیں کہ شاعرہ نے فلسفہ ونفسیات، گہرے احساسات وتجربات، نسائی شکایات اور خوف مستقبل کے تعلق سے بھی نہایت عمدہ اشعار سپرد قلم کیے ہیں، مثلاً

نصیب ہونے نہ دے گا سکوں کی نیند کبھی　　وہ تیز دھوپ بھی اب سائباں میں ڈالے گا
لازم ہے کہ بانہوں کا سہارا بھی ہو شامل　　یادوں پہ سدا دل کا گزارا نہیں ہوتا
پتہ نہیں ہے کوئی ہاتھ کب چھڑا لے گا　　یہ پل دو پل کے سہارے ہمارے ہیں ہی نہیں
لگتا ہے معصوم وہ کتنا اس پہ صورت پیاری بھی　　ہنستے ہنستے ضرب لگائی دل پہ اس نے کاری بھی
شک کی بیماری پنپتی ہے دلوں میں جن کے　　سامنے اُن کے صفائی میں بھی کیا رکھا ہے

اتنا ہی نہیں بلکہ 'دھوپ چھاؤں کا رقص' کے ماحول میں شاعرہ کی کامیاب جذبات نگاری، اس کی دانشوری، اس کی للکار، اس کا طنز بھرا لہجہ اور اس کا نسائی طنطنہ بھی لائق داد ہے۔

تم اپنا تیر سنبھالو جگر سلامت ہے　　لبوں پہ اب بھی ہم اپنے گلاب رکھتے ہیں
موت بھی دے رہا ہے قسطوں میں　　کیا یہی بس تری سخاوت ہے

یہ بات اپنی جگہ کہ 'چھین لی ہے مری پرواز کی طاقت مجھ سے' جیسی مثال ہمیں حشو کا احساس دلاتی ہے اور 'میری دستار ترے قدموں کی زینت بن جائے' جیسا مصرع کچھ شکوہ سنجی کا ماحول بناتا ہے، مگر اس کے بالمقابل جب۔

ع　کس کا آنچل اُڑ رہا ہے سبز دھانی راہ میں
ع　اس سے کہنا کہ ملاقات ادھوری ہے ابھی
ع　حال دل ان کو سنانے میں ذرا دیر لگی

جیسے مطالع سے شروع ہونے والی خالص نسائی لب ولہجہ کی غزلیں سامنے آتی ہیں تو مذکورہ شکوے خود بخود زائل ہونے لگتے ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں غزلوں کے بعد نظموں کا حصہ سامنے آتا ہے جو ص 79 سے ص 119 تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں شک نہیں کہ 'آغازیہ' میں شاعرہ نے اپنی نظموں کے تعلق سے جو سطریں لکھی ہیں اُن کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ 'دھوپ چھاؤں کا رقص' کی نظمیں عموماً تفصیل سے احتراز میں کامیاب ہیں۔ ان میں کلائمکس کا حسن بھی ہے، عنوان میں تجسس کا وصف بھی ہے اور ان میں جدیدیت بدوش تانیثی موضوعات اور صاف ستھری نسائیت بھی قاری کو ملتفت کر لیتی ہے۔ 'رنگ زندگی' میں اگر علامت و استعارہ کا استعمال متوجہ کرتا ہے اور 'میں تو آواز ہوں' میں روانی اور نظم کی عمدہ بنت اپنا معترف بناتی ہے تو 'میں خوشبو ہوں' میں خوشبو کی تہہ داری بھی قابل لحاظ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ 'آگ کا انجام' اور 'ذرا یاد رکھو' کا انتباہی رنگ 'شجر' کی محرومیت، 'کسی لاچار کی آواز سنی ہو تو کہو' کا احساس کو جگانے والا انداز، 'رشتے ناطے' کی عصری نفسیات بھی تا دیر اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔ ■

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کے ’خبر نامہ‘ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

تحریکِ آزادی میں مردوں کے ساتھ خواتین کی قربانیاں ناقابل فراموش: پروفیسر شیخ عقیل احمد

عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ’داستانِ جنگ آزادی‘ کی پیش کش

نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے زیراہتمام پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی کتاب میلے کے دوران 4/مارچ کو میلے کے تھیم پویلین میں قومی اردو کونسل کے زیراہتمام ’داستان جنگ آزادی‘ کے عنوان سے ایک خوب صورت داستان پیش کی گئی، جس میں

خصوصاً تحریک آزادی کی خواتین سپاہیوں کی قربانیوں اور ان کی غیر معمولی حب الوطنی اور جذبۂ آزادی کو خراج پیش کیا گیا۔ اس داستان کے تخلیق کار و ڈائریکٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر دانش اقبال تھے، جبکہ داستان گوئی عارفہ جبین اور اظہر الدین اظہر نے کی اور میوزک آرٹسٹ کے طور پر سعادت ایثار اور سید انصرام الحق نے اپنی فنکاری کا مظاہرہ کیا۔

قبل ازاں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ میں سب سے پہلے این بی ٹی اور خاص طور پر جناب شمس اقبال صاحب کو مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں، جن کی کوششوں سے کتاب میلے کے دوران یہاں کئی علمی، ادبی وثقافتی پروگرام منعقد ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خصوصاً اس سال جنگ آزادی کا امرت مہوتسو بھی منایا جارہا ہے، جس کے تحت بہت سی تقریبات ہوچکی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں، قومی اردو کونسل کے ذریعے پیش کی جانے والی آج کی یہ داستانِ جنگ آزادی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی کا جب ذکر ہوتا ہے یا اس پر لکھا جاتا ہے تو زیادہ تر مردوں کے ہی نام لیے جاتے ہیں، حالانکہ ایک بڑی تعداد ان خواتین کی بھی ہے، جنھوں نے تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور اپنے گھر بار وغیرہ کی ذمے داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے آزادی کی مختلف تحریکوں میں بھی اہم رول ادا کیا، اس داستان میں ہندوستان کی خواتین مجاہدین آزادی کے کردار پر ہی فوکس کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس داستان کو سننے کے بعد سامعین میں جوش و خروش پیدا ہوگا، وطن سے محبت میں اضافہ ہوگا، تحریک آزادی کے دنوں کے مصائب و مشکلات سے واقفیت ہوگی اور ساتھ ہی یہ سبق بھی ملے گا کہ ہم آج کے وقت میں اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے کیا کرسکتے ہیں اور بطور شہری اپنی ذمے داریاں کیسے نبھا سکتے ہیں۔ انھوں نے اس داستان کے تخلیق کار و ڈائریکٹر دانش اقبال اور ان کی پوری ٹیم کو بھی مبارکباد پیش کی اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پروفیسر دانش اقبال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کی آزادی میں تمام طبقات نے حصہ لیا اور سبھوں کی مشترکہ کوششوں سے ملک آزاد ہوا، ان میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی شامل تھیں مگر ان کا تذکرہ کم ہوتا ہے، اس لیے ہم نے ان کے مختلف واقعات کو جمع کرکے ایک داستان کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں سارے ناموں کا احاطہ نہیں ہے، کچھ چھوٹ بھی گئے ہیں جنھیں ہم آیندہ شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے یہ رقص کے ذریعے پیش کیا جاچکا ہے، آج اسے داستان کے فارم میں پیش کیا جارہا ہے۔

تمام اداکاروں نے بڑی خوب صورتی سے یہ داستان پیش کی اور رانی ویلو نچیار، رانی لکشمی بائی، رانی اونتی بائی، بیگم حضرت محل، بیگم نشاط موہانی، کملا نہرو اور کستوربا گاندھی وغیرہ کی قربانیوں کی معنی خیز جملوں، خوب صورت اور حوصلہ انگیز اشعار کے ذریعے پیش کش کو سامعین و ناظرین نے خوب پسند کیا اور داد و تحسین سے نوازا۔ اس موقعے پر کونسل کے اسٹاف کے علاوہ بڑی تعداد میں شائقین موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 مارچ 2023

چار روزہ تربیتی پروگرام برائے اساتذہ

قومی اردو کونسل، نئی دہلی کی طرف سے پونے میں 23-20 فروری 2023 کو 'چار روزہ تربیتی پروگرام برائے اساتذہ' کا انعقاد کیا گیا جہاں ویسٹرن ریجن کی گیارہ ریاستوں کے CABA-MDTP سینٹرز کے اساتذہ نے شرکت کی۔ اس پروگرام میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کے لیے قومی اردو کونسل بہت سی اسکیمیں چلا رہی ہے جن میں CABA-MDTP بہت اہم ہے۔ اس کے تحت ہندوستان کے طول و عرض میں 603 سینٹرز قائم ہیں۔ ان مراکز میں طلبا کو کمپیوٹر کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ کمپیوٹر کا ڈپلوما کورس کرکے بچے روزگار سے بھی جڑ رہے ہیں۔

اس پروگرام میں بحیثیت ٹرینر نائلٹ (NIELIT) کے جوائنٹ ڈائرکٹر جناب رمیندر سنگھ اور نائلٹ (NIELIT) کی ڈپٹی ڈائرکٹر مسز جیوتی شرما نے شرکت کی۔ چار روزہ تربیتی پروگرام میں عصر حاضر سے ہم آہنگ ترمیم اور اضافہ شدہ نصاب کے اعتبار سے اساتذہ کو تربیت دی گئی۔ کمپیوٹر نصاب میں تبدیلی اور ترمیم کو اساتذہ نے مفید قدم قرار دیا کہ اس تبدیلی کی وجہ سے طلبا کی دلچسپی اس کورس میں بڑھ رہی ہے اور ان کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس چار روزہ تربیتی پروگرام میں بطور مہمان خصوصی پی اے انعامدار اور مہمانان اعزازی کی حیثیت سے محترمہ عابدہ پی انعامدار اور محترمہ شاہدہ رفیق نے شرکت کی۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

اردو اور ہندی کے تخلیقی رشتے

نئی دھلی: خسرو فاؤنڈیشن اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے اشتراک سے 'اردو ہندی کے تخلیقی رشتے' کے موضوع پر لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کا آغاز کرتے ہوئے

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اس لیکچر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج کل زبانوں کو مذہب کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے جب کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ ہر مذہب کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر واسع نے مزید کہا کہ آج کا لیکچر پیش کرنے والے ہمارے مہمان ڈاکٹر جانکی پرساد شرما کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے اردو والوں کے کلام کو ہندی میں منتقل کیا ہے، انھوں نے زندگی بھر ہندی پڑھائی ہے لیکن اردو سے ان کا عشق غیر معمولی ہے۔ یہ مدھیہ پردیش کے ضلع سرونج کے رہنے والے ہیں، ہندی، اردو، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے کہا میں اردو ہندی ایکتا کا بڑا حامی ہوں لیکن اس بات کا حامی نہیں ہوں کہ اردو کے وجود کو تحلیل کر کے اردو ہندی ایکتا کی بات کی جائے۔ انھوں نے رام چرتر مانس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ تلسی داس نے رام چرتر مانس لکھی اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کو اس طرح خوبصورت انداز میں استعمال کیا گیا کہ جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہری ونش رائے بچن نے مدھوشالا ایسے ہی نہیں لکھی بلکہ انھوں نے فارسی میں عمر خیام کو پڑھا تھا، بچن جی نے اپنی خودنوشت میں اس بات کو لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے نانا کے یہاں اردو رسم الخط میں رام چرتر مانس دیکھی ہے، انھوں نے مزید کہا کہ مجھے دوسروں کی رائے نہیں معلوم لیکن میرا ذاتی طور پر ماننا یہ ہے کہ لوک ادب ہندی اردو کے رشتوں کی اہم سطح ہے اور ہمارا ہندی اور اردو کا لوک ادب مشترک ہے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما ان افراد میں سے ایک ہیں جن پر اردو زبان فخر کر سکتی ہے، یہ اردو، ہندی، سنسکرت اور فارسی زبان جانتے ہیں، بیک وقت اتنی زبانوں کو جاننا غیر معمولی بات ہے، آج جو لیکچر انھوں نے پیش کیا ہے اس کو سن کر میں سمجھتا ہوں کہ سبھی شرکا کے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے سبھی مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے میں خسرو فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر روہت کھیڑا، رنجن مکھرجی، پروفیسر تسنیم فاطمہ، ڈاکٹر سید اقبال، حاجی محمد شمیم احمد سوت والے، ابراہیمی سمیت بڑی تعداد میں طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2023

ترجمے کے مسائل

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام 'ترجمے کے مسائل' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف محقق، نقاد اور جے این یو کے

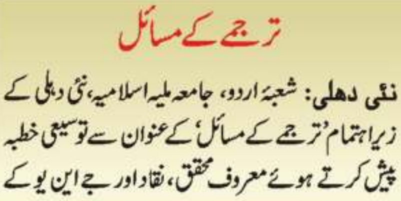

استاد پروفیسر مظہر مہدی نے کہا کہ ترجمے کے ذریعے ہی اظہار کے نئے سانچے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ترجمہ فکر اور اظہار میں گہرائی پیدا کرتا ہے۔ بطور خاص اردو میں نئی اصناف کا اضافہ ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ ترجمہ دراصل دو تہذیبوں، قوموں اور زبانوں کے درمیان باہمی تعلقات استوار کرنے کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے۔ ترجمہ کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس کے لیے دونوں زبانوں اور تہذیبوں پر یکساں عبور لازمی ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ پیشہ ورانہ سرگرمیوں سے ترجمے کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جن مسائل کا ذکر ہوتا ہے ان پر پروفیسر مظہر مہدی نے عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے، چونکہ ترجمے سے ان کا عملی رشتہ رہا ہے۔ پروفیسر مظہر مہدی کی نگرانی میں اس حوالے سے پی ایچ ڈی کے مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے خطبے کے کنوینر پروفیسر سرور الہدیٰ نے کہا کہ پروفیسر مظہر مہدی کا علمی انہماک، تحقیقی دقت رسی اور تنقیدی دیانت ہمارے لیے لائق تقلید ہے۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر نوشاد منظر نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ خطبہ ترجمے کے حوالے سے نئے گوشوں کو اجاگر کرتا ہے اور اس میں بصیرت کا سامان موجود ہے۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر خالد جاوید، پروفیسر ندیم احمد، پروفیسر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر مشیر احمد، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر محمد آدم، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر راہین شمع، ڈاکٹر غزالہ فاطمہ، ڈاکٹر خوشتر زریں ملک کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2023

پروفیسر ابوالحسن صدیقی کی حیات و خدمات

نئی دھلی: ڈیوٹی سوسائٹی کی بنیاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے 1889 میں رکھی تھی جس کا مقصد غریب اور نادر طلبا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مدد فراہم کرنا تھا۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے قیام میں مولانا طفیل احمد، بہادر علی، عبداللہ خان اور مظہر الحق اور پروفیسر

تھامس واکر آرنلڈ کا بھی اہم کردار تھا۔ ڈیوٹی سوسائٹی طلبا کو تعلیمی قرض، مفت بورڈنگ اور کوچنگ وغیرہ فراہم کرتی تھی۔ پروفیسر ابوالحسن صدیقی نے 1985 میں ڈیوٹی سوسائٹی میں بطور امین (کیپر) شمولیت اختیار کی، اس کے بعد سے انھوں نے معاشرے کی ترقی کے لیے بے پناہ کام کیے اور ان کی کاوشوں کا نتیجہ ڈیوٹی سوسائٹی کی موجودہ شکل میں منظر عام پر آیا جو غریب طلبہ کی ترقی کے لیے مسلسل حوصلہ افزائی، رہنمائی اور مالی معاونت کا ذریعہ ہے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے لیے پروفیسر ابوالحسن صدیقی کی غیر معمولی خدمات کو یادگار بنانے کے لیے 19 فروری 2023 کو جامعہ ہمدرد کے کنونشن سینٹر میں 'پروفیسر ابوالحسن صدیقی مرحوم کی حیات و خدمات' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ کیرالہ کے گورنر عارف محمد خان مہمان خصوصی تھے اور جامعہ ہمدرد کے چانسلر اور ڈیوٹی سوسائٹی کے صدر حماد احمد، جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر محمد افشار عالم اور ڈیوٹی سوسائٹی کے نائب صدر خصوصی طور پر شامل تھے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ ایم شاہد پروگرام کے کلیدی مقرر تھے، ڈیوٹی سوسائٹی کے موجودہ کیپر پروفیسر ارشاد محمود نے شکریہ کے کلمات پیش کیے۔ افتتاحی تقریب کی نظامت کے فرائض پروفیسر ایف ایس شیرانی سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انجام دیے۔ افتتاحی خطاب میں پروفیسر ایم افشار عالم نے ریاضی، فزکس اور اپلائڈ ریسرچ کے میدان میں ابوالحسن صدیقی کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور اپنے علی گڑھ کے دنوں کے مشاہدات اور ڈیوٹی سوسائٹی کی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ جناب عارف محمد خان نے اپنی تقریر میں ڈیوٹی سوسائٹی کی اہمیت کو بیان کیا اور شہریوں کے فرائض پر وسیع تناظر میں توجہ مرکوز کرائی۔ انھوں نے مساوات، انسانیت اور تعلیم کی اہمیت کی قرآنی تعلیمات پر بھی روشنی ڈالی۔ جناب خواجہ شاہد نے اپنے کلیدی خطاب میں ڈیوٹی سوسائٹی کی تاریخ اور ممتاز شخصیت ابوالحسن صدیقی کی خدمات کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے ابوالحسن صدیقی کا ورچوئل یونیورسٹی بنانے کا خواب یاد کیا جسے اب حکومت ڈیجیٹل انڈیا مشن کے تحت پورا کررہی ہے۔ پروفیسر ارشاد محمود نے جامعہ ہمدرد میں اس سمینار کے انعقاد میں تعاون کرنے پر ہندوستان اور بیرون ملک سے آئے ہوئے مندوبین اور جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر کا شکریہ ادا کیا۔ تکنیکی سیشن میں پدم شری پروفیسر ایس ظل الرحمٰن، پروفیسر ایم کلیم اللہ احمد، ڈاکٹر نذر عباس، ڈاکٹر آر سی سنگھ، شاردا یونیورسٹی اور پروفیسر عذرا صدیقی نے ڈیوٹی سوسائٹی کے اپنے تجربات شیئر کیے اور ابوالحسن صدیقی کے کارناموں اور کامیابیوں کو مفصل پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 فروری 2023

پارسی تھیٹر کے بعد اردو ڈراما

دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام 'پارسی تھیٹر کے بعد اردو ڈراما' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈرامے کے ماہر اور دہلی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ پارسی تھیٹر کے زوال کی وجہ فلمی صنعت کی ترقی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کے

بعد ڈرامے کی صنف نے ترقی نہیں کی بلکہ آزادی کے بعد اس صنف کو غیر معمولی طور پر فروغ حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سنگیت ناٹک اکیڈمی قائم کی اور آگے چل کر نیشنل اسکول آف ڈراما وجود میں آیا۔ خصوصاً ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے ڈرامے کو طبقاتی کشمکش، سماجی مسائل اور سیاسی ناہمواریوں کی پیش کش کے لیے ایک اہم حربے کے طور پر استعمال کیا۔ ڈراما بنیادی طور پر تحریر کے بجائے کر کے دکھانے کا فن ہے، چنانچہ اسٹیج پر جب ڈراما مختلف تہذیبوں سے وابستہ اداکاروں کو بیک وقت مجتمع کر دیتا ہے تو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے استحکام میں اس کا یہ کردار ناقابل فراموش ہو جاتا ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ پروفیسر محمد کاظم بیک وقت ڈراما نگار اور ہدایت کار ہی نہیں بلکہ ڈرامے کے محقق اور ناقد بھی ہیں۔ توسیعی خطبے کے کنوینر پروفیسر عمران احمد عندلیب نے کہا کہ ڈرامے کے حوالے سے پروفیسر محمد کاظم کا علم محکم بھی ہے اور مسلم بھی۔ وہ ڈرامے کا عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اظہار تشکر کے فرائض انجام دیتے ہوئے شعبے کے استاذ ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی نے کہا کہ مہمان مقرر نے خطبے میں پارسی تھیٹر کے بعد سے 75 سالہ ڈرامے کی تاریخ سمیٹ دی اور یہ خطبہ طلبا کے لیے نہایت مفید تھا۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 5 مارچ 2023

اردو، فارسی زبان کی اہمیت

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام چار ماہی آن لائن اردو، فارسی کلاسز کا تیسرا سیشن گذشتہ پہلی جنوری سے جاری ہے۔ ان کلاسز کے طلبا کے لیے خصوصی لکچر بعنوان 'اردو، فارسی زبان کی اہمیت' کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے جناب راجندر سنگھ اروڑہ دلدار دہلوی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے ان طلبا کے لیے آن لائن کلاسز کا اہتمام کیا جو اپنی مصروفیت کی وجہ سے آف لائن کلاس جوائن نہیں کر سکتے لیکن ان کے دل میں اردو فارسی سیکھنے کی خواہش ہے۔ اس پروگرام کی مہمان مقرر پروفیسر ہر پریت کور (پرنسپل ماتا سندری کالج، دہلی) نے کہا کہ اردو اور فارسی زبان کا تعلق ہماری ثقافت اور معاشرت سے بہت گہرا ہے۔ ہم صبح سے شام تک نہ معلوم کتنے الفاظ ایسے بولتے ہیں جن کا بنیادی تعلق فارسی سے ہے لیکن اب وہ ہماری زبان کا حصہ ہیں۔ انسان جتنی زیادہ زبانیں سیکھتا ہے اس کی شخصیت میں اتنا ہی نکھار اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں اردو فارسی کلاسز کی روایت نئی نہیں ہے۔ یہاں پہلے بھی کلاسز ہوتی تھیں جن میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں اور انھیں بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا کہ اب آن لائن کلاس کا اہتمام کیا جائے۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ ہم ان کلاسز کا ایک مشترک اجلاس بھی کرتے ہیں جیسا کہ آج کیا جارہا ہے۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی جناب بلبیر مادھوپوری نے کہا کہ اردو اور فارسی کو سمجھے بغیر ہم اپنے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے آج اس پروگرام میں شریک ہو کے بہت خوشی ہوئی کہ اتنی بڑی تعداد میں طلبا اردو اور فارسی سیکھ رہے ہیں جن میں غیر ملکی طلبا بھی شامل ہیں۔ اردو فارسی کلاس کے استاد طاہر الحسن نے کہا کہ میں نے اس سے پہلے بھی اردو فارسی پڑھائی ہے لیکن غالب انسٹی ٹیوٹ میں پڑھانے کا تجربہ بالکل مختلف ہے۔ میں آن لائن کلاس میں شریک ہونے والے طلبا میں الگ قسم کا جذبہ محسوس کرتا ہوں، اس کلاس میں ایسے افراد بھی شریک ہوتے ہیں جو اپنی نوکری سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ یہ اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ پروگرام میں آن لائن طلبا کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 11 فروری 2023

یوم غالب

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام بہ اشتراک غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی اور انجمن ترقی اردو ہند 'یوم غالب' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر چاروں اداروں کے سربراہان و اراکین اور محبان غالب نے غالب کے مزار پر گل پوشی اور فاتحہ خوانی کی۔ گل پوشی اور فاتحہ خوانی کے بعد غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جناب عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ غالب اردو شاعری کا تابندہ ستارہ ہے، اردو شاعری پر ان کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ استقبالیہ کلمات اقبال مسعود فاروق نے ادا کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہر سال یوم غالب کا اہتمام کرتے ہیں اور اس موقعے پر ان مفکرین کو مدعو کرتے ہیں جن کے افکار و خیالات علمی دنیا میں وقار رکھتے ہیں۔ جناب متین امروہوی نے مرزا غالب اور بیگم حمیدہ سلطان کے لیے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب کا کلام ہماری آزمائش بھی کرتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ نئی نسل غالب کا نام صرف فیشن کے طور پر نہ لے بلکہ اس کے اصل جوہر سے بھی واقف ہو۔ اس موقعے پر جناب جگمیت نوربو خیال لداخی کے مجموعہ کلام کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ اس کے بعد ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس کی صدارت جناب وقار مانوی اور نظامت جناب معین شاداب نے فرمائی۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 فروری 2023

انجمن محافظ اردو دہلی کی نشست

نئی دھلی: انجمن محافظ اردو دہلی اور محبان اردو کی نشست زیر صدارت انجمن محافظ اردو بہار گیا کے جنرل سکریٹری سید فضل وارث منعقد ہوئی جس کی نظامت عبدالباری قاسمی جنرل سکریٹری انجمن محافظ اردو دلی اکائی نے کی۔ اس نشست کے مہمان خصوصی معروف شاعر اشہر ہاشمی اور حافظ سعید اصدق تھے۔ اشہر ہاشمی، عشرت ظہیر، حافظ سعید اصدق، ڈاکٹر خان محمد رضوان، محمد تاج الدین، اشفاق احمد سیف نے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان نے حاضرین کو بتایا کہ گزشتہ 10 فروری کو انجمن کی منعقدہ نشست میں فیصلہ لیا گیا تھا کہ شاہین باغ اور ابوالفضل علاقہ کی مساجد کے ائمہ حضرات سے بالمشافہ گفتگو کر کے ان سے درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن خطبہ اور خطابت کے دوران اردو سماج کو ترغیب دی جائے کہ اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھیں اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو اردو کی بھی تعلیم دیں یا اس کا نظم کریں۔ عشرت ظہیر نے کہا کہ مدارس اور مکاتب میں لازمی طور پر اردو کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے۔ حافظ سعید اصدق نے کہا کہ بچوں کی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم پر بھی توجہ دی جائے، یہ کام پہلے اپنے گھر سے شروع کیا جائے۔ اشہر ہاشمی نے کہا کہ مجھے خوشی اس بات کی ہو رہی ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت کے تعلق سے دہلی میں نہایت ہی اہم نشست ہو رہی ہے، جب کہ اس طرح کی نشست دوسرے صوبوں میں بھی ہونی چاہیے کیونکہ اردو کے مسائل دوسرے صوبہ میں بھی ہیں۔ سید فضل وارث نے کہا کہ میں مبارک باد دیتا ہوں اشہر ہاشمی کو کہ موصوف ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی اس انجمن میں شامل ہو کر اردو کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ فضل وارث نے مزید کہا کہ اردو کی محافظت کے لیے متحد ہو کر زمینی سطح پر پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے اس کے لیے فعال نوجوان کو آگے آنا ہوگا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری عبدالباری قاسمی کے شکریہ کے بعد نشست کا اختتام ہوا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 14 فروری 2023

ڈاکٹر ذاکر حسین: حیات و خدمات

نئی دھلی: سابق صدر جمہوریہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کے 126 ویں یوم پیدائش کی یاد میں 'ڈاکٹر ذاکر حسین: حیات و خدمات' کے موضوع پر ڈاکٹر ذاکر حسین سینٹرل لائبریری میں ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ذاکر مرحوم سے متعلق حاشیہ نگاری کی فہرست کے ساتھ عالمانہ مضامین و مقالات بعنوان: ڈاکٹر ذاکر حسین: کتابیات کا بھی اجرا کیا گیا۔ ڈین، اسٹوڈینٹس ویلفیئر پروفیسر ابراہیم نے آفیشیٹنگ یونیورسٹی لائبریرین ڈاکٹر سفیان احمد، اسٹاف اور دیگر مہمانوں کی موجودگی میں نمائش کا افتتاح کیا۔ پروفیسر ابراہیم نے کہا کہ وہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے روایتی اور جدید تعلیم دونوں کو ہم آہنگ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بطور علمی ہستی، سیاست داں اور فلاح کار کے ملک اور سماج کے لیے جو اہم خدمات انجام دی ہیں انھیں ڈاکٹر سفیان احمد نے اجاگر کیا۔ آرکائیو کی تصاویر کے توسط سے ذاکر صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اور بطور شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ماہر تعلیم اور سوشل سائنٹسٹ ان کی جو خدمات رہی ہیں ان کو نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ نمائش میں رکھی گئی کتابوں سے پی ایچ ڈی تھیسس، ان کی تقاریر اور خطابات سمیت ان کی ادبی خدمات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 10 فروری 2023

نشریاتی ادب: ریڈیو سے پوڈ کاسٹ تک'

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام معروف ریڈیو صحافی اور پروڈیوسر ریڈیو جامعہ، ایم سی آر سی، جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے 'نشریاتی ادب: ریڈیو سے پوڈ کاسٹ تک' کے زیر عنوان توسیعی خطبہ دیا۔

انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ اردو میں نشریاتی ادب کے سو سال مکمل ہونے کو ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں ریڈیو کا سارا نظم و نسق انھیں کے رہنما خطوط پر چلتا رہا۔ جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ہندوستان کے حصے میں دہلی، ممبئی، کلکتہ، مدراس، لکھنؤ اور ترچناپلی کے ریڈیو اسٹیشن آئے، لیکن آج ہم نشریات میں ترقی کرتے ہوئے اس منزل پر آپہنچے ہیں کہ اب ہمارے پاس 470 ریڈیو اسٹیشن ہیں، جہاں سے روزانہ 23 زبانوں اور 180 بولیوں میں نشریات کا اہتمام ہوتا ہے۔ دوسری جانب ہماری بیرونی نشریات سے 15 ہندوستانی زبانوں اور 12 غیر ملکی زبانوں میں پروگرام پڑوسی اور دیگر ممالک کے لیے نشر کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی سروس اردو سروس ہے۔ انھوں نے مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ نشریاتی ادب کے معماروں میں اردو کے بڑے بڑے ادیبوں کا کردار رہا ہے، جن میں رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ابوسعید قریشی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور خواجہ حسن نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعد کی نسل میں اردو مجلس کی نشریات میں رفعت سروش، محمود ہاشمی، معین اعجاز اور قیوم نظر جیسے لوگوں نے اردو پروگراموں کو ایک نئی بلندی عطا کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ توسیعی خطبے کے لیے ایسے مقرر کو مدعو کیا جائے جو اپنے میدان کے ماہر ہوں، کیونکہ کتاب پڑھ کر علم حاصل کرنا اور عملی زندگی میں اس کا تجربہ کرنا دونوں میں فرق ہے۔ شعبۂ اردو کے ہال 2 میں منعقدہ توسیعی خطبے کے کنوینر ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ آج کا موضوع اور مقرر دونوں ہی بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر محمد شکیل اختر کا شمار ہندوستانی کے ممتاز ریڈیو صحافیوں میں ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ان

کی متعدد گراں قدر تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اظہارِ تشکر کے فرائض شعبے کی استاد ڈاکٹر غزالہ فاطمہ نے انجام دیتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے کہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام اہم موضوعات پر معروف علمی وادبی شخصیات کے توسیعی خطبات کی زریں روایت رہی ہے۔ اس موقع پر شعبہ کے اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز اور طلبا وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2023

75 برس میں غالب تنقید

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کے زیرِ اہتمام آزادی کے بعد 75 سال میں غالب تنقید پر ایک نیشنل سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر وہاج الدین علوی نے اپنے مقالے میں کہا کہ 75 سال میں غالب پر بہت کام ہوا ہے۔ وہ معنی آفرینی کے شاعر تھے۔ انھوں نے غالب کے شارحین اور ناقدین کا خصوصی ذکر کیا۔ شمیم طارق نے اپنے مقالے میں کہا کہ 75 سال میں غالب تنقید کے سب سے اہم نقاد شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ دوسرے گوپی چند نارنگ کی کتاب بھی بہت اہم ہے۔ غالب نے سرسید اور شبلی دونوں کو متاثر کیا تھا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب کا اصل ماخذ بیدل ہے۔ گوپی چند نارنگ غالب پر لکھتے ہوئے حالی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ پہلے اجلاس میں شاداب تبسم نے اسلوب احمد انصاری کی غالب تنقید پر مقالہ پڑھا۔ خوسے مورالیس نے کہا کہ مغرب کے لوگ فارسی اصطلاحات اور تلمیحات کو نہیں سمجھتے ان کا ترجمہ اسپینش میں ممکن نہیں ہے جب کہ اسلامی اصطلاحات اور تلمیحات کو سمجھانے میں دشواری نہیں ہوتی۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی، انھوں نے کہا کہ غالب کا زورِ معنی کو چھپانے میں تھا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے آل احمد سرور کی غالب تنقید پر بولتے ہوئے کہا کہ آل احمد سرور نے غالب پر پچیس مضامین لکھے۔ ترجمے وتبصرے الگ ہیں۔ اپنی تنقید میں انھوں نے حالی سے مکالمہ قائم کیا ہے۔ سرور صاحب کے مطابق غالب کی عظمت متروک کلام کی وجہ سے ہے۔ سرور صاحب نے غالب کے متن پر گفتگو کی ہے۔ سرور کی تنقید امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ دوسرے اجلاس میں حنا آفرین اور صالحہ عاصم نے شمیم حنفی کی غالب تنقید پر مضمون پڑھا، کیلاش وششٹھ سمیر نے ہندی میں غالب تنقید اور ڈاکٹر گیتانجلی کالا نے انگریزی غالب تنقید پر مقالہ پڑھا اور ڈاکٹر خالد علوی نے غالب کے کم معروف ناقدین پر مقالہ پڑھا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 فروری 2023

ہندوستانی زبانوں میں تحقیق اور علمی تحریر

نئی دھلی: شعبہ ایجوکیشنل اسٹڈیز، فیکلٹی آف ایجوکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے 'ہندوستانی زبانوں میں تحقیق اور علمی تحریر' کے موضوع پر سہ روزہ وغیراقامتی ورکشاپ منعقد کی۔ ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں ایجوکیشنل فیکلٹی کے ڈین اور اجلاس کی صدر پروفیسر سارہ بیگم نے صدارتی خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی زبانوں میں تحقیق کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ خود میں توانائی بھر پائیں۔ ایجوکیشنل اسٹڈیز جامعہ کے شعبہ صدر ڈاکٹر ارشد اکرام نے کہا کہ تعلیم کے نوآبادیاتی کردار کو تعلیم کے قومی کردار میں تبدیل کرنے کے تناظر میں ان کے شعبے نے پہل کی ہے۔ اس سے ہندوستانی زبانوں میں تحقیق کو فروغ دے کر یونیورسٹی کامیابی کی نئی اونچائیاں حاصل کرسکتی ہے۔ افتتاحی اجلاس میں سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکشن دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر نیرانارنگ مہمان اعزازی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف تحقیق نہیں بلکہ عالمی سطح پر پورا کا پورا نظام تعلیم ہندوستان کے نظامِ تعلیم سے استفادہ کرسکتا ہے۔ اگنو کے پروفیسر اربند کمار جھا نے بطور کلیدی مقرر کے ریسرچ پیراڈائم پر اپنی گفتگو مرکوز رکھی۔ بھاتیہ بھاشا سمیتی کی اکیڈمک کوآرڈینیٹر ڈاکٹر چندن سریواستون ورکشاپ کے مہمان اعزازی تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس کام کے لیے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کو فنڈ فراہم کیا جاتا ہے تاکہ این ای پی 2020 کے مقاصد واہداف کو حاصل کیا جاسکے۔ شعبۂ ایجوکیشنل اسٹڈیز کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سجاد احمد نے ورکشاپ کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ انھوں نے بتایا کہ ملک کی 33 یونیورسٹیوں سے شرکا نے رجسٹر کرایا تھا لیکن محدود سیٹیں ہونے کی وجہ سے سبھی کو مدعو نہیں کیا جاسکا۔ اختتامی اجلاس میں ایم جی اے ایچ وی، وردھا کے پروفیسر گوپال کرشنا مہمان خصوصی تھے۔ شعبہ کے فیکلٹی کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومنٹ انعام سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2023

اصطلاحاتِ موسیقی اور اردو لغات

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام معروف ادیب ڈاکٹر شفق سوپوری نے 'اصطلاحات موسیقی اور اردو لغات' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش

کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں لغات اور فرہنگوں کے مؤلفین نے اصطلاحات موسیقی سے یا تو یکسر صرف نظر کرلیا یا محض اس کے لفظی معنی بیان کردیے یا اس کی غلط تفصیلات فراہم کیں۔ یہ صورت حال فرہنگ آصفیہ اور نوراللغات جیسے معتبر ومستند لغات ہی نہیں بلکہ اردو لغات کی روایت میں سب سے زیادہ منظم ومنصوبہ بند ادارہ اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی، پاکستان کے ذریعہ مرتب کردہ 'اردو لغت (تاریخی اصول پر)' کی بھی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں علم موسیقی کی روایت تحریر کے بجائے سینہ بہ سینہ چلتی رہی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں علم موسیقی کے بہت سے رموز ونکات صدیوں کے دھندلکے میں کھو گئے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ ہمارے زمانے میں علم موسیقی کے حوالے سے ایسی گہری آگہی شاید ہی کسی اردو والے کو ہو جیسی نظر ڈاکٹر شفق سوپوری رکھتے ہیں۔ اصطلاحات موسیقی کے سلسلے میں شفق سوپوری نے غیرمعمولی تحقیقی دقت رسی کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کے ان کارناموں کو اردو دنیا نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ خطبے کے کنوینر ڈاکٹر شاہ عالم نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر شفق سوپوری ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، فکشن نگار، محقق اور ناقد سبھی کچھ ہیں۔ اظہار تشکر کے فرائض انجام دیتے ہوئے شعبے کے استاذ ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے کہا کہ شعبۂ اردو میں توسیعی خطبات کی نہایت گراں قدر اور موقر علمی وادبی روایت رہی ہے اور ہم نے اس سلسلے میں نہایت ممتاز شخصیات سے استفادہ کیا ہے۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مارچ 2023

اردو صحافت کا مستقبل

نئی دھلی: مجدد آئی او ای سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر کے زیراہتمام 'اردو صحافت کا مستقبل' کے موضوع پر مجلس گفتگو کا انعقاد آئی او ایس کے دفتر میں کیا گیا، جہاں ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز ایڈیٹر ہفت روزہ گواہ حیدرآباد نے اپنے

خطبے میں کہا کہ ہندوستان میں اردو صحافت کا مستقبل تو ہے لیکن یہ ہماری دیانت داری اور محنت پر منحصر ہے۔ اردو صحافت خوف کی صحافت رہی ہے اور اسی نے اسے تباہ کیا۔ ضرورت ہے کہ خوف کی سیاست اور خوف کی صحافت سے ہم نکلیں۔ اردو ایک بڑی آبادی کی زبان ہے اور یہ آبادی جب تک اس زبان کو لکھتی پڑھتی اور بولتی رہے گی اس کی صحافت بھی زندہ رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں بھی روزگار اور صحافت کے شعبے میں روزگار کے مواقع بڑھے ہیں۔ حیدرآباد میں اردو کے اخبارات بیرون ملک رہنے والے ہندوستانیوں کے لیے ملک اور معاشرے سے رابطہ کی زبان ہیں۔ عظیم اختر نے کہا کہ اردو صحافت کا مستقبل وہی ہے جو اردو کا مستقبل ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے وائس چیئرمین پروفیسر افضل وانی، انجم نعیم، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر ابرار رحمانی، سہیل انجم، ڈاکٹر مظفر حسین غزالی، احمد جاوید وغیرہ نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مارچ 2023

اتر پردیش

رام لعل: فکروفن

لکھنؤ: رام لعل نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اس وقت افسانہ نگاری میں کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت،

قاسمی کا دور تھا۔ ایسے جید افسانہ نگاروں کے درمیان اپنی شناخت قائم کر پانا بلاشبہ مشکل امر تھا لیکن رام لعل نے اپنے مخصوص موضوعات، فن، طرز ادائیگی، زبان و بیان کی سادگی، قصہ پن کی وجہ سے قارئین کے ذہنوں پر اپنی انفرادیت قائم کی۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ سیاسیات، لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر رمیش دیکشت نے معروف افسانہ نگار و ادیب رام لعل پر 3 مارچ کو منعقد ایک تقریب میں کیا۔ رام لعل کے یوم ولادت کے سو سال مکمل ہونے پر گومتی نگر، لکھنؤ واقع شیوروز پوائنٹ پر پروفیسر رمیش دکشت کی صدارت میں منعقد اس پروگرام میں بطور مہمان خصوصی سابق وائس چانسلر آئی اے ایس ڈاکٹر انیس انصاری نے رام لعل کے فکروفن پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ رام لعل مشرقی روایات واقدار کے حامل ایک روایتی افسانہ نگار تھے جنہوں نے اپنے افسانوں میں اپنی تہذیب و روایات کی نمائندگی کی۔ اس موقع پر اردو کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری کو بھی ان کی یوم وفات پر یاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں بطور مہمان ذی وقار ویر ونود چھابڑا نے اپنے والد کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے اپنے تاثرات ساجھا کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پتا جی کو اردو نے بہت شہرت دلائی۔ وہ اپنی محنت اور لگن کے بل پر اس شہرت اور مقبولیت کے حقدار تھے۔ ان کی اردو زبان سے بے پناہ محبت کا عالم یہ تھا کہ جب کوئی یہ کہتا کہ اردو ایک فرقے کی زبان ہے تو اس پر ان کو شدید غصہ آتا تھا۔ اسی غرض سے انہوں نے لکھنؤ میں 'غیر مسلم اردو رائٹرس کانفرنس' کی۔ اس کی پہلی کانفرنس 1976 اور دوسری 1981 میں منعقد ہوئی۔ وہ اردو کے خود دار اور بے لوث خادم تھے۔ سینئر صحافی عبید اللہ ناصر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ رام لعل نے ادب کے تئیں اپنی بے لوث اور غیر معمولی کوششوں کی بنا پر اردو افسانے میں ایک مستحکم مقام حاصل کیا۔ جب کبھی اردو ادب کے افسانہ نگاروں کا ذکر ہوگا تو رام لعل کا نام لیے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گا۔ بحیثیت مہمان اعزازی شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (لکھنؤ کیمپس) کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عشرت ناہید نے رام لعل کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ رام لعل نے اپنے افسانوں میں جن مسائل پر قلم اٹھایا انہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اپنے قارئین کے دل و دماغ میں اسی گہرائی سے اتار دیا۔ جواں سال ادیب ڈاکٹر مسیح الدین خان نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہ کہا کہ اب سے سو برس قبل پیدا ہونے والے رام لعل چھابڑا دراصل اردو کے سچے عاشق تھے۔ ان کو اردو زبان سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اس زبان کی فلاح و بقا کے لیے مہم چلائی تھی۔ اردو زبان و ادب کو ایسے مخلص اور بے لوث خادم بہت کم ہی ملے ہیں۔ اس سے قبل کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نزہت فاطمہ نے سبھی مہمانوں کا استقبال کیا اور آخر میں سبھی کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پروگرام میں پروفیسر وندنا مشرا، اصغر مہدی، پربھات ترپاٹھی سمیت اہم ہستیاں موجود رہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر مسیح الدین خان، لکھنؤ، 3 مارچ 2023

گورنمنٹ گرلز پی جی کالج میں سہ روزہ اردو خوشنویسی ورکشاپ

رامپور: گورنمنٹ گرلز پی جی کالج رامپور میں منعقدہ سہ روزہ اردو میں ماہرینِ خطاط نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرکے طالبات میں فن خوشنویسی کا ذوق پیدا کیا۔ پہلے دور کا آغاز کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رضیہ پروین نے کہا کہ خوشنویسی کا فن ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پرویز خان اسی کالج کی طالبہ رہی ہیں جو کیلی گرافی میں مہارت کے سبب آج بین الاقوامی سطح پر اپنے فن کے مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ان کی خطاطی کے خوبصورت نمونے بیرون ملک بھی فروخت ہو رہے ہیں جو ہمارے کالج کے لیے فخر کی بات ہے۔ ماہر خطاط راحت خاں نے نیزے کے قلم کے ذریعے طالبات کو کیلی گرافی کی اصطلاحات خط، نشست و کرسی اور نقطوں کو لکھنا سکھایا۔ اس موقعے پر ان کی خطاطی کے بہترین نمونے طالبات کو دکھائے گئے۔ طیبہ پرویز خان نے طالبات کو خط ثلث کی باریکیوں سے واقف کرواتے ہوئے اس کی مشق کروائی۔ پتھروں اور شیشوں پر خطاطی کے لیے مشہور و معروف شمشاد علی عزم نے کہا کہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر خطاطی کو ذریعہ معاش بنایا اور آج بھی ہم اس میدان میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عزم نے اپنی خوشنویسی کے مخصوص طرز میں ایک مخصوص آئیوری آرٹ پیپر پر طالبات کو حروف کو لکھنا سکھایا۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر افتخار احمد قادری المعروف الف ناظم نے ادا کیے۔ شعبۂ اردو کے استاد محمد قاسم نے کہا کہ کالج کی دیگر سرگرمیوں کے درمیان کیلی گرافی کی سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد عام بات نہیں ہے۔ کالج کی مصروفیات میں سے وقت نکالنا ازحد مشکل تھا مگر طالبات کی دلچسپیوں کے پیش نظر اسے کرنا لازمی تھا۔ اس موقعے پر ثمر ظفر نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا وہ گزشتہ برسوں میں منعقد ہونے والی سبھی ورکشاپ کا حصہ رہی ہیں اور اس سال بھی حصہ بن کر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ طالبہ آبلہ نور نے کہا کہ میرے پاس اردو بحیثیت مضمون نہیں ہے لیکن یہ اردو کی محبت ہے کہ مجھے اس ورکشاپ میں تینوں دن بہت کچھ سیکھنے کا

موقع حاصل ہوا جس کے لیے میں رضیہ میم کی ہمیشہ شکرگزار رہوں گی۔ طالبہ رشدیٰ خاتون نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو حروف کو خوبصورتی کے ساتھ لکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ طالبہ شبینہ نے کہا کہ تین دن میں کافی کچھ سیکھا لیکن اس قدر مفید اور کامیاب ورکشاپ صرف تین دن نہیں بلکہ پورے سال چلنا چاہیے تاکہ جی بھر کر سیکھا جاسکے۔ فیصل شاہ صاحب نے طالبات کو ڈھیر ساری مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 فروری 2003

مرثیہ نگاری میں لکھنؤ کے قلمکاروں کی اہمیت

لکھنؤ: مرثیہ کو فنی عروج دراصل لکھنؤ کے شعرا نے دیا ہے۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے دور سے پہلے عزاداری شروع ہو چکی تھی۔ اس سے قبل یہاں مجالس کا سلسلہ قائم تھا۔ انسان سازی کے عمل میں مرثیہ کا بہت بڑا رول

ہے۔ مرثیہ کے متعلق ان خیالات کا اظہار معروف ناقد اور محقق، استاذ الاساتذہ پروفیسر شارب ردولوی نے یونیک ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے اشتراک سے 'مرثیہ نگاری میں لکھنؤ کے قلمکاروں کی اہمیت' کے عنوان سے ایک سیمینار میں کیا۔ اس سیمینار کا انعقاد کیفی اعظمی اکیڈمی نشاط گنج لکھنؤ میں کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے کی۔ پروگرام میں بطور مہمانِ خصوصی اطہر صغیر تورج زیدی شامل ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ مرثیہ نے اردو کو زندہ رکھا ہے۔ یہ صرف مذہبی صنف نہیں بلکہ تہذیب وزبان کا مکمل سرمایہ ہے۔ یہ صنف ہماری تہذیبی اور ادبی وراثت ہے۔ میر انیس کے یہاں جنگ کی اخلاقیات کے آداب بخوبی ملتے ہیں۔ لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کے بغیر شاعری کا تصور بے جا ہے۔ اس سیمینار میں انجمن اصلاح المسلمین کے انچارج سید بلال نورانی اور کرامت حسین مسلم گرلز پی جی کالج کی صدر شعبۂ اردو پروفیسر شبنم رضوی نے بھی شرکت کی اور مرثیہ نگاری میں لکھنؤ کے قلمکاروں کی اہمیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقالہ نگاران میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ڈاکٹر مسیح الدین خان، شعبۂ اردو کرامت حسین مسلم گرلز پی جی کالج کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نزہت فاطمہ، ڈاکٹر روئیدہ خان، امیر الدولہ اسلامیہ ڈگری کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر یاسر انصاری، الہ آباد (پریاگ راج) سے ڈاکٹر سید انور صفی اور ریسرچ اسکالر غزالہ شیریں نے اپنے پُرمغز مقالات پیش کیے۔ پروگرام کے آخر میں یونیک ویلفیئر فاؤنڈیشن کی سکریٹری اور سیمینار کی کنوینر تبسم فاروقی نے سبھی مہمانان اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'صحافت' دہلی، 19 فروری 2023

لکھنؤ میں آل انڈیا اردو کانفرنس

لکھنؤ: اردو کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا کوئی عوامی ادارہ نہیں ہے، جہاں ہم سب مل بیٹھ کر

اس کے مسائل کو حل کرسکیں۔ یہ بات پروفیسر صفدر امام قادری نے عارف کیسل ہوٹل میں منعقد آل انڈیا اردو کانفرنس میں اپنے کلیدی خطبے میں کہی۔ کانفرنس کا اہتمام اردو فاؤنڈیشن آف انڈیا اور نجب النسا میموریل ٹرسٹ سے جڑے اراکین سید حسن مہدی، تحسیر احمد، احرار الہدیٰ شمس، محمد راشد خاں ندوی، نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے اشتراک سے کیا تھا، جس میں ملک کی مختلف ریاستوں اور اہم یونیورسٹیوں سے آئے پروفیسر حضرات اور دانشوران نے شرکت کی اور اردو کی موجودہ صورت حال اور اس کی ترقی کے لیے مربوط لائحہ عمل کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عباس رضا نیر نے انجام دیے۔ کانفرنس میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین تورج زیدی اور اسلامک سنٹر آف انڈیا کے چیئرمین مولانا خالد رشید فرنگی محلی اور مولانا ڈاکٹر یعسوب عباس نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹیز اور کالجوں کے شعبہ اردو میں رابطہ کی بہت کمی ہے۔ اردو کے فروغ میں یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کو کلیدی کردار ادا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے تمام شہروں میں غیر اردو حلقوں میں ایسے مراکز کی ضرورت ہے جہاں اردو سکھائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک سچائی ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس سچائی کو بار بار دہراتے رہنا چاہیے۔

پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو کا منظر نامہ وہ نہیں ہے جو دبستان لکھنو اور دبستان دہلی کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرکاروں کے سہارے کوئی بھی زبان کب تک زندہ رہ سکتی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے عوام کو خود کوشش کرنی ہوگی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ انسانی ذہنیت ہی اردو زبان کو پیچھے لے گئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے ہم انجمنیں قائم کر کے اردو کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ایڈیٹر اینڈ گروپ ایڈیٹر جناب عبدالماجد نظامی نے آل انڈیا اردو کانفرنس کے مرکزی موضوع 'اردو کی موجودہ صورت حال اور اردو کی ترقی کے لیے مربوط لائحہ عمل' پر پُرمغز گفتگو کرتے ہوئے اردو کی ترویج وترقی کے لیے مفید مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان اس وقت تک نہیں مر سکتی جب تک ہماری امید اور حوصلہ نہیں مرتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ اردو اخبارات ورسائل کو خرید کر ضرور پڑھیں، تبھی ہم اردو کو باقی رکھ سکتے ہیں۔

جے این یو کے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ ہندوستان کی تہذیب وثقافت نے جس زبان کو وجود بخشا وہ صرف اور صرف اردو ہے۔ اردو رابطے کی زبان ہے اور دنیا میں سب سے تیزی سے مقبول ہونے والی زبان ہے، انھوں نے کہا کہ ہمیں ٹیکنالوجی کا سہارا لینا چاہیے، اس سے ہماری زبان میں مضبوطی پیدا ہوگی۔ اے ایم یو کے پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ پروفیسر صفدر امام نے اردو شعبوں میں رابطہ کمیٹی کی جو بات کہی وہ صد فیصد درست ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے بعد اردو نصاب کی تیاری کے دوران رابطہ کی اس کمی کو بہت محسوس کیا گیا۔

مانو، حیدرآباد کے پروفیسر شمس الہدیٰ نے دکن میں اردو کی ادبی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ نووودے ودیالیہ اور کیندریہ ودیالیہ کے طرز پر تلنگانہ

میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔معروف نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ زبانیں جذباتی نعروں سے زندہ نہیں رہتیں بلکہ اس کے لیے عملی اقدامات ضروری ہیں۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو زبان کو بچانے کے لیے کوئی تحریک بچی ہی نہیں ہے۔ کسی بھی زبان کو اس کے رسم الخط کے بغیر زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔

ڈاکٹر جانکی پرساد (دہلی) نے کہا کہ اردو زبان و ادب میں مسلمانوں کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ یہ کوئی ثابت کرنے والی چیز نہیں ہے۔اردو زبان وادب کا فروغ جمہوریت کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔ سید عباس رضوی (کشمیر) نے کہا کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے ہمیں خود کوشش کرنی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ اردو زبان کی راجدھانی ہے۔ سینئر صحافی وائس آف امریکہ کے سہیل انجم نے کہا کہ اخباروں اور رسالوں کی تعداد میں کمی ہوتی جارہی جو باعث حیرت ہے، زبان وبیان کی خرابیاں اگر دور ہوجائیں تو سوشل میڈیا سے اردو کو بہت فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔ بی ایچ یو کے ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے کہا کہ ہم اپنی مادری زبان کو بھولتے جارہے ہیں۔ مردم شماری میں ہمارا صحیح تناسب ہی نہیں ہے۔

مصطفیٰ علی خاں ادیب الہندی نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، اور ہمارے گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اگر یہ گھروں سے چلی جائے تو اسے بچانا مشکل ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے سینئر استاد مولانا علاؤالدین ندوی نے کہا کہ اردو زبان کا مسئلہ قوم کی بقا کا ہے، ادب ہر انسان کی بنیادی ضرورت نہیں ہے لیکن زبان بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا فضیل ناصری (دیوبند) نے ہندوستان کے مدارس میں اردو کا تعلیمی نظام، کالی کٹ یونیورسٹی کیرالہ کے پروفیسر مبین الحق نے کیرالہ میں اردو کی صورت حال، ڈاکٹر حسان نگرامی نے طبیہ کالجوں میں اردو کی صورت حال، اے ایم یو کے ڈاکٹر قمر عالم نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب شاعری کے حوالے سے اور مولانا محمد توصیف عالم نے بہار میں اردو کا منظرنامہ موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ مہدی حسن نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقع پر پرویز ملک زادہ، سید عاصم رضا، سہیل وحید، ضرغام الدین، اویس سنبھلی، نثار احمد، محمد سعید اختر، مجتبیٰ حسن صدیقی، مشکور عالم، احرار الحق، مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی، مفتی منور سلطان ندوی، شاہد حبیب فلاحی، محمد مظہر الحق، ڈاکٹر شبنم رضوی، رفیع احمد، محمد جاوید اختر، ضیاء اللہ صدیقی، ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی، ڈاکٹر مسیح الدین خاں، ڈاکٹر ریشماں پروین، ڈاکٹر نزہت پروین، رویدا خاں، ریسرچ اسکالر صائمہ ثمرین، ڈاکٹر جاں نثار، تبسم فاروقی، ڈاکٹر سلیم ملک، قاری رضی الدین، مولانا نوراللہ، محمد عمران خان، حافظ دانش قمر، مصباح الہدیٰ، کاشف رضا، قیصر رضا، قمرالزماں ندوی، مفتی محمد علی نعیم رازی، محمد فیروز ایڈوکیٹ، رفیع احمد سمیت سیکڑوں محبان اردو موجود رہے۔

پریس ریلیز: لکھنؤ، 20 فروری 2023

قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فن

وارانسی: قرۃ العین حیدر نہ صرف ایک شخصیت ہیں بلکہ وہ ایک انسٹی ٹیوٹ کا درجہ رکھتی ہیں۔ 'آگ کا دریا' اور قرۃ العین لازم وملزوم ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'آگ کا دریا' کو اس قدر مقبولیت اور شہرت ملی کہ قرۃ العین حیدر کی دوسری تخلیقات پس پشت چلی گئیں۔ ان خیالات کا اظہار یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فن' میں پروفیسر آفتاب احمد آفاقی صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطبہ کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ قرۃ العین حیدر نے دو سطحوں پر کام کیا ہے۔ انھوں نے روایتوں کو توڑا بھی اور نئی روایتیں بھی قائم کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے قلمکار کی شکل میں دنیا کے سامنے آئیں کہ انھیں ایک طرح سے انسٹی ٹیوٹ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس سمینار کا انعقاد بنارس ہندو یونیورسٹی کے مہیلا مہاودیالیہ (ایم ایم وی) کے اردو سیکشن کے زیر اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ہندی کے معروف ادیب پروفیسر بلراج پانڈے نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کے حوالے سے مختلف پہلوؤں، کرداروں، تہذیبی عناصر اور اسالیب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی ادبی حیثیت کو پیش کیا۔ ایم ایم وی پرنسپل پروفیسر انومہتا کی سرپرستی میں منعقد اس سمینار میں افتتاحی خطبہ پروفیسر ریتا سنگھ سوشولوجی سیکشن، ایم ایم وی نے پیش کیا۔ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر افضل مصباحی نے قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور ان کے فن کا تعارف پیش کیا۔ چار اجلاسوں پر مشتمل اس یک روزہ قومی سمینار میں صدارت کے فرائض پروفیسر رفعت جمال، پروفیسر تعبیر کلام اور ڈاکٹر شاہینہ رضوی نے انجام دیے اور ڈاکٹر مشرف علی، ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر احسان حسن، ڈاکٹر قاسم انصاری، ڈاکٹر عبدالسمیع، ڈاکٹر لئیق احمد، ڈاکٹر شمس الدین، تسنیم قمر، محمد شہنواز انصاری، ذبیح اللہ، محمد عامر اور آصف جمال نے الگ الگ موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس میں خصوصی خطبہ ڈاکٹر اروشی گہلوت نے پیش کیا، جب کہ چیئرپرسن کے طور پر پروفیسر سمن جین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مختلف اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر مشرف علی، شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالرز محمد اعظم اور کمال الدین نے انجام دیے، جب کہ اظہار تشکر کے فرائض طبلہ و ڈانس شعبۂ کی پروفیسر لیلینا بھٹ، پروفیسر ریچا کمار، عائشہ پروین اور نسرین جہاں نے انجام دیے۔ پروگرام میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، طلبا کے علاوہ شہر بنارس کی علمی ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2023

اردو افسانچہ کی روایت

میرٹھ: ''افسانچہ کے ساتھ ہمیں کہاں تک انصاف پسند ہونا چاہیے، ہمیں یہ سوچ کر افسانہ نہیں چھوڑ دینا چاہیے کہ یہ ایک مختصر کہانی ہے اس سے ہم محدود ہوکر رہ جاتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ کا موضوع آپ کے لیے سب سے اہم ہے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب وشاعر عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو اور آیوسا کے ذریعے منعقد ہفتہ واری ادب نما پروگرام میں 'اردو افسانچہ کی روایت' کے موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔

پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ جب کہ مقررین کی حیثیت سے آیوسا کی صدر ڈاکٹر ریشما پروین، لکھنؤ، ڈاکٹر ریاض توحیدی، کشمیر، تنویر اختر رومانی، جمشید پور، ارشد منیم، پنجاب اور علیم

اسماعیل، ناندیڑ نے شرکت کی۔خصوصی مقرر کے بطور معروف افسانچہ نگار رونق جمال نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے ادا کی۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اختصار میں وہ خوبی ہے جو افسانچہ کو منفرد بناتی ہے۔ ناول سے ہم ناولٹ کی جانب آئے پھر ناول سے افسانہ اور افسانچہ کی جانب آئے۔ اردو میں افسانچے کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ منٹو نے سب سے پہلے افسانچے 'سیاہ حاشیے' لکھے۔ ایم اے حق، رونق جمال وغیرہ نے بچوں کے لیے بھی افسانچے لکھے۔ آج بہت سے لوگ افسانچوں کے نام پر لطیفے لکھ رہے ہیں۔ یہ افسانچے کے ساتھ مذاق ہے۔ اختصار، قصہ پن اور چونکانا افسانچے کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ معروف افسانچہ نگار علیم اسماعیل نے کہا کہ آج بہت سے افسانچے ایسے بھی پڑھنے میں آتے ہیں جن میں کہانی پن دکھائی نہیں دیتا۔ بہت کم افسانچے ایسے ہوتے ہیں جنہیں معیاری کہا جاسکتا ہے۔ پنجاب سے ارشد منیم نے کہا کہ آج کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں لوگ افسانچوں میں خوب دلچسپی لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے کہا جس طرح شاعری میں انسانی زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے اسی طرح فکشن میں سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل کو پیش کیا جاتا ہے۔ فکشن میں دیگر اصناف کی مانند افسانچہ نگاری میں بھی سماجی، سیاسی مسائل کی تصاویر ملتی ہیں۔ ڈاکٹر تنویر اختر رومانی نے کہا کہ آج افسانچے نے اپنے فن میں اضافہ کردیا ہے۔ رونق جمال نے کہا کہ منٹو کے بعد افسانچہ کچھ دن تک آرام کرتا رہا اس کے بعد رتن سنگھ، جوگندر پال نے اسے آگے بڑھایا اور ہم تک پہنچایا، 2019 میں کرونا نے بہت سی اصناف کو متاثر کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے افسانچہ ایکسپریس وے پر دوڑنے لگا۔ ڈاکٹر ریشما پروین نے کہا کہ ہمیں افسانچے پر تہہ داری سے نظر ڈالنی چاہیے کیونکہ آج افسانچوں میں کہانی کم نظر آرہی ہے۔

پروگرام میں سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد، فیضان ظفر، عظمی پروین، وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز: محمد علیم اسماعیل، ناندیڑ، مہاراشٹر، 18 فروری 2023

مذہبی ہم آہنگی کے فروغ میں سوامی وویکانند اور مولانا آزاد کا کردار

لکھنؤ: مولانا آزاد میموریل اکیڈمی کی جانب سے مولانا آزاد کی برسی کے موقعے پر ایک سمینار کا انعقاد زیرعنوان 'مذہبی ہم آہنگی کے فروغ میں سوامی وویکانند اور مولانا آزاد کا کردار' کیفی اعظمی اکیڈمی میں ہوا۔ جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے امام عیدگاہ مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے کہا کہ اس وقت سوامی ویویکانند اور مولانا آزاد کی تقریر اور تحریر خصوصاً شکاگو میں وویکانند جی کی تقریر کو عملی شکل میں لانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے قومی یکجہتی کے سلسلے میں مولانا آزاد اور سوامی ویویکانند کی تعلیمات کو عام کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر ہیرا سنگھ نے دونوں کی تعلیمات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی علمی کاوشوں کا ذکر کیا۔ جناب دنیش سنگھ نے کہا کہ مولانا اور وویکانند ہندوستان کے بڑے رہنماؤں کو آج کے حالات میں یاد کرنا بہت ضروری ہے جس سے موجودہ نسلوں میں نفرت کو محبت میں بدلا جاسکتا ہے۔ جناب دیپ پانڈے نے کہا کہ ہم سب کو اپنی زندگی کا تجزیہ کرنا چاہیے اور اگر ہمارے کہنے اور کرنے میں فرق ہے تو ہم کبھی مذہبی نہیں ہوسکتے۔ پروفیسر جمشید قمر نے کہا کہ مولانا انسان دوست اور ساتھ ہی انسانیت پسند تھے اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر مذہب کی بنیادی سچائی ایک تھی جس کو انسانوں نے بانٹ دیا۔ اس موقعے پر صبا اقبال کی کتاب 'مولانا آزاد اور مذہبی وحدانیت' کا اجرا ہوا۔ سمینار کی نظامت اکیڈمی کے سکریٹری عبدالقدوس ہاشمی نے کی اور شکریہ صدر شارق علوی نے ادا کیا۔ اس موقعے پر معززین شہر کی کثیر تعداد کے علاوہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی سنٹر انچارج، کرامت، ممتاز، اسلامیہ کالج کے پرنسپل و اساتذہ، اور لکھنؤ کے ذمہ دار حضرات، صحافی، ادبا، شعرا، علما و دانشور حضرات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی 23 فروری 2023

بہار

پروفیسر سید شاہ حسین احمد کی علمی وادبی خدمات

آرا: ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرا کی المونائی ایسوسی ایشن کی جانب سے 24 فروری کو ایک قومی سمینار منعقد ہوا جس کا موضوع تھا 'پروفیسر سید شاہ حسین احمد کی علمی وادبی خدمات' اس قومی سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر سی ایس چودھری نے سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ حسین احمد جتنے بڑے دانشور ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے یونیورسٹی کا نام ملک کے کونے کونے کے علاوہ بیرون ملک میں بھی پہنچایا۔ ہمیں فخر ہے کہ حسین احمد ہماری یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ یونیورسٹی کے ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر رنوجے کمار نے ڈاکٹر حسین احمد سے اپنے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حسین احمد ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ انجمن و ادارے کا نام ہے۔ ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کی تاریخ کے ہر دور میں وہ یاد کیے جائیں گے۔ حسین احمد جیسے دانشور ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور برہم پور آشرم کے مہنت پروفیسر دھرمندر مہاراج جی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ حسین احمد کو جب ہم نے قریب سے دیکھا تو ہمیں اسلام کا صحیح مفہوم اور اس کی خوبصورتی سمجھ میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ حسین احمد اسلام کے سچے پیروکار ہیں۔ آج ان کے جیسے مخلص اور ایماندار اساتذہ کی ضرورت ہے۔ پروفیسر جمیل اختر (شعبۂ اردو و فارسی ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا) نے اپنا کلیدی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ حسین احمد کی شخصیت میں ایک خاص کشش ہے جو ان سے ملتا ہے وہ انہی کا ہوجاتا ہے۔ انھوں نے پروفیسر حسین احمد کی علمی اور ادبی خدمات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے طلبا و طالبات کو ان کے جیسا بننے کا مشورہ دیا۔ افتتاحی سیشن میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدر شعبہ فارسی پروفیسر حسن عباس نے کہا کہ حسین احمد اچھے استاد بھی ہیں اور بہت ہی اچھے محقق بھی، تحقیق کے میدان میں انھوں نے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے بعد دو ٹیکنیکل سیشن ہوئے۔ پہلے سیشن میں حقانی القاسمی نے پروفیسر سید شاہ حسین احمد کی محققانہ تحریروں کا جائزہ لیا اور کہا کہ پروفیسر حسین احمد کی 'فاعتبروا' اور 'بہار

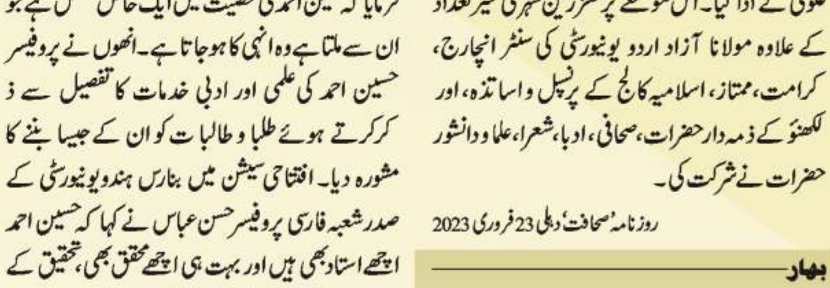

میں اردو شاعری' معیاری تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ 'فاعتبروا' میں جو مضامین ہیں اسے دیکھ کر انھیں شخصیت شکن محقق کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر زین رامش (شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ)، ڈاکٹر اجے مالوی (الہ آباد)، ڈاکٹر ریحان غنی (چیف ایڈیٹر عوامی نیوز پٹنہ ایڈیشن)، پروفیسر توقیر عالم، سید وسیم اللہ بخاری، آصف اختر، محمد سعید سمیت ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر نے اپنے مقالے پیش کیے اور پروفیسر سید شاہ حسین کی علمی و ادبی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور سیر حاصل گفتگو کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر زاہد سیوانی، وقیع منظر، ڈاکٹر اطہر رسول، ڈاکٹر شہاب وارث نے تہنیتی نظم پیش کی۔ المونائی ایسوسی ایشن کے سکریٹری ڈاکٹر فیروز عالم نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ سمینار میں ڈاکٹر مظہر خاں وارثی، ڈاکٹر شمشیر وارثی، شہباز وارثی، شیبا کوثر، نرگس بانو، سید شاہ ذیشان احمد، اندو رائے، خورشید عالم، محمد ابوالاعلیٰ، محمد شمیم، محمد علاء الدین، منہاج انصاری، شاہینہ پروین، شاہین بانو سمیت بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالر کے علاوہ طلبا اور طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'پندار' اور دیگر اخبارات 28 فروری 2023

اردو بیداری کانفرنس

ارریہ: بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری معروف ادیب وافسانہ نگار مشتاق احمد نوری کی صدارت میں اردو بیداری کانفرنس کا انعقاد اتوار کو شہر کے ٹاؤن ہال ارریہ میں کیا

گیا۔ ماسٹر دین رضا اختر نے 'اردو سے سردمہری ایک المیہ' شاعر رضی احمد تنہا نے 'اردو اخبار و رسائل ہماری تہذیب وثقافت کا واحد ذریعہ' ماسٹر محمد محسن نے 'سیمانچل میں اردو اسکولوں واردو اساتذہ کو فکر مند وفعال بنانے کے لیے لائحہ عمل' مولانا شاہد عادل قاسمی نے 'اردو زبان ومشترکہ تہذیب وثقافت' پر قیمتی مقالے پیش کیے اسی طرح ڈاکٹر شہزاد شمس نے 'اردو سے متعلق درپیش مسائل اور ان کا حل' پروفیسر تنزیل اطہر نے 'نئی نسل کو اردو کی جانب مائل کرانے کی تدابیر' مفتی حسین احمد ہمدم نے 'اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا حصہ' مولانا فیاض عالم فیضی نے 'برصغیر میں دین کی بقا اور دین کی تعلیم کے فروغ میں اردو کا رول' جیسے موضوعات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر رقیب احمد، سید شمیم انور، محمد طلحہ خاموش، مفتی اطہر القاسمی، مولانا ایوب نظامی پٹنہ اور ڈاکٹر عابد حسین نے تاثرات پیش کیے۔ مہمان خصوصی وسرپرست اجلاس مفتی ظفر عالم ندوی استاذ ندوۃ العلما لکھنو نے کہا کہ اگر نئی نسل کی آبیاری کرنی ہے تو اسے بچپن سے اردو وعربی پڑھائیں اور اسلامی آداب سکھائیں۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ اردو سے محبوبہ کی طرح محبت کیجیے۔ ہماری تہذیب وثقافت کی شناخت اردو سے ہے۔ الفاروق فاؤنڈیشن کے صدر اور کانفرنس کے محرک نے کانفرنس میں شریک تمام مہمانوں اور معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ جبکہ خطبہ استقبالیہ کنوینر کانفرنس الحاج ماسٹر ارشد انور الف نے پیش کیا اور نظامت کے فرائض مشترکہ طور پر ماسٹر ناہید حسن استاد مولانا آزاد یونیورسٹی دربھنگہ کیمپس اور الحاج ارشد انور الف سینئر استاد آزاد اکیڈمی ارریہ نے انجام دیے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 6 مارچ 2023

تلنگانہ

مادری زبان اور ہماری ذمے داری

حیدرآباد: نئی نسل کو مادری زبان سے جوڑنا ضروری ہے تاکہ اس زبان کی آبیاری کے لیے ایک اور نسل تیار ہوسکے، مسلمانوں نے یوروپی اقوام سے بہت کچھ اپنایا لیکن ان کی مادری زبان سے محبت کرنے کا جو جذبہ ہے وہ اپنا نہیں سکے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد ریٹائرڈ پروفیسر اردو آرٹس کالج نے فری پریس ایڈیٹرس اینڈ جرنلسٹس فیڈریشن کے زیراہتمام عالمی یوم مادری زبان کی مناسبت سے منعقدہ ادبی اجلاس بعنوان 'مادری زبان اور ہماری ذمے داری' سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس ادبی اجلاس کی صدارت جناب طاہر رومانی صدر فیڈریشن وایڈیٹر ترکش ہند نے کی۔ ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد نے مزید کہا کہ یہودی اپنی مادری زبان عبرانی کو اپنے ہر بچے کو سکھاتے ہیں کیونکہ ان کا مذہبی سرمایہ اس زبان میں موجود ہے، یونیسکو نے 1955 میں دنیا کو ایک پیام دیا کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہیے، مادری زبان سے تعلیم حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ بچہ چیزیں جلد سمجھ سکتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے کے لیے بھی مادری زبان ایک بہترین وسیلہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں ایک اچھی بات یہ بھی ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کا نظم کرنے کی بات کہی گئی ہے، اردو زبان ہمیں ورثے میں ملی ہے اور اس کی ترقی، ترویج اور آبیاری کرنا ہمارا فریضہ بھی ہے۔ اردو زبان سیکھنے سے نہ صرف ہماری مادری زبان کی ترقی ہوگی بلکہ ہماری تہذیب اور روایات کا بھی تحفظ ہوگا۔ اجلاس کے ایک اور مہمان ڈاکٹر ناظم الدین ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نظام آباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اقوام عالم جس طرح اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے فخر ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں نہ صرف یہ کہ بچے کی صلاحیت اور لیاقت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ذہانت بھی ابھرتی ہے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 24 فروری 2023

علامہ اقبال کا تعلیمی فلسفہ

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم وتربیت کے زیراہتمام ایک توسیعی لیکچر کا بعنوان 'علامہ اقبال کا تعلیمی فلسفہ' انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کے مہمان مقرر ڈاکٹر طارق احمد مسعودی، ایسوسی ایٹ پروفیسر (نظامت فاصلاتی تعلیم) تھے۔ ڈاکٹر مسعودی نے علامہ اقبال کے فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال صرف شاعر نہیں تھے، وہ ایک فلسفی، ماہر نفسیات، ماہر تعلیم اور سائنسی سوچ رکھنے والی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ توسیعی لیکچر میں B.Ed، M.Ed، D.El.Ed اور پی ایچ ڈی کے طلبہ و ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر اشوانی نے کارروائی چلائی۔ صدر شعبۂ تعلیم وتربیت پروفیسر محمد مشاہد اور ڈین پروفیسر صدیقی محمد محمود نے بھی خطاب کیا۔ آرگنائزنگ کمیٹی کے اراکین ڈاکٹر شیخ احتشام الدین، ڈاکٹر شاکرہ پروین اور جناب جہانگیر عالم بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 فروری 2023

ہندوستان میں عربی زبان

حیدرآباد: عربی ایک زندہ جاوید زبان ہے، چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود عربی زبان اپنے عروج پر ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمان مقرر پروفیسر سید جہانگیر

شعبۂ عربی ایفلو یونیورسٹی نے شعبۂ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں منعقدہ قومی سیمینار بعنوان 'ہندوستان میں عربی زبان: مسائل اور امکانات' کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبہ میں عربی زبان کے فروغ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے عربی زبان کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز سے اس سمت میں مزید محنت کے لیے کہا۔ یہ سیمینار حیدرآباد کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ حرمین شریفین عربی انگریزی اسلامی انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیقی محمد محمود، ڈین اسکول برائے تعلیم و تربیت و اوایس ڈی مانو نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ دیگر زبانوں کے جاننے والوں کو روزگار کے میدان میں چیلنجز اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ مگر عربی زبان جاننے والوں کی کوئی چیلنج درپیش نہیں ہے۔ انھوں نے اس مبارک زبان کو سیکھنے کے مختلف طریقوں پر روشنی بھی ڈالی۔ پروگرام کے شروع میں صدر شعبۂ عربی مانو سیمینار ڈائرکٹر پروفیسر سید علیم اشرف جائسی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سیمینار کی غرض و غایت پر مختصر روشنی ڈالی۔ پروفیسر عزیز بانو ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات نے سیمینار کی سرپرستی کی۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ یہ پروگرام بہت ہی خوش آئند قدم ہے اور اس کا میں کھلے دل سے استقبال کرتی ہوں، اس سے نہ صرف طلبہ کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ بحث و تحقیق کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ اس ایک روزہ قومی سیمینار میں 40 مقالے پڑھے گئے، جس میں جامعہ عثمانیہ، دی انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی اور دیگر جامعات کے اساتذہ اور بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 مارچ 2023

اسلامک اسٹڈیز پر غیر مسلم مصنّفین کی خدمات

حیدرآباد: غیر مسلم بالخصوص ہندو مصنّفین نے اسلامک اسٹڈیز کے متعدد موضوعات پر جو کام کیا ہے وہ انتہائی مہتم بالشان ہے۔ اگر منشی نول کشور کا کام نہ ہوتا تو ہمارے بہت سے مدارس اپنی بنیادی کتابوں کی تعلیم و تدریس سے محروم ہوتے۔ خود فارسی زبان کا پہلا اخبار ایران سے نہیں بلکہ کلکتہ سے نکلا اور وہ راجہ رام موہن رائے نے جاری کیا تھا۔ ان خیالات کا اظہار معروف دانشور، پدم شری پروفیسر اختر الواسع، صدر نشین، خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'اسلامی مطالعات میں ہندوستانی غیر مسلم و دانشوروں کی خدمات' کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارتی خطاب میں کہا کہ اسلامی علوم کے مختلف میدانوں میں غیر مسلم دانشوروں کی بڑی خدمات ہیں۔ نعتیہ شاعری کے موضوع پر ان کے کام بے انتہا قابل تحسین ہیں۔ منشی نول کشور کی خدمات پر باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز قابل مبارکباد ہے کہ ایسے اہم موضوع پر اس نے سیمینار کا اہتمام کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلکی اور مذہبی اختلاف بالائے طاق رکھ کر علمی اتحاد قائم کیا جائے تاکہ جو بات کہی جائے وہ علم کی بنیاد پر کی جائے۔ سیمینار کا افتتاحی خطاب پیش کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے کہا کہ ہندوستان میں غیر مسلم اہل علم نے اسلامی علوم کی خدمت میں بڑا کام کیا۔ قرآن، فقہ، سیرت، نعتیہ شاعری اور اسلامی تاریخ وافکار پر ان کے کام کا بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن ان کی طرف بہت کم توجہ دی جاسکی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بہت ساری مشترکہ اخلاقی تعلیمات کی بنیاد پر بہتر تعلقات استوار کیے جائیں۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، یکم مارچ 2023

مہاراشٹر

ادب اور احتجاج

ممبئی یونیورسٹی: شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے 'ادب اور احتجاج' کے موضوع پر 8-7 فروری 2023 کو دوروزہ کثیر لسانی قومی سیمینار کا انعقاد کیا۔ افتتاحی اجلاس کی

صدارت ایم سی ای، اعظم کیمپس کے صدر ڈاکٹر پی اے انعامدار نے کی۔ مہمان خصوصی ہندوستانی پرچار سبھا کے ڈائرکٹر سنجیو نگم تھے اور کلیدی خطبہ اردو کلچر سینٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے ڈائرکٹر پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی نے دیا۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی نے اپنے پرمغز کلیدی خطبے میں احتجاج کی نوعیت، اس کی اقسام اور اس کی خصوصیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ جناب سنجیو نگم نے عصر حاضر میں احتجاج کی ضرورت کو لازمی قرار دیتے ہوئے آداب احتجاج کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر پی اے انعامدار نے اپنے صدارتی خطبے میں مختلف زبان وادب کے مدعو مقالہ نگاروں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ خوش آئند بات ہے کہ کئی زبانوں کے علمائے ادب آج اس موضوع پر گفتگو کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔

سیمینار کے پہلے روز کل چھ تکنیکی اجلاس ہوئے اور دوسرے دن پانچ۔ اس طرح اس دوروزہ سیمینار میں کل گیارہ تکنیکی اجلاس ہوئے جن میں اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، مراٹھی اور انگریزی کے کل ستر مقالہ نگاروں نے شرکت کی، ان میں سے چند مقامی کو چھوڑ کر کچھ ریاست کے مختلف اضلاع سے تھے اور زیادہ تر مقالہ نگار ملک کی مختلف جامعات سے تشریف لائے تھے۔

پہلے دن چھ اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلا اجلاس پروفیسر معظم الدین کی صدارت میں جے پی نائک بھون میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر غلام حسین، ڈاکٹر جگدمبا دوبے، ڈاکٹر قاضی نوید، ڈاکٹر محمد ابرار اور ڈاکٹر مزمل سرکھوت نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرا پروفیسر شاہد نوخیز کی صدارت میں کسما گرج ہال میں ہوا، اس اجلاس میں ڈاکٹر رئیس رونق، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر ارشاد احمد خان، ڈاکٹر لیاقت علی، ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر محمد شارق اور ڈاکٹر نورالامین نے اپنے مقالے پڑھے۔ ظہرانے کے بعد تیسرے اجلاس کا آغاز کسما گرج ہال میں ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے کی، اس اجلاس میں ڈاکٹر محمود مرزا، ڈاکٹر عرفات ظفر، ڈاکٹر انصار احمد، ڈاکٹر گلزار عالم اور ڈاکٹر سیما ناہید نے اپنے مقالے پیش کیے۔

چوتھا اجلاس جے پی نائک بھون میں ہوا جس کی صدارت پروفیسر محمد معظم الدین نے کی، جس میں ڈاکٹر کیرتی مالنی، ڈاکٹر محمد دانش غنی، ڈاکٹر احرار احمد اعظمی اور ڈاکٹر رشید اشرف خان نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پانچواں اجلاس جے پی نائک بھون میں ڈاکٹر قاضی نوید کی صدارت میں ہوا جس میں پروفیسر دتاتریہ مرکر، پروفیسر شیواجی سرگر، پروفیسر شکنتلا گاوڑے اور وندنا مہاجن نے مقالے پیش کیے۔ پہلے دن کا چھٹا اور آخری اجلاس پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی کی صدارت میں کسما گرج ہال میں اختتام کو پہنچا جس میں پی ایچ ڈی ایم فل

اور ایم اے کے طلبا بلدیو مٹلانی، تبسم حسین ممتاز، ندیم احمد نصاری، سبطین انصاری اور علی اصغر نے مقالے پیش کیے۔

دوسرے دن بروز بدھ 8 فروری 2023 کا آغاز ساتویں اجلاس سے جے پی نائک بھون میں ہوا جس کی صدارت پروفیسر غلام حسین اور ڈاکٹر قمر صدیقی نے کی، جس میں پی ایچ ڈی ایم فل اور ایم اے کے طلبا مدحت محمد شاہ خان، آزاد چودھری، ثروت شیخ، جویریہ قاضی اور یاسمین سروے نے مقالے پیش کیے۔ آٹھواں اجلاس راناڈے بھون میں ڈاکٹر عبد اللہ امتیاز احمد اور ڈاکٹر محمد تابش خان کی صدارت میں ہوا جس میں سنمیترا نوگھڑے، جناب عبید اعظم اعظمی اور ریسر اسکالرس صلاح الدین، شعیب ابجی اور سعید الرحمٰن نے مقالے پیش کیے۔ نواں اجلاس جے پی نائک بھون میں پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی کی صدارت میں ہوا جس میں پروفیسر حب ناتھ پانڈے، ڈاکٹر محمد آصف خان، جناب رحمٰن عباس اور ریسرچ اسکالرس محمد عرفان رضا اور محمد احمد شاہ نے مقالے پیش کیے۔ راناڈے بھون میں دسویں اور گیارہویں اجلاس کی صدارت ڈاکٹر قاضی نوید اور ڈاکٹر جگدمبا دوبے نے کی جس میں پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے کے طلبا شیخ رابعہ، سید نکہت جبین، طارق اعجاز، ماجدہ شیخ، نشرح جمال اور صابرین خان نے مقالے پیش کیے۔

اس دوروزہ قومی سمینار کا اختتامی اجلاس جے پی نائک بھون میں ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر کی صدارت میں اختتام پذیر ہوا۔ جس میں شرکا نے اپنے تاثرات پیش کیے اور ڈاکٹر پاٹنکر نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں احتجاج کے آداب سے واقفیت ہر کسی کے لیے ضروری ہے تاکہ عوام قانون شکنی سے محفوظ رہتے ہوئے مہذب انداز میں اپنی بات منوا سکیں۔

اس سمینار میں شہر اور مضافات کے شرکا کے علاوہ 9 کالجوں کے طلبا اور اساتذہ نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کر کے اس دوروزہ کثیر لسانی سمینار کو کامیاب بنایا۔

پریس ریلیز: قمر صدیقی، ایڈیٹر اردو چینل، ممبئی، 9 فروری 2023

ممبئی میں جشن اردو

ممبئی، کالینا: زبانوں کا باہمی رشتہ خوشگوار معاشرے کی علامت ہے جہاں کہیں سماج اور معاشرت میں ہمیں منافرت نظر آئے تو ہمیں روشنی کی طرف مائل ہونا چاہیے۔ نفرت کے ماحول کو ختم کرنے کے لیے ہمیں زبانوں کو فروغ دینا ہوگا، اس طرح کے خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر نے اردو چینل اور ممبئی یونیورسٹی کے

اشتراک سے پہلی بار ممبئی میں منعقد یک روزہ جشن اردو میں کیا۔ ڈاکٹر قمر صدیقی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر اور عبید اعظم اعظمی کی کوششوں سے 9 ایونٹس پر مشتمل یہ جشن تاریخی ثابت ہوا۔ مجموعی طور پر ایک ہزار کے قریب اردو دوست احباب و خواتین نے شرکت کی۔ عمائدین شہر کی شرکت سے منتظمین کو حوصلہ ملا۔ اسی طرح ممبئی عظمیٰ کے شعبۂ تعلیم سے متعلق اردو افسران اور اساتذۂ کرام نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کر کے اپنی علمی وادبی بیداری کا ثبوت فراہم کیا۔ 25 فروری کو مراٹھی بھاشا بھون میں منعقدہ جشنِ اردو کا افتتاح کرتے ہوئے معروف مراٹھی اسکالر اور شعبۂ مراٹھی، ممبئی یونیورسٹی کی صدر پروفیسر وندنا مہاجن نے اردو اور مراٹھی کے لسانی وادبی روابط پر سیر حاصل گفتگو کی۔ سنسکرت اسکالر ڈاکٹر سچترا تجانے نے سنسکرت زبان کی لسانی اہمیت کو اجاگر کیا اور اردو زبان کی شیرینی اور مقبولیت کا ذکر کیا۔ ہندی کے ممتاز دانشور پروفیسر ہوب ناتھ پانڈے نے بے باکانہ انداز میں زبانوں کی زبوں حالی پر روشنی ڈالی۔ شکریہ کی رسم شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد نے انجام دی جبکہ نظامت کا فریضہ اردو چینل کے مدیر ڈاکٹر قمر صدیقی ادا کیا۔ جشنِ اردو کا دوسرا پروگرام بیت بازی تھا۔ اس میں کل بارہ ٹیموں نے حصہ لیا۔ اس دلچسپ مقابلے میں پہلا انعام رئیس ہائی اسکول بھیونڈی نے حاصل کیا، دوسرا انعام انجمن اسلام، سی ایس ٹی اور تیسرا انعام مدنی ہائی اسکول، جوگیشوری کو ملا۔ نثار خان، ناصر علی اور رفیق شیخ نے اس بیت بازی کے مقابلے میں جج کے فرائض انجام دیے جبکہ بیت بازی کا پورا انتظام و انصرام اردو چینل کی مجلسِ ادارت کے رکن ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر نے خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ بیت بازی کے مقابلے کے آغاز میں شیخ عافیہ عبید کو ڈاکٹر وندنا مہاجن کے ہاتھوں بے بی پوئیٹ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جشنِ اردو کا تیسرا پروگرام یادِ رفتگاں تھا۔ یہ پروفیسر صاحب علی کی شخصیت اور کارنامے پر ایک سیمپوزیم تھا۔ اس کی صدارت پروفیسر محمد معظم الدین (دہلی) نے کی جبکہ مقررین میں پروفیسر احمد محفوظ (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)، پروفیسر محمد شاہد (شعبۂ عربی، ممبئی یونیورسٹی) پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد اور ڈاکٹر رشید اشرف خان شامل تھے۔ عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی، ذاکر خان ذاکر اور احرار اعظمی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کی۔ اس پروگرام میں مشتاق انتولے (نائب صدر، انجمن اسلام) اور ڈاکٹر مسرت صاحب علی مہمانِ خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ نظامت کا فریضہ ٹیم اردو چینل کی فعال رکن رخسانہ ہنورے کے ذمے تھا۔ چوتھا پروگرام گیت اور سنگیت پر مشتمل تھا جس میں ناصر یوسف اور ساتھیوں نے اپنی گلوکاری سے سامعین کو مسحور کیا۔ پانچویں پروگرام کے طور پر ڈراما 'عشق جلے تو جلے ایسا' پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے کے مصنف صادق انصاری اور ڈائرکٹر مجیب خان تھے۔ یہ اس جشن کا کامیاب ترین پروگرام تھا۔ چھٹا پروگرام اسٹوری ٹیلنگ تھا جس میں رحمان عباس، شاداب رشید اور وسیم عقیل شاہ نے کہانیاں پیش کیں۔ اس کی صدارت قاسم ندیم نے کی جبکہ فاروق سید اور اسلم پرویز اس پروگرام میں مہمانِ خصوصی تھے۔ وقت کی تنگی کے سبب ساتواں اور آٹھواں پروگرام ایک ساتھ متصل کر کے آل انڈیا مشاعرہ کر دیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کی صدارت ایڈوکیٹ یٰسین مومن نے کی جبکہ ندیم صدیقی، احمد محفوظ، شاہد لطیف، ملک زادہ جاوید، بدر واسطی، یوسف صابر، طٰہٰ صدیقی، وی کے ترپاٹھی، گیان پرکاش گرگ، رشید اشرف خان، الکا شرر، منیشا کنتھالیہ، ممتاز نازاں، عائشہ سمن، تبسم ناڈکر، کوثر جہاں، سنہتا جوشی اور کلثوم کشفی جیسے شعرا اور شاعرات نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس جشن کا آخری پروگرام محفلِ غزل تھا جس میں اورنگ آباد سے آئے معروف گلوکار ڈاکٹر دوست محمد خان نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ جشنِ اردو ممبئی میں پہلی بار منعقد کیا تھا اور اس کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ صبح سے لے کر رات دس بجے تک ایک ہزار سے زائد سامعین اس جشن میں شریک ہوئے۔ جشنِ اردو کی اس شاندار کامیابی کے پیشِ نظر اردو چینل اور شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سال جشنِ اردو دو دنوں کے لیے منعقد کیا جائے گا۔

پریس ریلیز: محمد علیم اسماعیل، مہاراشٹر، 2 مارچ 2023

اعزاز و اکرام

ذکیہ مشہدی

نئی دهلی: اردو کے معتبر اور باوقار بین الاقوامی ادبی ایوارڈ 'عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر' کی ہندستانی جیوری کی ستائیسویں میٹنگ آن لائن منعقد ہوئی جس میں معروف فکشن نگار ذکیہ مشہدی کو سال 2023 کے لیے ایوارڈ دینے کا فیصلہ اتفاق رائے سے کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، ایوارڈ ٹرافی اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی رحلت کے بعد جیوری کے نومنتخب صدر پروفیسر شافع قدوائی نے میٹنگ کی صدارت کی۔ انھوں نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان وادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں جیوری کی متفقہ رائے کی بنیاد پر اس سال کے ایوارڈ کے لیے ذکیہ مشہدی کے نام کا فیصلہ ہوا ہے۔ مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے سرپرست اردو کے فعال خدمت گزار اعلیٰ محمد عتیق کے مطابق ہندوستان میں قائم آزاد جیوری میں پروفیسر شافع قدوائی (صدر) کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ، سید محمد اشرف، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور شین کاف نظام شامل تھے۔ محمد عتیق نے جیوری کے فیصلے کا خیر مقدم کیا اور ذکیہ مشہدی کو مبارکباد پیش کی۔ ذکیہ مشہدی کا شمار برصغیر کے سرکردہ فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے 9 مجموعوں اور ایک ناول کے علاوہ اردو سے انگریزی، ہندی سے اردو اور انگریزی سے اردو تراجم کی 8 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ واضح رہے کہ عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کا اجرا 1996 میں کیا گیا تھا اور مجلس اب تک ہندوستان اور پاکستان کے 52 نامور فکشن نگاروں، ادبا، محققین اور ناقدین کی خدمت میں یہ ایوارڈ پیش کر چکی ہے۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد اور ایوارڈ ٹرافی پر مشتمل ہے جو ہر سال ایک ممتاز پاکستانی اور ہندوستانی فنکار کو دیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2023

سعدی ایوارڈ

نئی دهلی: خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران، نئی دہلی میں سعدی ایوارڈ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ہندوستانی دانشوروں، محققین اور فارسی اسکالرس نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر محمد علی ربانی نے کہا کہ ہندوستان میں شیخ سعدی کو ایک خصوصی مقام ومنزلت حاصل ہے، گلستان و بوستان سعدی کی پند ونصائح آج بھی ہندوستانی اہل خانہ اپنے بچوں کو اخلاقی تربیت کے لیے سناتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی ہندوستان میں فارسی آثار بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں گلستان و بوستان سعدی کے مخطوطے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سال ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے 9 اساتذہ کو 'سعدی ایوارڈ' پیش کیا جا رہا ہے۔ ان اساتذہ نے فارسی زبان وادب کی ترویج وتحقیق پر ہند اور ایران کے تہذیبی رشتوں کو مزید استوار کرنے میں پرخلوص خدمات انجام دی ہیں۔ نویں 'سعدی ایوارڈ' حاصل کرنے والے اساتذہ اور محققین میں پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر عابد حسن پٹنہ، پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، پروفیسر جہانگیر اقبال، پروفیسر احتشام الدین، ڈاکٹر قمر عالم، ڈاکٹر سید نقی عباس کیفی، ڈاکٹر سید محمد رضا موسوی، ڈاکٹر محمد عامر شامل ہیں۔ اس موقعے پر سفیر ایران ڈاکٹر ایرج الٰہی نے بھی سامعین سے خطاب کیا اور سعدی کی شخصیت اور تصنیف پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے 'سعدی ایوارڈ' حاصل کرنے والے ہندوستانی دانشوروں کی خدمت میں مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں صاحب نظر دانشمندوں کے مشورے سے جن دانشوروں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ قابل تحسین ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انعامات فارسی کے نوجوان اساتذہ اور طلبہ کے لیے باعث تشویق ثابت ہوں گے اور وہ زیادہ توجہ اور دلچسپی سے اپنے اپنے کلام میں منہمک رہیں گے۔ مزید برآں وہ جلد ہی اپنے اساتذہ کی خالی جگہوں کو پر کرنے میں کامیاب ہوں گے اور گراں قدر کام اپنی یادگار کے طور پر چھوڑیں گے۔ وزیر برائے سماجی فلاح و بہبود راج کمار آنند نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی جب کہ ڈاکٹر جے کے بجاج چیئرمین انڈین کونسل فور سوشل سائنس ریسرچ منسٹری آف ایجوکیشنل گورنمنٹ آف انڈیا اور ڈاکٹر ترلوچن سنگھ چیئرمین انٹرنیشنل سینٹر فور سکھ اسٹڈیز نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ایران سے آئے موسیقی گروپ رستی نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ سعدی تقریب میں فارسی کے اساتذہ واسکالرز اور طلبہ وطالبات نے بڑی تعداد شرکت کی۔ نظامت کے فرائض مہدی باقر خان نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 فروری 2023

ڈاکٹر قاسم خورشید

پٹنہ: روز مائن ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین اولیس عنبر نے عالمی شہرت یافتہ ادیب، شاعر، ماہر تعلیم اور سابق ہیڈ لینگویجز ایجوکیشن بہار سرکار ڈاکٹر قاسم خورشید کو گزشتہ کئی دہائیوں سے تعلیم کے شعبے میں بیش بہا خدمات کے لیے ایک خصوصی تقریب میں لائف ٹائم ممبر ایوارڈ سے نوازا۔

ڈاکٹر قاسم خورشید نے اس ایوارڈ سے نوازے جانے کے بعد کہا کہ میں روز مائن ایجوکیشنل ٹرسٹ کا مشکور ہوں کہ مجھے اس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھوں نے تفصیلی اظہار خیال کے دوران زور دیا کہ جس طرح برسوں کی عرق ریزی کے بعد سرسید نے ملک میں قومی دھارے کی تعلیم کے لیے ایک ماڈل پیش کیا تھا جس سے کئی نسلوں نے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح روز مائن کے چیئرمین اولیس عنبر کی کاوشوں کو بھی دیکھ رہا ہوں، انھوں نے تکنیکی تعلیم کے شعبے میں انقلاب بپا کر دیا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ سرکار کے اس خواب کو تعبیر کی صورت میں پیش کر رہے ہیں جس میں گھر گھر تعلیم کا تصور نہاں ہے، یہاں واقعی ہندوستان کے عام گھروں کے بچے اپنا کیریئر بنا رہے ہیں، اولیس عنبر صاحب کے عملی اقدامات اور وژن کا ہر زی شعور طبقہ قائل ہے، وہ لگاتار اپنے موقف کو وسعت عطا کر رہے ہیں۔ اور آئندہ وہ مدرسہ کے بچوں کو تکنیکی تعلیم اسکالرشپ وغیرہ فراہم کروانے کی سعی کر رہے ہیں۔

پریس ریلیز: قاسم خورشید، پٹنہ، 19 فروری 2023

ہند مسابقہ مضمون نگاری، کامیاب طلبہ و طالبات انعامات سے سرفراز

نئی دهلی: عزیزیہ رحمانی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن نئی دہلی کے زیر اہتمام امیر شریعت سابع مولانا محمد ولی رحمانی

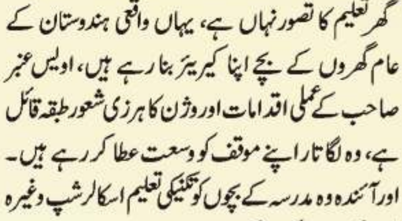

کی شخصیت و خدمات پر کل ہند مضمون نویسی کے مسابقہ کے بعد جلسہ تقسیم انعام وایوارڈز ملی ماڈل اسکول کے کانفرنس ہال، جامعہ نگر میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ جھارکھنڈ کے نائب امیر شریعت مولانا محمد شمشاد رحمانی قاسمی نے کی جب کہ نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکالر عبدالواحد رحمانی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر صفدر امام قادری پٹنہ، پروفیسر احمد محفوظ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، حاجی محمد انور رحمانی کلکتہ، مولانا زکریا قاسمی زید کالج، دہلی، فیروز صدیقی دہلی، ڈاکٹر واحد نظیر جامعہ ملیہ اسلامیہ، مفتی نادر قاسمی اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی، وسیم مظفر نگر، محمد صلاح الدین مونگیر، منیر انجم پرانی دہلی، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر توقیر راہی، فیض الاسلام فیضی کریٹیو اسٹار، مولانا سبحان قاسمی نبی کریم دہلی، مولانا اسلم رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر، سلیم میرٹھ کے علاوہ بڑی تعداد میں مہمان کرام موجود تھے۔ مقررین نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا محمد ولی رحمانی کی خدمات بیش بہا ہیں۔ نئی نسل کو ان کی خدمات سے روبرو کرانا نہایت ہی ضروری ہے اور اس کے لیے عزیزیہ رحمانی فاؤنڈیشن کے ذمے داران مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس طرف قدم بڑھایا ہے جس کے لیے آج ہم سب جمع ہیں۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ اس طرح کا مسابقہ منعقد کرنا اور ایسے موضوع کا انتخاب کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ نوجوانوں میں آج بھی اپنے بزرگوں کی امانت کی حفاظت کا جذبہ موجود ہے۔ مسابقہ میں اول انعام عبدالقیوم، دوم انعام سعدیہ ستیہ وتی کالج اور سوم انعام مولانا محمد جلال الدین قاسمی کے علاوہ تشجیعی انعام نکہت پروین اڑیسہ، مولانا منہاج عالم ندوی، عظمیٰ مہدی، خالد سیف اللہ، صفیہ اختر سبحانی، راقم راہی، ہما تحریم، مولانا محمد شاہد رحمانی، محمد شیان، لائبہ زریں، مولانا اشفاق احمد قاسمی نے حاصل کیا۔ اس موقعے پر مولانا محمد ولی رحمانی ایوارڈ 2022 مولانا محمد شمشاد رحمانی قاسمی، مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ 2022، پروفیسر صفدر امام قادری اور شمس الرحمٰن فاروقی ایوارڈ 2022، پروفیسر احمد محفوظ کو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 فروری 2023

خلیق الزماں نصرت، چاند لکرالوی

نئی دھلی: انجمن فروغ اردو رجسٹرڈ دہلی کی جانب سے انتساب شعر کے ماہر محقق خلیق الزماں کے اعزاز میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت استاد شاعر

جمیل مظہر سیانوی اور نظامت درد دہلوی نے کی۔ مہمانان کی حیثیت سے محمد ارشاد، چاند لکرالوی، شہادت علی نظامی، ڈاکٹر فرقان گوہر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر خلیق الزماں نصرت کا شاندار استقبال کرتے ہوئے ان کو اور چاند لکرالوی سعید اعظمی میموریل ایوارڈ برائے 2023 کے ہمراہ، سپاس نامہ اور توصیفی سرٹی فیکٹ پیش کیا۔ درد دہلوی نے خلیق الزماں نصرت کی ادبی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا وہ وقت کی اہم ضروریات میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے قلمکاروں کو ان کا حق دلانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چاند لکرالوی کی شاعری پر بات کرتے ہوئے شہادت علی نظامی نے کہا کہ چاند کی شاعری ستاروں میں چاند کی مانند ہے۔ انھوں نے گھسے پٹے مفاہیم سے پرہیز کرتے ہوئے جدید مسائل کو مخصوص انداز میں ڈھال کر اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

روزنامہ 'قومی بھارت'، 29 فروری 2023

رسم اجرا

کار جہاں دراز ہے

حیدرآباد: والدین اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں تاکہ ان میں اخلاق اور تہذیب پروان چڑھ سکیں۔ اردو زبان

ادب وتہذیب اور نفاست کی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار مدینہ ایجوکیشن سنٹر میں شبینہ فرشوری کی کتاب 'کار جہاں دراز ہے' کی رسم اجرا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شہہ میری (سابق وائس چانسلر عبدالحق اردو یونیورسٹی) نے کیا۔ انھوں نے شبینہ فرشوری کو کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کی اور کہا کہ کتاب میں اردو ادب کی تمام صنفوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کہانیاں سنانے کی روایت ختم ہو رہی ہے اسے دوبارہ زندہ کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر محمد مسعود احمد (ڈائرکٹر میسکو) نے کہا کہ شبینہ فرشوری کی کتاب میں مضامین پڑھنے کے قابل ہیں۔ کتاب کے پڑھنے سے اردو کے اہم شعرا وادبا کے تعلق سے بہت ساری اہم معلومات ہم کو حاصل ہوں گی۔ مصحف اقبال توصیفی نے کہا کہ کتاب میں بہت آسان اور سادہ زبان لکھی گئی ہے۔ میر عثمان علی خان، امیر مینائی، مولانا آزاد، حیرت بدایونی اور اردو ادب کئی عظیم شخصیات پر شبینہ فرشوری نے تفصیلی مضامین لکھے ہیں۔ کتاب میں اردو کی خاتون قلمکاروں کی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین (صدر شعبہ تعلیم نسواں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)، ڈاکٹر عابد معز (مزاح نگار وسابق کنسلٹنٹ منسٹری آف ہیلتھ سعودی عرب) اور ڈاکٹر جاوید کمال (صدر انجمن ریختہ گویان) نے شبینہ فرشوری کی کتاب پر تفصیلی تبصرہ پیش کیا اور کہا کہ شبینہ فرشوری بدایوں شہر میں پیدا ہوئیں اور فروغ اردو کے لئے مسلسل کوششیں کرتی رہتی ہیں۔ وہ کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ اردو طلبہ واسکالرس کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ان کی پچھلی تین کتابیں شہر آرزو، میرے بھی خواب اور ہنستا پان بولتی چھالیہ بھی کافی مقبول ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق اور زاہد ہریانوی نے تہنیتی قطعات پیش کیے۔ آخر میں مصنفہ شبینہ فرشوری نے شکریہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کتاب کی اشاعت ایک بہت نازک کام ہوتا ہے اور اس کے لیے ایک طویل وقت لگتا ہے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پہلے سفر کے دوران لوگ کتابیں، رسائل اور دیگر چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا ہے جس پر ہم سب کو غور کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر گل رعنا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اسلم فرشوری، فراز فرشوری اور محسن خان نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر محبان اردو کی کثیر تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز: محسن خان، حیدرآباد، 28 فروری 2023

جشنِ اجرائے کتب

ویشالی: 26 فروری 2023 بروز اتوار، گورنمنٹ آئیڈیل مڈل اسکول بھیرو کھڑا، پاتے پور (ویشالی) کے وسیع و عریض

احاطے میں تنظیم ارباب ادب، چاند پور فتح، ویشالی (بہار) کے زیر اہتمام ڈاکٹر بدر محمدی کی کتاب 'بنت فنون کا رشتہ، تبصرہ و تجزیہ' ڈاکٹر رام نریش بھگت کی کتاب 'بجیکا گیتوں میں جن چیتنا' اور جناب منظور عادل کی کتاب 'جسے بھول گئے' کا اجرا عمل میں آیا۔ صدر محفل پروفیسر فاروق احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفر پور نے اردو اور ہندی کے دلدادوں کی اس تقریب میں فرمایا کہ ''بنت فنون کا رشتہ'' کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً 27 قدیم و جدید ادیبوں اور سخن سنجوں کے تاثرات اس میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر رام نریش بھگت کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی نے انہیں باوقار محقق بتایا۔ جناب صدر نے 'جسے بھول گئے' کے حوالے سے منظور عادل کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عطا عابدی نے کہا کہ بدر محمدی کے شعروں میں خود ان کا تنقیدی شعور اپنی موجودگی کا ثبوت دے رہا ہے۔ انہوں نے بجیکا کے عوامی گیتوں میں کئی فکر انگیز باتوں کی نشاندہی بھی کی۔ عطا عابدی نے مزید کہا کہ 'جسے بھول گئے' منظور عادل کے دور اوّلیں کی شاعری کو یاد کرنے کی خوبصورت کوشش سے عبارت ہے۔ مہمان اعزازی جناب انوار الحسن وسطوی نے کہا کہ دور افتادہ دیہی آبادی میں اس طرح کی تقریب کا انعقاد تاریخ رقم کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر اویناش امن نے 'بجیکا گیتوں میں جن چیتنا' کو قابل قدر کارنامہ ٹھہراتے ہوئے کہا کہ بھوجپوری اور میتھلی کی طرح بجیکا کی اہمیت بھی تسلیم کی جانی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'جسے بھول گئے' کے اشعار پرانے سہی مگر باسی نہیں، تازہ ہیں۔ سید مصباح الدین احمد کا مقالہ 'بنت فنون کا رشتہ' پر تبصرہ تھا تو قمر اعظم صدیقی کی تحریر 'جسے بھول گئے' پر مرکوز تھی۔ شری راما نند سنگھ، انجینئر رام نریش شرما اور شری جوالہ سانڈھیہ پشپ نے ''بجیکا گیتوں میں جن چیتنا کے حوالے سے ڈاکٹر رام نریش بھگت کی ادبی کارکردگیوں پر روشنی ڈالی۔ اجرائے کتب اور ان پر گفتگو کے بعد ایک عظیم الشان مشاعرہ و کوی سمیلن منعقد کیا گیا جس میں بہار کے مختلف اضلاع اور بیرون بہار کے اردو، ہندی اور بجیکا کے شعراء و شاعرات نے شرکت کی۔ دونوں تقریب کی مشترکہ نظامت کے فرائض جناب اثر فریدی اور ڈاکٹر عارف حسن وسطوی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر بدر محمدی سکریٹری تنظیم ارباب ادب کے اظہار تشکر کے ساتھ گورنمنٹ آئیڈیل مڈل اسکول بھیرو کھڑا (ویشالی) کے قیام کے 70 سال مکمل ہونے پر منعقدہ ادبی تقریب شام ڈھلے اختتام پذیر ہوئی۔

پریس ریلیز: سکریٹری تنظیم ارباب ادب، ویشالی، 12 مارچ 2023

38 کتب کا اجرا اور پانچ ادبی تنظیموں کو اعزاز

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکیڈمی مالیرکوٹلہ (شعبۂ اعلیٰ تعلیم و لسانیات، حکومت پنجاب) کی جانب سے تقریب رسم اجرا و اعزازات کا انعقاد کیا گیا جس میں اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع شدہ 38 کتب جب کہ اکیڈمی کے ہی مالی اشتراک سے اردو زبان و ادب کے لیے گراں قدر خدمات انجام دینے والی پانچ ادبی تنظیموں کو اعزازات سے نوازا گیا۔ تقریب کے مہمانان اعزازی پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر ڈی ڈی بھٹی، پروفیسر عزیز پریہار اور پروفیسر سیوک نیر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب اردو اکیڈمی اردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے اپنی گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ خصوصی طور پر اس تقریب میں ادبی کتب کے ایک ذخیرہ کی رونمائی اس بات کی شاہد ہے کہ اکیڈمی اردو زبان و ادب کے تئیں کتنی سنجیدہ ہے۔ حلقہ مالیرکوٹلہ کے ایم ایل اے اور پنجاب اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر محمد جمیل الرحمٰن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب اردو اکیڈمی کی جانب سے منعقد کی جارہی ادبی تقاریب اس بات کی ضامن ہیں کہ حکومت پنجاب خطہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور اس کی بقا کے لیے کتنی فکرمند ہے۔ اس ادبی تقریب کی صدارت فرما رہے گورلولین سنگھ سدھو، آئی اے ایس (ریٹائرڈ) نے اپنے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا بچپن سے ہی اردو اور اردو شاعری سے بے حد لگاؤ رہا ہے۔ اکیڈمی کی اس تقریب میں صوبہ پنجاب کی ان تنظیموں کو بھی اعزازات سے نوازا گیا جن ادبی تنظیموں نے اکیڈمی کے مالی اشتراک کے ساتھ ادبی تقاریب کا انعقاد کیا۔ ان میں محفل اردو لٹریری کلب (رجسٹرڈ)، فرید کوٹ، افسانہ کلب (رجسٹرڈ)، مالیرکوٹلہ، جھنکار کلچرل میوزیکل فورم (رجسٹرڈ) پٹیالہ، انجمن فروغ ادب پنجاب (رجسٹرڈ)، مالیرکوٹلہ اور بزم ادب، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ شامل ہیں۔ ان ادبی تنظیموں کے سبھی اراکین نے شرکت کی اور اعزاز حاصل کیا۔ اس تقریب کے انعقاد کے لیے سبھی انتظامات اکیڈمی کے انچارج محمد صادق نے اپنی ٹیم جن میں محمد آصف، محمد صابر، محمد عمران، پیراں دتہ کے ہمراہ اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر رنجودھ سنگھ کی رہنمائی میں مکمل کیے۔ اس ادبی تقریب میں نظامت کے فرائض محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'ہند سماچار' مالیرکوٹلہ، 18 فروری 2023

کامیاب کیسے بنیں

لکھنؤ: زندگی میں اپنی منزل حاصل کرنے کے لیے خواب دیکھنا ضروری ہے۔ کامیاب ترین انسان بننے کے لیے اپنی سوچ کا دائرہ وسیع کرنا پڑے گا۔ کامیابی کا بنیادی اور لازمی عنصر انسان کی جستجو، لگن اور مثبت سوچ پر منحصر ہے۔ 'کامیاب کیسے بنیں' ایک ایسی کتاب ہے جو یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان زندگی میں جو خواب دیکھتا ہے اسے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز پی جی کالج کے مینیجر سید اطہر نبی ایڈووکیٹ نے آغاز فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک پروگرام میں کیا۔ شعبہ پی جی کالج کے خطیب اکبر مرزا محمد اطہر لائبریری کے ریڈنگ ہال میں منعقد کتاب 'کامیاب کیسے بنیں' کی تقریب اجرا کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی جناب اطہر نبی نے کہا کہ اس کتاب کے مصنف پروفیسر آغا پرویز مسیح اور ڈاکٹر محمد عمران خان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس اہم موضوع پر اپنا قلم اٹھایا۔ مولانا ڈاکٹر ایم ایم اعجاز عباس کی صدارت میں منعقد اس پروگرام میں بحیثیت مہمان ذی وقار لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے سابق صدر پروفیسر رمیش دکشت نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ

کتاب اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ انسان کی خوداعتمادی اسے ایک کامیاب ترین شخص بناتی ہے۔اس پروگرام میں بحیثیت مہمانان اعزازی خلیج ٹائمز کے مدیر مظہر فاروقی، شیعہ پی.جی کالج کے پرنسپل پروفیسر شبیہ رضا باقری، ڈاکٹر ایم ابوطیب نے بھی کتاب پر اظہار خیال کیا۔ممتاز پی جی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر عتیق احمد فاروقی اور ڈاکٹر عبدالرحیم، لوآکٹا کے صدر ڈاکٹر منوج پانڈے، کھن کھن جی پی جی کالج کی پرنسپل اور لوآکٹا کی سکریٹری ڈاکٹر انشو کیڈیا، شعیب ایڈوکیٹ، کیپٹن عدیل صدیقی، ڈاکٹر ثروت تقی، ممتاز پی جی کالج کے پرنسپل پروفیسر نسیم احمد خان نے زولوجی ڈیپارٹمنٹ، شیعہ پی جی کالج کے پروفیسر آغا پرویز مسیح اور ممتاز پی جی کالج کے شعبہ سیاسیات کے ڈاکٹر محمد عمران خان کی کتاب 'کامیاب کیسے بنیں' پر مختلف زاویوں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اس موقعے پر ممتاز پی جی کالج اور شیعہ پی جی کالج کے اساتذہ، مہمانان اور طلبا موجود تھے۔آخر میں کتاب کے مصنف پروفیسر آغا پرویز مسیح اور ڈاکٹر محمد عمران خان نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 فروری 2023

شیخ بھکاری انصاری اور آزادی کی لڑائی 1857

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے

صدر دفتر میں ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل کے ہاتھوں آئی پی ایس سابق ڈی.جی.پی چھتیس گڑھ ایم ڈبلیو انصاری (محمد وزیر انصاری) کی مرتب کردہ کتاب 'ثانی ٹیپو سلطان شہید شیخ بخاری عرف شیخ بھکاری انصاری اور آزادی کی پہلی لڑائی 1857 کا اجرا عمل میں آیا۔اس موقعے پر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ایم ڈبلیو انصاری نے تاریخ ہند کی عبقری شخصیت پر کام کیا ہے جس کی بہادری، انداز جنگ وحرب اور عسکری منصوبہ بندی سے غاصب فرنگی کانپتے تھے۔اس کا بہتر اندازہ انگریزوں کی اُس فوجی عدالت کے اس تبصرے سے ہوتا ہے جو 7 جنوری 1858 کو شیخ بھکاری اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت سناتے وقت کیا تھا: انگریز تسلیم کرتے تھے کہ ''شیخ بھکاری باغیوں میں سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک انقلابی ہیں''۔رسم اجرا کی تقریب میں اردو زبان کی ترویج وترقی اور اردو کے رسم الخط کے فروغ پر بھی ایم ڈبلیو انصاری نے گفتگو کی۔یہ کتاب اس سے پہلے دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے، لیکن اردو زبان میں اس کتاب کا شائع کیا جانا ان کے فروغ اردو کے جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔پروفیسر شیخ عقیل نے کہا کہ اس طرح کے گمنام اور نظرانداز، فراموش کردہ مجاہدین وشہدائے آزادی کے کارناموں کو مزید منظر عام پر لایا جائے، تاکہ موجودہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہوسکے کہ ہمارے اسلاف نے کیسے کیسے عظیم کارنامے انجام دیے اور کیسی کیسی بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں۔شیخ عقیل نے مزید کہا باشندگان ہند نے بلاتفریق مذہب وملت، رنگ ونسل ذات وبرادری اور علاقہ وخطہ جنگ آزادی میں حصہ لیا۔اس موقعے پر مولانا محمد ہارون صدر جمیۃ العلما ہند بھوپال نے ایم ڈبلیو انصاری کی فروغ اردو کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اردو کے ارتقا کی سمت بڑھتے قدموں کو لائق تحسین قرار دیا۔اس موقعے پر مرتب کے علاوہ سماجی خدمات گار سفر انٹرنیشنل کے چیئرمین بدرالدجیٰ صدیقی نجمی، معروف ادیب وصحافی حبیب سیفی، ہفت روزہ صدائے انصاری کے ایڈیٹر انصاری اطہر حسین، مولانا محمد ہارون صدر جمیۃ العلما ہند بھوپال صوبہ مدھیہ پردیش بھی شریک رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2023

ذکر شیخ وشباب

ناندورہ: شاہین کالونی، تعلقہ ناندورہ (ضلع بلڈھانہ، مہاراشٹر) میں حوالدار سلیم الدین عامر شیگانوی کی تازہ کتاب 'ذکر شیخ وشباب' کی رسم اجرا معروف صحافی نعیم شیخ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔اس پروگرام میں حوالدار سلیم الدین عامر، نعیم شیخ، ہارون دیشمکھ، وسیم زاہد، وسم کاتب، حسین ساحل، سید اسماعیل گوہر، علیم اسماعیل، راحیل ابن انجم، صدیق سر، شریف سر، محمد صادقین، سید عمران اور شاہد قادری حاضر تھے۔حوالدار سلیم الدین عامر کی یہ نئی تخلیق 'ذکر شیخ وشباب' منثور ومنظوم تاریخ گوئی پر مشتمل ہے۔فن تاریخ گوئی اردو، فارسی اور عربی شاعری کی ایک اہم صنف ہے جو ہماری تاریخ کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔گذشتہ نصف صدی سے یہ چشمۂ سخن سوکھ گیا ہے اور اس کے کہنے اور سننے والے تقریباً ناپید ہیں۔اس لحاظ سے سلیم الدین عامر کی یہ کاوش قابل مبارکباد ہے۔

روزنامہ 'قومی بھارت' دہلی، 9 فروری 2023

مضامین عرفان

وارانسی: کسی بھی عہد کے ادبی رجحان اور شعری وتنقیدی نیز تحقیقی رویوں کو سمجھنے کے لیے اس عہد میں لکھی جانے والی اور اطراف واکناف سے شائع ہونے والی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔کتابیں نہ صرف ہمارے ماضی کو زندہ رکھتی ہیں بلکہ ہمیں نئی بصیرت عطا کرتی ہیں اور مستقبل کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔یہ باتیں بنارس ہندو یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے 'مضامین عرفان' کے اجرا کی تقریب میں کہیں۔انھوں نے کہا کہ 'مضامین عرفان' شہر جون پور سے تعلق رکھنے والے ادب اطفال کے ماہر عرفان جونپوری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف رسائل وجرائد کے لیے لکھے۔اس میں ان کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں جو گذشتہ برسوں میں ان کے مطالعہ میں رہیں۔ڈاکٹر مشرف علی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں شعبہ اردو کی کارگزاریوں اور اس کے تحت منعقد تقریبات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کتابوں کی رسم اجرا یا ان پر تذکرہ بھی ہم نصابی سرگرمی کا حصہ ہے۔ڈاکٹر عبدالسمیع نے کتاب کی اشاعت پر صاحب کتاب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ کتاب ابھی شائع ہوئی ہے ابھی اس کی قدر و قیمت کا تعین تو نہیں ہوسکتا لیکن امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کی نظر میں مقبول ہوگی۔ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی افادیت پر روشنی ڈالی۔اظہارِ خیال کرنے والے لوگوں میں ڈاکٹر احسان حسن، رشی کمار، ڈاکٹر مغیث احمد، اشتیاق سعید وغیرہ شامل تھے۔نظامت شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر محمد اعظم نے اور شکریہ کی رسم جاوید انور نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، وارانسی، 7 فروری 2023

ایک رات کا موقف

پٹنہ: ڈاکٹر شکیل کی کہانیوں نے مجھے حیرت زدہ کیا۔ڈاکٹری کے پیشے سے اتنی دیر بعد وہ اردو افسانہ نگاری کی طرف کیوں آئے۔ان کی کہانیوں میں لسانی اور سماجی تنوع اس درجے تک ہے کہ آپ مبہوت ہو جائیں۔بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے منعقدہ ڈاکٹر شکیل کے افسانوی مجموعے 'ایک رات کا موقف' کے اجرا کے موقعے پر مقامی اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں معتبر افسانہ نگار اور غالب ایوارڈ یافتہ مصنفہ محترمہ ذکیہ مشہدی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مذکورہ باتیں کہیں۔پروگرام کی صدارت معروف ہندی شاعر ارون کمل نے کی۔انھوں نے اس

بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر شکیل کے افسانوی مجموعے کے اجرا کے موقعے سے برسوں بعد اردو اور ہندی کے بہت سارے ادیب جمع ہو سکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر شکیل حاشیائی آبادیوں کے درد کو سمجھتے ہیں اور ان کی زندگی کو نہایت ہمدردی کے ساتھ اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔ تقریب اجرا سے خطاب کرتے ہوئے افسانہ نگار ڈاکٹر شکیل نے اپنے تخلیقی عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ کس طرح میڈیکل کی تعلیم اور پیشے کے مشکل سفر میں انھوں نے اپنی مادری زبان کی حفاظت کی۔ انھوں نے اپنے ماموں جان معروف افسانہ نگار اور شاعر شعیب شمس کو یاد کیا اور کہا کہ وہ بہر صورت اس وراثت سے آگے بڑھ کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے مشتاق احمد یوسفی اور سعادت حسن منٹو کو یاد کرتے ہوئے اپنے فن کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ افسانے کے اختتام میں چونکانے کی جو ایک کیفیت ہوتی ہے، میں اس پر خود کو مرتکز کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پروگرام کا آغاز بزم صدف کے سربراہ پروفیسر صفدر امام قادری کی گفتگو سے ہوا۔ انھوں نے ان حالات کا تذکرہ کیا کہ کیسے ایک پیشہ ور ڈاکٹر اچانک ادیب کی شکل میں سامنے آ گیا اور بزم صدف نے اس کتاب کی اشاعت اور اس کی عالمی سطح پر لانچنگ کا کیوں کر پروگرام مرتب کیا۔ اس تقریب اجرا میں چار مقالے پیش کیے گئے جن میں ڈاکٹر شکیل کے فکر و فن کا تنقیدی اعتبار سے محاسبہ کیا گیا۔ ارد ڈائرکٹوریٹ کے رسالہ 'بھاشا سنگم' کی نائب مدیرہ ڈاکٹر افشاں بانو نے ڈاکٹر شکیل کے افسانوں کی زبان کے امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کو واضح کیا کہ وہ کس طرح مختلف زبانوں کے الفاظ اور جملوں کا فطری طور پر اپنے افسانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اے این کالج، پٹنہ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر منی بھوشن کمار نے ڈاکٹر شکیل کی چند کہانیوں کے تنقیدی تجزیے کے بعد اپنا یہ نتیجہ پیش کیا کہ ڈاکٹر شکیل سماجی بیداری اور حوصلہ مندی کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ شعبۂ اردو جی ایل اے کالج، میدنی نگر، جھارکھنڈ سے تشریف لائے ڈاکٹر تسلیم عارف نے 'ڈاکٹر شکیل کی افسانوی کائنات' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر شکیل کی گہری سماجی وابستگی کے لیے داد دی اور ان کی زبان کی تجربہ پسندی کو لائق اعتنا قرار دیا۔ ڈاکٹر احمد صغیر نے ڈاکٹر شکیل کی چند کہانیوں کے حوالے سے اس سماجیاتی منظر نامے کا تذکرہ کیا جس کے آس پاس اردو میں کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ انھوں نے اس افسانہ نگار کے اختصاص اور امتیاز پر واضح طور پر روشنی ڈالی۔ پروگرام میں مہمان اعزازی کے طور پر جناب شفیع مشہدی، محترمہ اوشا کرن خان اور پروفیسر جاوید اختر خاں شامل تھے۔

معروف ہندی اور میتھلی افسانہ نگار اور ناول نگار پدم شری اوشا کرن خان نے بتایا کہ فکشن میں ان دنوں لسانی تنوع اور تال میل کا دور آیا ہوا ہے۔ ہر زبان میں دوسری زبان کے الفاظ اور جانے ان جانے بول سما جاتے ہیں۔ یہ عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ ڈاکٹر شکیل کی کہانیوں میں یہ رنگا رنگی مجھے بیحد متاثر کرتی ہے۔ ممتاز ڈراما نگار ڈاکٹر جاوید اختر خاں نے ڈاکٹر شکیل کے ایک افسانے 'عبارت مزید' اور ایک ترجمے بہ عنوان 'معاف کرنا' کی اپنی آواز میں پیشکش سے سماں باندھا۔ محترمہ نویدتا جھا نے ڈاکٹر شکیل کی افسانہ نگاری کے اسباب و محرکات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے کن مشکلوں سے وقف نکال کر یہ افسانے لکھ رہے ہیں۔ بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے منعقدہ اس پروگرام میں عظیم آباد کے اردو اور ہندی کے شعرا و ادبا، ثقافتی تنظیموں کے کارکن اور دانش وران کی بڑی تعداد جمع تھی۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 19 فروری 2023

غبار حیرانی

نئی دھلی: احمد محفوظ کی شاعری جدید اور کلاسیکی شعریت کا سنگم ہے وہ صاحب اسلوب شاعر بھی ہیں۔ ان خیالات کا

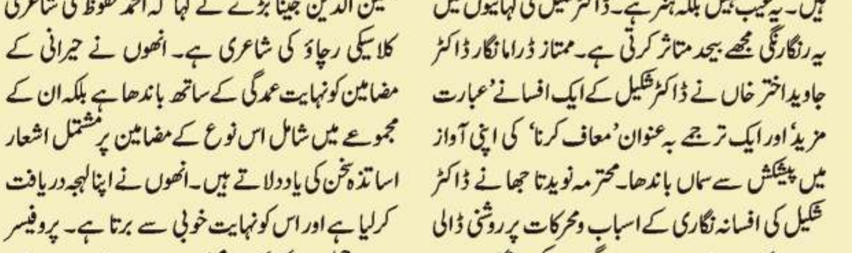

اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر احمد محفوظ کے شعری مجموعہ 'غبارِ حیرانی' کے اجرا کے موقعے پر منعقد تقریب میں مقررین نے کیا۔ تقریب کا اہتمام اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ابوالفضل انکلیو نئی دہلی میں کیا تھا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر تقریب کے صدر پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ مشرقی شعریات پر عبور، فلسفیانہ فکر، متانت، بردباری اور فارسی دانی نے احمد محفوظ کو نئی نسل کے نمائندہ شاعروں میں امتیازی مقام عطا کیا ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ پروفیسر احمد محفوظ الفاظ کے تخلیقی استعمال کا ہنر خوب جانتے ہیں بلکہ اپنے معاصرین میں اس اعتبار سے وہ ممتاز ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غبارِ حیرانی میں صنعتوں کا استعمال حیران کر دینے والا ہے۔ اس اعتبار سے احمد محفوظ کی شاعری جدید اور قدیم کا سنگم ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے مجموعہ کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ احمد محفوظ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ غزل کی پرانی لفظیات و تراکیب کو اعتماد کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ احمد محفوظ کی شاعری کلاسیکی رچاؤ کی شاعری ہے۔ انھوں نے حیرانی کے مضامین کو نہایت عمدگی کے ساتھ باندھا ہے بلکہ ان کے مجموعے میں شامل اس نوع کے مضامین پر مشتمل اشعار اساتذہ سخن کی یاد دلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا لہجہ دریافت کر لیا ہے اور اس کو نہایت خوبی سے برتا ہے۔ پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ احمد محفوظ ہمارے ہونہار اور تازہ کار شاعر ہیں ان کے شعری مجموعے 'غبارِ حیرانی' کی اشاعت عصر حاضر کا اہم ادبی واقعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ احمد محفوظ کی تربیت اردو کے اہم جدید شعرا شمس الرحمٰن فاروقی، سہیل احمد زیدی، فرخ جعفری اور عبدالحمید کے زیر اثر ہوئی، ان میں اول اور آخر الذکر کے سامنے احمد محفوظ نے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ پروفیسر مظہر احمد نے کہا کہ اس مجموعے کا برسوں سے انتظار تھا۔ انھوں نے غبار حیرانی کو روشن شاعری سے تعبیر کیا اور کہا کہ اسے پڑھتے ہوئے ایک عجب مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یقیناً اس شاعری کو پڑھ کر ہم فخر کا احساس کر سکتے ہیں۔ عمیر منظر نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر احمد محفوظ کے فکر و خیال کی جہتوں کا اصل حسن ان کے بیان میں پوشیدہ ہے۔ اس موقع پر احمد محفوظ نے غزلیں پیش کیں اور حاضرین سے تحسین حاصل کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 6 فروری 2023

منزل منزل سایہ

جونپور: شہر کے محلّہ شیخ محامد میں ساجدہ گرلس کالج کے ہال میں بزم حفیظ جونپوری کے زیر اہتمام سبکدوش استاذ ابوذر انصاری کے نعتیہ مجموعہ 'منزل منزل سایہ' کا اجرا بدست

عمیر الصدیق ندوی مدیر ماہنامہ معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت طفیل احمد انصاری اور نظامت محمد عارف ایڈوکیٹ وعرفان جونپوری نے مشترکہ طور پر کی۔ پروگرام کے آغاز میں یاسر حسان کی بزم حفیظ کی جانب سے ابوذر انصاری کو سند توصیف بھی دی گئی اور ’حسانِ جونپور‘ کا خطاب بھی دیا گیا۔ بطور مہمان عبرت مچھلی شہری، اشتیاق سعید ممبئی، حافظ قمر عباسی اعظم گڑھ، ڈاکٹر شکل احمد مئو، عبداللہ فاروق پرنسپل درسگاہ اسلامی معروف پور نے شرکت کی۔ مہمانوں کی گل پوشی کے بعد کتاب کا اجرا عمل میں آیا جس کو حاضرین نے خوب سراہا۔ اس موقعے پر لوگوں نے کتاب کے تعلق سے اپنے تاثرات پیش کیے۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے عمیر الصدیق ندوی نے کہا کہ یہ نعتیہ مجموعہ اپنے فن و شاعری کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شکیل احمد مئو، عبرت مچھلی شہری، معروف افسانہ نگار اشتیاق سعید، افسانہ نگار افسانہ جونپور اور مولانا انوار احمد قاسمی نے بھی ’منزل منزل سایہ‘ کا بھرپور تجزیہ پیش کیا اور نعتیہ مجموعہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر پی سی وشوکرما، عبداللہ فاروق، مظہر آصف، عالم غازی پوری وغیرہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ وہیں اکرم جونپوری نے منظوم تاثرات پیش کیے۔ آخر میں بزم حفیظ کے صدر اسیم مچھلی شہری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 6 فروری 2023

کال اور تال

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے کہا کہ ثقافت کو بچانا بہت مشکل کام ہے، لیکن ثقافت کو زندہ رکھنے کے لیے کتابوں سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ وائس چانسلر نئی دہلی کے پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی کتاب میلے میں پبلشر ’کتاب والے‘ کے اسٹال پر پروفیسر انوپ لاٹھر کی لکھی ہوئی کتاب ’کال اور تال‘ کی رسم اجرا کے موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔ اس موقعے پر کتاب کے مصنف پروفیسر انوپ لاٹھر اور پروفیسر ایس کے سلوجا، دہلی یونیورسٹی ساؤتھ دہلی کیمپس کے ڈائرکٹر پروفیسر پرکاش سنگھ، امبیڈکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر انوسنگھ لاٹھر، کتاب کے پبلشر پرشانت جین، ڈی یو کے رجسٹرار ڈاکٹر وکاس گپتا اور کئی معززین موجود تھے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ کتابیں قوم کی ثقافت اور روح کو بچانے کا کام کرتی ہیں، اس لیے کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں تب ہی انسان لکھنے کے قابل ہوگا۔ تقریب کے آغاز میں کتاب ’کال اور تال‘ کے مصنف انوپ لاٹھر نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کتاب کے پس منظر کے بارے میں تفصیلی معلومات دیتے ہوئے بتایا کہ کئی ریاستوں کی لوک ثقافت پر بہت کچھ کام ہوا ہے، لیکن ہریانہ میں ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کو لکھنے کا خیال تقریباً 30 سال پہلے آیا تھا۔ پھر لوک گیتوں کو مرتب کرنے کا کام ہوا۔ ان گانوں کے حوالے سے ماہر موسیقار پروفیسر ایس کے سلوجا نے نوٹیشن تیار کیا۔ اس طرح 150 گانوں کا یہ مجموعہ تیار ہوا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لیے ایک عظیم تحفہ ثابت ہوگی۔ اس موقعے پر جنوبی دہلی کیمپس کے ڈائرکٹر پروفیسر پرکاش سنگھ اور امبیڈکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر انوسنگھ لاٹھر سمیت کئی معززین نے خطاب کیا۔ کتاب کے پبلشر پرشانت جین نے تقریب کے آخر میں اظہار کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 27 فروری 2023

ہندوستان اور کویت: تاریخی، علمی اور ثقافتی رشتے

نئی دھلی: مرحوم عبدالقادر شمس کی کوشش غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، انھوں نے موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ایک مضبوط نیو قائم کردی ہے۔ اب محققین کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کام کو آگے بڑھائیں، یہ کتاب حرف آخر نہیں ہے تاہم اپنی نوعیت کا یہ اولین کام ہے، جس کی ترتیب و اشاعت کے لیے میں ڈاکٹر خالد اعظمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ان خیالات کا اظہار نامور اسلامک اسکالر، دانشور پدم شری پروفیسر اختر الواسع چیئرمین خسرو فاؤنڈیشن دہلی نے کیا۔ وہ آج ’ہندوستان اور کویت، تاریخی، علمی اور ثقافتی رشتے‘ نامی کتاب کے جامعہ نگر کے ابوالفضل انکلیو میں واقع ہوٹل ریوروِیو میں اجرا کی تقریب کی صدارت کررہے تھے۔ انھوں نے تقریب کے شاندار انعقاد پر جامعہ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار اور اس کے بانی ڈاکٹر مفتی محفوظ الرحمن عثمانی کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر مولانا اصغر امام مہدی سلفی نے کہا کہ کام کرنے والوں کی قدر ہونی چاہیے، جیسے مغفرت اور درجات کے بلندی کی دعا کرنا بہترین ہدیہ اور تحفہ ہے، اسی طرح ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ پروفیسر اقتدار محمد خان صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ جب عبدالقادر شمس یہ مقالہ تیار کررہے تھے تو بارہا ان سے اس موضوع پر تبادلہ خیال ہوا، وہ جس محبت و انکساری سے ملتے تھے اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ نوکری کے لیے نہیں بلکہ ریسرچ کے لیے ہی اس عنوان پر کام کررہے ہیں۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے کہا کہ یہ کتاب ہندوستان اور کویت کے درمیان ہمہ جہت تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ معروف صحافی سہیل انجم نے بہت ہی خوبصورت انداز میں اپنی بات رکھتے ہوئے کہا کہ مرنے کے بعد جن تین صورتوں میں متوفی کو ثواب ملتا رہتا ہے ان میں ایک ذریعہ علم کا یا علمی کتاب کا چھوڑنا بھی ہے۔ اس کتاب کا جب تک مطالعہ کیا جاتا رہے گا عبدالقادر شمس اور ڈاکٹر خالد اعظمی کو ثواب ملتا رہے گا۔ ڈاکٹر وارث مظہری نے کہا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بنیادی اور ثانوی مصادر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی یہ تحقیقی کتاب امید ہے کہ ہندوستان اور کویت کے درمیان علمی و ثقافتی رشتوں کے استحکام میں اہم کردار ادا کرے گی۔ ڈاکٹر اجمل قاسمی نے عبدالقادر شمس سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مقالے کی تیاری میں انھوں نے بہت محنت کی تھی، بلاشبہ یہ ان کی محنت اور خلوص کا ہی نتیجہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اہل علم یہاں موجود ہیں اور انھیں خراج عقیدت پیش کررہے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالمفضل حسین نے اوقاف پر دلچسپ گفتگو کی اور کہا کہ یہی وقت کی ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مطالعہ کیا جائے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر خالد اعظمی نے دو سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کتاب کو شائع کیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر خالد مبشر اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے بھی کتاب کے مشمولات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ معروف صحافی سراج نقوی نے کہا کہ عبدالقادر شمس کی قلم پر مضبوط گرفت تھی یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک اہم تحقیق ہے۔ ڈاکٹر خالد اعظمی کے اظہار تشکر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 27 فروری 2023

ڈاکٹر سلطان شاکر کی کتابوں کا اجرا

لکھنؤ: سینئر ادیب ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی لکھی ہوئی چھ کتابوں کا اجرا لاٹوش روڈ پر واقع ہوٹل میزبان میں ہوا۔ تقریب کے مہمان خصوصی جناب ہری ونش، عزت مآب ڈپٹی چیئرمین راجیہ سبھا نے تمام چھ کتابیں عام لوگوں کے لیے وقف کیں۔ تقریب کی صدارت سینئر صحافی شری کے وکرم راؤ نے کی۔ اس موقعے پر مولانا خالد رشید فرنگی محلی صدر اسلامک سنٹر آف انڈیا، پروفیسر

ڈاکٹر غضنفر اقبال کی کتاب 'باتیں بچوں کی' کا اجرا

ڈاکٹر اوشا سنہا، سابق سربراہ، شعبہ لسانیات، لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر خان محمد عاطف، سابق چیئرمین، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر وی جی گوسوامی، سابق ڈین، فیکلٹی آف لا، لکھنؤ یونیورسٹی، شری مہیش چندر دویدی، سابق ڈائرکٹر جنرل آف پولیس، کے ساتھ ساتھ تعلیم، ادب، سماج اور انتظامی شعبہ کے بہت سے اسکالروں نے اپنی موجودگی سے تقریب کے وقار کو بڑھایا۔ آل انڈیا مائنارٹیز فیڈریشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کی لکھی ہوئی چھ کتابوں کا اجرا کیا گیا۔ نثر اور شاعری میں شائع ہونے والی یہ تمام چھ مہا کاویہ یوسف مہر علی، آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، جے پرکاش نارائن، مدھو لیمے اور ایس ایم جوشی کا ملک کی آزادی میں شراکت وغیرہ کتابوں کا افتتاح کرتے ہوئے مہمان خصوصی مسٹر ہری ونش، عزت مآب ڈپٹی چیئرمین راجیہ سبھا نے کہا کہ یہ کتابیں ملک کی تعمیر میں نامور شخصیات کے تعاون کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے یقین ظاہر کیا کہ یہ کتابیں اپنے تخلیقی اور مثبت خیالات کے ساتھ معاشرے کے تمام طبقات میں حب الوطنی کا جذبہ پھیلائیں گی۔ تقریب کی صدارت سینئر صحافی جناب وکرم راؤ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتابیں زندگی کے مختلف حالات میں قارئین کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے مصنف نے نوجوان نسل کو مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشی ہے۔ اس موقعے پر مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے کہا کہ یہ کتابیں ہر کسی کو احساس فرض سے روشناس کراتی ہیں۔ ڈاکٹر اوشا سنہا نے کہا کہ یہ کتابیں اپنے اندر گہرے مضمرات رکھتی ہیں، جو یقیناً سب کو متاثر کریں گی۔ ڈاکٹر خان محمد عاطف نے کہا ادب کی دنیا میں پہلی بار میں نے نثر اور شاعری کی چھ کتابوں کا ایک ساتھ اجرا کیا۔ اسی طرح پروفیسر ڈاکٹر وی جی گوسوامی نے تحریری انداز کی تعریف کی جب کہ مسٹر مہیش چندر دویدی نے ان کتابوں کو سب کے لیے ترغیب کا ذریعہ قرار دیا۔ اس موقعے پر موجود شائقین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مصنف ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی نے کہا کہ میں نے ان کتابوں کے ذریعے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے قارئین سے اپیل کی کہ وہ ان کتابوں کو پڑھیں اور اپنے تبصرے سے آگاہ کریں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 مارچ 2023

باتیں بچوں کی

گلبرگہ: غضنفر اقبال ادیب اطفال ہی نہیں بلکہ وہ اردو ادب کے سنجیدہ قاری اور شعر و ادب کے باریک بیں پارکھ ہیں۔ اس خیال کا اظہار دکن کے سینئر و مقبول ترین قلم کار ڈاکٹر وہاب عندلیب نے ڈاکٹر غضنفر اقبال کی کتاب 'باتیں بچوں کی' کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد کیا۔ تقریب رسم اجرا پروفیسر ڈاکٹر حمید سہروردی کی رہائش گاہ 'سائبان' گلبرگہ میں کاغذ دکن بیورو گلبرگہ کے زیر اہتمام منعقد کی گئی تھی۔ ڈاکٹر وہاب عندلیب نے کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کو ادب اطفال میں خوش گوار اضافہ قرار دیا۔ صدر تقریب جناب حامد اکمل نے کہا کہ غضنفر اقبال کا ادبی سفر مختلف سمتوں میں جاری ہے جس میں دیار دکن اور گلبرگہ کو خصوصیت حاصل ہے۔ جناب منظور وقار نے تقریب میں بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ کتاب 'باتیں بچوں کی' بے حد وقیع جاذب نظر اور پرکشش ہے۔ یہ کتاب دراصل بچوں کے لیے ہفت رنگ کہانی کاروں کا دربار ہے جس میں تنوع ہے جناب ایس عزیز الدین تقریب رسم اجرا کے مہمان خصوصی تھے۔ انھوں نے کہا کہ غضنفر اقبال کی کتاب میں ندرت ہے جو متوجہ کرتی ہے۔ جناب واجد اختر صدیقی نے کہا کہ غضنفر اقبال کی کتاب 'باتیں بچوں کی' انوکھی کاوش ہے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنی تقریر میں کہا کہ ان کو بچپن سے فن انٹرویو سے خصوصی شغف رہا ہے انھوں نے کہا کہ اب تک وہ سو کے قریب علم و ادب کی مقتدر شخصیات کے انٹرویوز کر چکے ہیں۔ نظامت کے فرائض جناب محمد جاوید اقبال صدیقی نے بہ حسن و خوبی انجام دیے۔ جناب محمد حسن محمود خرادی نے اظہار تشکر کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 5 مارچ 2023

وفیات

جسٹس اے ایم احمدی

نئی دهلی: ہندوستان کے سابق چیف جسٹس اے ایم احمدی کا 91 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ جسٹس احمدی گجرات کے شہر سورت میں پیدا ہوئے۔ وہ 1954 میں بمبئی میں داخلہ لے کر قانونی پیشے میں داخل ہوئے۔ 10 سال بعد وہ احمد آباد کی سٹی سول اینڈ سیشن کورٹ میں جج مقرر ہوئے۔

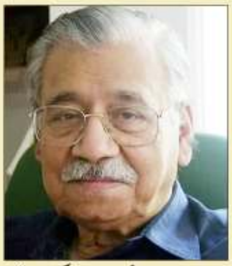

1976 میں انھیں گجرات ہائی کورٹ میں ترقی دی گئی۔ انھوں نے 1989 میں سپریم کورٹ لیگل ایڈ کمیٹی کے چیئرمین اور 1990 اور 1994 کے درمیان ہندوستان میں قانونی امدادی اسکیموں کو نافذ کرنے والی کمیٹی کے قائم مقام چیئرمین کے طور پر خدمات انجام دیں۔ جسٹس احمدی نے 25 اکتوبر 1994 سے 24 مارچ 1997 کو اپنی ریٹائرمنٹ تک چیف جسٹس آف انڈیا کے طور پر خدمات انجام دیں۔ سپریم کورٹ میں اپنی کارکردگی کے دوران جسٹس احمدی نے 232 فیصلے لکھے اور وہ 811 بنچوں کا حصہ تھے۔ مرحوم احمدی کی بیٹی تسنیم احمد موجودہ وقت میں سپریم کورٹ کی سینئر وکیل کے طور کام کر رہی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 مارچ 2023

سرفراز شاکر

جے پور: راجستھان میں جدید اردو غزل کی نمائندہ آواز معروف شاعر سرفراز شاکر کا اپنے یوم پیدائش کے ایک ہفتہ بعد 17 فروری کی صبح جے پور میں انتقال ہوگیا۔ وہ 67 برس کے تھے۔ انھیں جے پور سے ایمبولینس میں جودھپور لایا گیا۔ انھیں جمعہ کی شام جودھپور کے سیوانچی گیٹ قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کے جنازے میں شہر کے بہت سے شعرا اور معزز شہریوں نے شرکت کی۔ شاکر کے انتقال سے ادبی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ مرحوم کا تعلق جودھ پور سے تھا۔ ان کی پیدائش جودھ پور ہی میں شاعر سکندر شاہ خوش دل کے یہاں 10 فروری 1956 کو ہوئی۔ وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر شین کاف نظام کے شاگرد تھے۔ وہ نئے لب و لہجے کے اپنی طرز کے عمدہ شاعر تھے۔ پیکر نگاری اور قدرے تجریدیت سے دلچسپی تھی۔ راجستھان اردو اکادمی نے 2000 میں ان کا شعری مجموعہ 'رستہ رستہ ریت' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ان کا کلام اردو ادب کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ شاکر نے 1980 میں شاعری کا آغاز کیا۔ بہت سے بڑے شعرا اور ناقدین نے ان کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 18 فروری 2023

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انیس کے مرثیے (جلد اول و دوم)

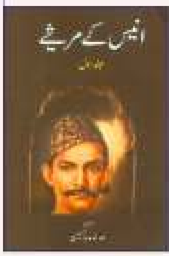

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

مصنف: رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 533

قیمت: 245 روپے

آب وہوا کا سائنسی مطالعہ

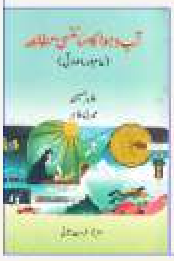

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

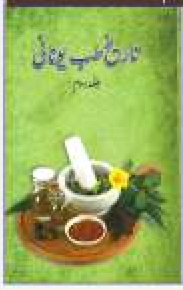

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

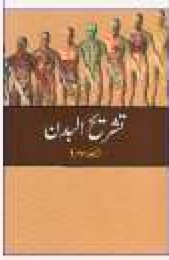

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

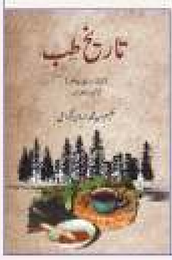

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

دنیا کی بہترین کہانیاں

انتخاب وترتیب: گنگا پرساد وِمل

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

انسانی حقوق

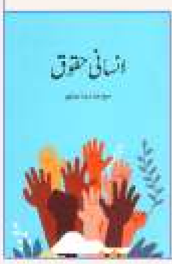

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अप्रैल-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०४
URDU DUNIYA Monthly, April-2023, Vol.25, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/03/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6